# حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور تاریخی حقائق

مفتی محمد تقی عثمانی

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
(Quranic Studies Publishers)

باہتمام : حضر اشفاق قاسمی

طبع جدید : ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ، اپریل 2010ء

مطبع : احمد برادرز پرنٹرز، کراچی۔

ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

فون : (021) 35031565, 35031566

ویب سائٹ : www.onlineshariah.com
www.quranicpublishers.com

ای میل : info@quranicpublishers.com

ملنے کے پتے:

- مکتبہ معارف القرآن کراچی
فون: 35031565, 35031566
- ادارۃ المعارف کراچی
فون: 35049733 - 35032020

# ترتیب

حصّہ اوّل

## حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور خلافت و ملوکیت

(حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر اعتراضات کا علمی جائزہ)

مولانا محمد تقی عثمانی

حصّہ دوم

## حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور خلافت و ملوکیت

("ترجمان القرآن لاہور" کے اعتراضات کا جواب)

مولانا محمد تقی عثمانی

حصّہ سوم

## حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، شخصیت، کردار اور کارنامے

(حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت و مناقب)

مولانا محمود اشرف عثمانی

# فہرستِ مضامین

| عنوان | صفحہ نمبر |
|---|---|



## حصہ دوم

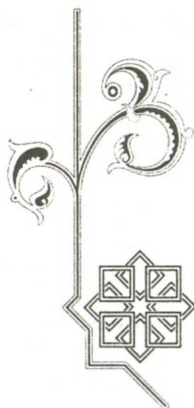
| عنوان | صفحہ نمبر |
|---|---|



## حصہ سوم

## حضرت معاویہؓ

| عنوان | صفحہ نمبر |
|---|---|

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# حرفِ آغاز

حمد و ستائش اس ذات کے لئے جس نے اس کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور دُرود وسلام اس کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر جنھوں نے دُنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کتابتِ وحی کے فرائض انجام دیئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کا دورِ حکومت تاریخِ اسلام کے درخشاں زمانوں میں ہے جس میں اندرونی طور پر امن و اطمینان کا دور دورہ بھی تھا اور ملک سے باہر دُشمنوں پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مخالفین نے ان پر اعتراضات و الزامات کا کچھ اس انداز سے انبار لگایا ہے کہ تاریخِ اسلام کا یہ تابناک زمانہ سبائی پروپیگنڈے کے گرد و غبار میں روپوش ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے عرصے سے میری خواہش تھی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر جو مشہور اعتراضات کئے گئے ہیں، ان کا واقعات کی روشنی میں جائزہ لے کر اصل حقیقت واضح کی جائے۔ اتفاق سے اسی دوران مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی کتاب ''خلافت و ملوکیت'' منظرِ عام پر آئی، اور اَطرافِ ملک سے ہم سے مطالبہ ہوا کہ اس کے بارے میں اپنی رائے پیش کریں۔ اس کتاب میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر عائد کئے گئے اعتراضات کو مرتب طریقے سے یکجا کردیا گیا تھا، چنانچہ کتاب کے اس حصے پر جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے متعلق تھا، میں نے ماہنامہ ''البلاغ'' میں ایک سلسلۂ مضامین تحریر کیا جو نو قسطوں پر شائع ہوا۔

بحمداللہ اس سلسلۂ مضامین کو ہر علمی حلقے میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا، اور اَب اپنے کرم فرماؤں کے اصرار پر اسے کتابی شکل میں لایا جارہا ہے، میری خواہش تھی کہ کتابی صورت میں لاتے وقت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت اور مناقب پر مثبت انداز میں بھی ایک مضمون تحریر کروں، لیکن اپنی گوناگوں مصروفیات میں مجھے اس کا موقع نہیں مل سکا، بالآخر میری فرمائش پر برادر زادہ عزیز مولوی محمود اشرف صاحب سلّمہ اللہ تعالیٰ نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا، اور ماشاء اللہ اس موضوع پر بڑی حسن وخوبی اور سلیقے کے ساتھ ایک جامع مضمون تیار کردیا جو عزیز موصوف کا نقشِ اوّل ہے، اور اِن شاء اللہ ان کے روشن علمی مستقبل کا آئینہ دار۔

اس طرح یہ کتاب اب محض ایک تنقید ہی نہیں ہے، بلکہ اس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سیرت، آپ کے فضائل ومناقب، آپ کے عہدِ حکومت کے حالات اور آپ پر مخالفین کے تمام بے جا الزامات کا مدلل جواب بھی اِن شاء اللہ مل جائے گا، اور مشاجراتِ صحابہؓ کے مسئلے میں اہلِ سنت کا معتدل موقف بھی دلائل کے ساتھ واضح ہوسکے گا۔ اللہ تعالیٰ اس حقیر کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور اسے شکوک وشبہات کے ازالے کا سبب بنائے۔ آمین

محمد تقی عثمانی

دارالعلوم کراچی ۱۴

۲۷ربیع الاوّل ۱۳۹۱ھ

حصہ اوّل

# حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ
# اور
# خلافت وملوکیت

(حضرت معاویہؓ پر اعتراضات کا علمی جائزہ)

مولانا محمد تقی عثمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چند سال پہلے جناب مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی جو کتاب ''خلافت و ملوکیت'' کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس کے بارے میں ''البلاغ'' کے اجراء کے وقت سے ہمارے پاس خطوط کا تانتا بندھا رہا ہے، ملک و بیرونِ ملک سے مختلف حضرات اس کتاب کے بارے میں ہمارا موقف پوچھتے ہی رہتے ہیں۔ اب تک ہم نے اس موضوع پر دو وجہ سے کچھ شائع کرنے سے گریز کیا تھا، ایک وجہ تو یہ ہے کہ ''البلاغ'' کا بنیادی مقصد اس قسم کی بحثوں سے میل نہیں کھاتا، ہماری کوشش روزِ اوّل سے یہ رہی ہے اور اِن شاء اللہ آئندہ بھی یہی رہے گی کہ ''البلاغ'' کی تمام تر توجہ ان بنیادی مسائل کی طرف رکھی جائے جو بحیثیت مجموعی پوری اُمتِ مسلمہ کو درپیش ہیں۔

دُوسری وجہ یہ تھی کہ ''خلافت و ملوکیت'' کا جو حصہ اس وقت سوالات اور اعتراضات کا محوَر بنا ہوا ہے، وہ ایک ایسے مسئلے سے متعلق ہے جسے بحث و تمحیص کا موضوع بنانا بہ حالاتِ موجودہ ہم کسی کے لئے بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں ہمارا اجمالی عقیدہ یہ ہے کہ زمین و آسمان کی نگاہوں نے انبیاء علیہم السلام کے بعد ان سے زیادہ مقدس اور پاکیزہ انسان نہیں دیکھے، حق و صداقت کے اس مقدس قافلے کا ہر فرد اتنا بلند کردار اور نفسانیت سے اس قدر دُور تھا کہ انسانیت کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اور اگر کسی سے کبھی کوئی لغزش ہوئی بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرما کر ان کے جنتی ہونے کا اعلان فرما دیا ہے۔ رہ گئی یہ بات کہ ان کے باہمی اختلافات میں کون حق پر تھا؟ اور کس سے کس وقت کیا غلطی سرزد ہوئی تھی؟ سو اس قسم کے سوالات کا واضح جواب قرآن کے الفاظ میں یہ ہے:-

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ.

ترجمہ:- یہ ایک اُمت تھی جو گزر گئی، ان کے اعمال ان کے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے، اور تم سے نہ پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیسا عمل کیا تھا؟

ان دو باتوں کے پیشِ نظر ہم اب تک نہ صرف اس موضوع پر قلم اُٹھانے، بلکہ ''خلافت وملوکیت'' کا مطالعہ کرنے سے بھی گریز کرتے رہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد وہ فتنہ پوری آب وتاب کے ساتھ کھڑا ہوگیا جس سے بچنے کے لئے ہم نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ پچھلے دنوں اس کتاب کے مباحث دِینی حلقوں کا موضوعِ بحث بنے رہے اور اس کے موافق ومخالف تحریروں کا ایک انبار لگ گیا۔ اِدھر ہمیں اس کتاب کے مطالعے اور اس کے بہت سے قارئین سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ جن حضرات نے اسے عقیدت اور احترام کے ساتھ پڑھا ہے، ان کے دِل میں ایسی شدید غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں جن کا دُور ہونا ضروری ہے۔ ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ افراط وتفریط سے ہٹ کر خالص علمی اور تحقیقی انداز میں مسئلے کی حقیقت واضح کردی جائے، اسی ضرورت کا احساس اس مقالے کی شانِ نزول ہے۔

اس مقالے کو منظرِ عام پر لانے کے لئے ہم نے ایک ایسے وقت کا انتخاب کیا ہے جبکہ اس موضوع پر بحث ومناظرہ کی گرماگرمی دھیمی پڑ رہی ہے اور فریقین کی طرف سے اس کتاب کی حمایت وتردید میں اچھا خاصا مواد سامنے آچکا ہے، مقصد صرف یہ ہے کہ اپنے قارئین کو بحث ومباحثے کی اس فضاء سے آزاد ہوکر سوچنے کی دعوت دی جائے جو حقیقت پسندی کے جذبے کے لئے زہرِ قاتل ہوا کرتی ہے۔

جن حضرات نے خلافت وملوکیت کا مطالعہ کیا ہے، ہمارا اصل مخاطب وہ ہیں، اور ہم نہایت دردمندی کے ساتھ یہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ اس مقالے کا بحث ومباحثے کے بجائے اِفہام وتفہیم کے ماحول میں مطالعہ فرمائیں، ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات

سے اُمید ہے کہ اگر ان معروضات کو اسی جذبے کے ساتھ پڑھا گیا تو یہ مضمون تطویلِ بحث کا سبب نہیں بنے گا بلکہ اِن شاء اللہ افتراق و انتشار کی موجودہ کیفیت میں کمی ہی آئے گی۔

## بحث کیوں چھیڑی گئی؟

ہمارے لئے سب سے پہلے تو یہ بات بالکل ناقابلِ فہم ہے کہ اس پُرفتن دور میں مشاجراتِ صحابہؓ کی اس بحث کو چھیڑنے کا کیا موقع تھا؟ اُمتِ مسلمہ کو اس وقت جو بنیادی مسائل درپیش ہیں، اور جتنا بڑا کام اس کے سامنے ہے، مولانا مودودی صاحب یقیناً ہم سے زیادہ اس سے واقف ہوں گے۔ اس اہم کام کے لئے جس یکسوئی اور یک جہتی کی ضرورت ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں، کون نہیں جانتا کہ آج کی دُنیا میں دولت وحکومت پر اور علمی اور فکری مرکزوں پر ذہنوں میں انقلاب پیدا کرنے والے نشر و اشاعت کے دُوررس رسائل پر تمام تر قبضہ یا ان لوگوں کا ہے جو کھلے طور پر دُشمنِ اسلام ہیں اور آپس کے ہزاروں اختلاف کے باوجود اپنا سب سے بڑا خطرہ اسلام کو سمجھے ہوئے ہیں اور اس کے مقابلے میں متحد ہیں، یا پھر کچھ ایسے ہاتھوں میں ہے جو مسلمان کہلانے کے باوجود ان سے ایسے مرعوب ہیں کہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت اس کو سمجھتے ہیں کہ اس کو کھینچ تان کر کسی طرح ان آقاؤں کی مرضی کے مطابق بنادیا جائے۔ ان حالات میں اسلام دُشمن عناصر کا مقابلہ کرنے کے لئے اگر کوئی قوت اہلِ حق کے پاس ہے تو وہ صرف ان کا باہمی اتحاد و اتفاق اور اجتماعی کوشش ہے۔ اس کے لئے کیا یہ ضروری نہیں کہ آپس کے سابقہ اختلافات کو بھی ایک خاص دائرے میں محدود کر کے ان سب کی پوری طاقت اس محاذ پر صَرف ہو جس طرف سے کھلے کفر و اِلحاد کی یلغار ہے۔ اور کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ اس دور میں ملت کی فکری اور عملی توانائیاں غیرضروری یا ثانوی اہمیت کے مسائل پر صَرف کرنے کے بجائے ان بنیادی مسائل پر خرچ کی جائیں جو اس وقت عالمِ اسلام کے لئے زندگی اور موت کے مسائل ہیں۔

جہاں تک اسلام کے نظامِ خلافت کی تشریح و توضیح کا تعلق ہے، بلاشبہ وہ

وقت کی بڑی اہم ضرورت تھی اور اس موضوع پر مولانا نے بھی "خلافت وملوکیت" کے ابتدائی تین ابواب میں بحیثیت مجموعی بڑی قابلِ قدر کوشش فرمائی ہے۔ لیکن موجودہ وقت کی ضرورت کے لئے اتنا واضح کر دینا بالکل کافی تھا کہ "خلافت" کسے کہتے ہیں؟ وہ کس طرح قائم ہوتی ہے؟ اس میں مقنّنہ، عدلیہ اور انتظامیہ کے حدودِ اختیار کیا ہوتے ہیں؟ اور راعی ورعیت کے تعلقات کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ رہی یہ بحث کہ تاریخِ اسلام میں خلافت ملوکیت میں کس طرح تبدیل ہوئی؟ اور اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ سو یہ خالصتاً ایک ایسی تاریخی بحث ہے جس کی تحقیق ایک علمی نکتہ آفرینی تو کہلا سکتی ہے لیکن اس سے موجودہ دور کے مسلمانوں کا کوئی قابلِ ذکر فائدہ متعلق نہیں ہے۔ خاص طور سے اس لئے بھی کہ یہ موضوع کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جس پر ماضی میں کسی نے بحث نہ کی ہو، یا اس کی وجہ سے علمِ تاریخ میں کوئی ناقابلِ برداشت خلا پایا جاتا ہو۔ آج سے کم وبیش پانچ سو سال پہلے علامہ ابنِ خلدونؒ جیسے عالمگیر شہرت کے مؤرّخ نے اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے اور اس علمی خلاء کو نہایت سلامتِ فکر کے ساتھ پُر کر دیا ہے، انہوں نے اپنے شہرۂ آفاق مقدمے کے تیسرے باب میں خلافت وملوکیت پر بڑی مبسوط بحث کی ہے اور اس باب کی چھبیسویں فصل کا تو عنوان ہی یہ ہے کہ:-

فی انقلاب الخلافة الی الملک۔ [1]

ترجمہ:- خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہونے کا بیان۔

اس فصل میں انہوں نے اپنے مخصوص سلجھے ہوئے انداز میں اس انقلاب کے اسباب بھی بیان کر دیئے ہیں، تاریخ اور بالخصوص تاریخِ اسلام کے واقعات اور اس کے اُتار چڑھاؤ پر ابنِ خلدونؒ سے زیادہ نظر رکھنے کا دعویٰ اس دور میں شاید ہی کسی کو ہو، ان کے افکار کے ترجمے بھی ہو چکے ہیں اور تمام مسلمان اور غیر مسلم مؤرّخین تاریخ اور فلسفۂ تاریخ میں ان کے مقامِ بلند کے معترف ہیں، اپنی اس بحث میں مشاجراتِ صحابہؓ کے دریائے خون سے وہ نہایت سلامتی کے ساتھ گزرے ہیں۔

---

(۱) مقدمہ ابنِ خلدونؒ، باب:۳، فصل:۲۶، ص:۳۶۲ تا ۳۹۱، دار الکتاب اللبنانی، بیروت، ۱۹۵۶ء

لہٰذا موجودہ زمانے میں اس مسئلے کی کھود کرید اتنی ہی مضر ہے جتنی بخت نصر کے حملے کے وقت یہودیوں کی یہ بحث کہ "حضرت مسیح علیہ السلام کے فضلات پاک تھے یا ناپاک؟" یا تاتاریوں کی یلغار کے وقت اہلِ بغداد کی یہ تحقیق کہ "حضرت علیؓ افضل تھے یا حضرت معاویہؓ!"

مولانا مودودی صاحب نے اس بحث کو چھیڑنے کی وجۂ جواز یہ بیان فرمائی ہے کہ:-

> آج پاکستان میں تمام ہائی اسکولوں اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالبِ علم اسلامی تاریخ اور علمِ سیاست کے متعلق اسلامی نظریات پڑھ رہے ہیں۔ ابھی کچھ مدّت پہلے پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے سیاسیات کے امتحان میں یہ سوالات آئے تھے کہ قرآن نے ریاست کے متعلق کیا اُصول بیان کئے ہیں؟ عہدِ رسالت میں ان اُصولوں کو کس طرح عملی جامہ پہنایا گیا، خلافت کیا چیز تھی اور یہ ادارہ بادشاہی میں کیوں اور کیسے تبدیل ہوا؟ اب کیا معترض حضرات چاہتے ہیں کہ مسلمان طلباء ان سوالات کے وہ جوابات دیں جو مغربی مصنّفین نے دیئے ہیں؟ یا ناکافی مطالعے کے ساتھ خود اُلٹی سیدھی رائیں قائم کریں؟ یا ان لوگوں سے دھوکا کھائیں جو تاریخ ہی کو نہیں، اسلام کے تصورِ خلافت تک کو مسخ کر رہے ہیں ....الخ۔ (۱)

لیکن ہمارا خیال ہے کہ مولانا جب بحث و مباحثے کی موجودہ فضا سے ہٹ کر ٹھنڈے دِل سے غور فرمائیں گے تو انہیں خود اپنا یہ عذر کمزور محسوس ہوگا۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ مسلمان طلباء ان سوالات کے کیا جواب دیں؟ تو اس کا سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ انہیں وہ جواب دینا چاہیئے جو ابنِ خلدونؒ نے مقدمے میں دیا ہے اور جس کا ترجمہ ان کے نصاب میں داخل بھی ہے۔ اسے چھوڑ کر مغربی مصنّفین یا

---

(۱) خلافت و ملوکیت ص: ۳۰۰۔

کسی اور کی طرف وہ اسی وقت رُجوع کریں گے جبکہ انہیں ازخود بھٹکنے یا گمراہ ہونے کی خواہش ہو، اور ظاہر ہے کہ اس خواہش کی موجودگی میں کوئی کتاب ان کی مدد نہیں کر سکے گی۔

مولانا کی یہ بات بلاشبہ معقول ہے کہ:-

> اگر ہم صحتِ نقل اور معقول و مدلل اور متوازن طریقے سے اس تاریخ کو خود بیان نہیں کریں گے اور اس سے صحیح نتائج نکال کر مرتب طریقے سے دُنیا کے سامنے پیش نہیں کریں گے تو مغربی مستشرقین اور غیر معتدل ذہن و مزاج رکھنے والے مسلمان مصنّفین جو اسے نہایت غلط رنگ میں پیش کرتے رہے ہیں اور آج بھی پیش کر رہے ہیں، مسلمانوں کی نئی نسل کے دِماغ میں اسلامی تاریخ ہی کا نہیں بلکہ اسلامی حکومت اور اسلامی نظامِ زندگی کا بھی بالکل غلط تصوّر بٹھا دیں گے۔ (۱)

لیکن ہمیں اس سلسلے میں چند باتیں عرض کرنی ہیں۔

۱- مولانا نے اس فقرے میں دو خطرات کی طرف اشارہ کیا ہے: ایک یہ کہ تاریخ کو غلط رنگ میں پیش کرنے والے اس کے ذریعہ ''اسلامی حکومت اور اسلامی نظامِ زندگی کا بھی بالکل غلط تصوّر بٹھا دیں گے۔'' دُوسرے یہ کہ اس سے خود اسلامی تاریخ کا غلط تصوّر سامنے آئے گا۔ جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے سو اگر یہ لوگ ہماری تاریخ سے ہمارے نظامِ حکومت اور ہمارے نظامِ زندگی کا استنباط کرنے کی حماقت کریں گے تو ہمارا صحیح جواب یہ ہوگا کہ ہمارا ''نظامِ حکومت'' اور ہمارا ''نظامِ زندگی'' تاریخ کی عام روایات سے نہیں، قرآن سے اور ان احادیث و آثار سے مستنبط ہے جو جرح و تعدیل کی کڑی شرائط پر پوری اُترتی ہیں، ہمارے نظامِ زندگی کو سمجھنا ہے تو قرآن و حدیث سے اور فقہ و کلام سے سمجھو۔ خود مولانا مودودی بھی اس بات کو تسلیم فرماتے ہیں کہ ''حرام و حلال، فرض و واجب اور مکروہ و مستحب جیسے اہم شرعی اُمور کا

---

(۱) خلافت وملوکیت ص:۳۰۰۔

فیصلہ" اور یہ فیصلہ کہ "دِین میں کیا چیز سنت ہے اور کیا چیز سنت نہیں ہے" عام تاریخی روایات سے نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ہمارے لئے آخر یہ کیسے جائز ہوگا کہ اپنے نظامِ زندگی کے غلط تصوّر کو ختم کرنے کے لئے ہم خود ان لوگوں کی اس اُصولی غلطی کا اعادہ کریں اور اپنے نظامِ زندگی کا صحیح تصوّر ثابت کرنے کے لئے ان کی توجہ قرآن و حدیث کی طرف منعطف کرانے کے بجائے خود بھی تاریخی بحثوں میں اُلجھ جائیں؟

رہ گئی دُوسری بات کہ اگر ہم نے خود صحتِ نقل کے ساتھ اپنی تاریخ کو مرتب نہ کیا تو یہ لوگ ہماری تاریخ کا نہایت غلط تصوّر ذہنوں میں بٹھادیں گے۔ سو یہ بات بلاشبہ بالکل دُرست ہے اور فی الواقع اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو تحقیق و نظر کی چھلنی میں چھان کر اس طرح مرتب کریں کہ وہ زیادہ سے زیادہ اصلی صورت میں لوگوں کے سامنے آسکے۔ لیکن اوّل تو ہم نہایت ادب کے ساتھ یہ گزارش کریں گے کہ مولانا مودودی صاحب نے خود ہماری تاریخ کا جو تصوّر دے دیا ہے اور ان کی کتاب کے تاریخی حصے سے عہدِ صحابہؓ و تابعینؒ کا جو مجموعی تأثر قائم ہوتا ہے، وہ بجائے خود انتہائی غلط اور خطرناک تأثر ہے، اور ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ دُوسرے لوگ اس سے زیادہ غلط تأثر اور کیا دے سکتے ہیں؟ دُوسرے مولانا خود ہی غور فرمائیں کہ کیا یہ عظیم کام اتنی آسانی سے عمل میں آسکتا ہے کہ خلافت و ملوکیت کی خالص اَحکامی بحث کے ضمن میں اس قدر سرسری طور پر اسے انجام دیا جائے؟ اگر ہمیں اپنی تاریخ کو زیادہ سے زیادہ اصلی شکل میں پیش کر کے دِلوں کو اس پر مطمئن کرنا ہے تو محض چند یک طرفہ روایات کو جمع کردینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا، اس کے بجائے ہمیں تحقیق و تنقید کے اُصول مدلل طریقے سے معین کرنے ہوں گے، ہر روایت کے بارے میں معقول دلائل کے ساتھ یہ بتانا ہوگا کہ ہم نے اس کی مخالف روایات کو چھوڑ کر اسے کیوں اختیار کیا؟ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر آپ طبریؒ، ابنِ کثیرؒ اور ابنِ اثیرؒ کے حوالوں سے واقعات کا ایک تسلسل قائم فرما کر دِکھلائیں اور "دُوسرے لوگ" بعینہٖ ان ہی کتابوں کے حوالوں سے واقعات کا دُوسرا تسلسل ثابت کردیں تو اس سے وہ "نئی نسل" آخر کیسے مطمئن ہوسکے گی جس کی گمراہی کا آپ کو خوف ہے؟

اسی لئے ہماری رائے یہ ہے کہ تاریخ اسلام اور خاص طور سے اس کے مشاجراتِ صحابہؓ والے حصے کی تحقیق کا یہ کام یا تو اس پُرفتن دور میں چھیڑا نہ جائے، کیونکہ اُمت کے سامنے اس سے زیادہ اہم مسائل ہیں جن کے مقابلے میں یہ کام کوئی اہمیت نہیں رکھتا یا پھر انفرادی رائے قائم کرنے کے بجائے متوازن فکر رکھنے والے اہلِ بصیرت علماء کی ایک جماعت اس کام کو انجام دے، اور تاریخ کی تحقیق و تنقید کے اُصول طے کرنے میں زیادہ سے زیادہ علماء کا مشورہ اور تعاون حاصل کرے، اس کے بغیر اس سلسلے کی انفرادی کوششیں مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگیوں کو نئے میدان فراہم کرنے کے سوا کوئی خدمت انجام نہیں دے سکیں گی۔ لہٰذا موجودہ حالات میں اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ اس معاملے میں ابنِ خلدونؒ جیسے اہلِ بصیرت اور متوازن الفکر مؤرخین کی اس تحقیق پر اعتماد کیا جائے، جو انہوں نے تاریخِ اسلام کے اولین مآخذ کو اچھی طرح کھنگالنے کے بعد پیش کی ہے، اس موضوع پر اگر کوئی انفرادی کوشش ہو بھی تو وہ اسی تحقیق کو بنیاد بنا کر اسے مزید وسعت دے اور کوئی ایسا نتیجہ نکال کر منظرِ عام پر نہ لائے جو صدیوں کے مُسلّمات کے خلاف ہو، جس سے ذہنوں میں خلجان پیدا ہو اور افتراق اور انتشار کا دروازہ کھلے۔

اس مختصر گزارش کے بعد ہم ''خلافت و ملوکیت'' کی ان باتوں کی طرف آتے ہیں جو ہماری نگاہ میں سخت قابلِ اعتراض ہیں۔ قاعدے کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت اور تاریخی روایات کی حیثیت سے متعلق ان اُصولی مباحث پر گفتگو کرتے جو مولانا نے اپنے معترضین کے جواب میں چھیڑے ہیں، اس کے بعد جزئیات کی طرف آتے، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ صحابہؓ کی عدالت وغیرہ کے بارے میں جو اُصولی بات ہم عرض کرنا چاہتے ہیں، مولانا مودودی صاحب کی اس کتاب کے بعد وہ شاید اس وقت تک مولانا کے قارئین کے دلوں میں بیٹھ نہ سکے جب تک مولانا کے بیان کردہ واقعات پر تبصرہ نہ کیا جائے۔ ''خلافت و ملوکیت'' کو پڑھنے والوں میں اکثریت ایسے حضرات کی ہوگی جن کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ مولانا کے بیان کردہ ہر واقعے کو اس کے اصل مآخذ میں دیکھ کر یہ فیصلہ کریں کہ یہ

واقعہ جو تاثر دے رہا ہے، وہ فی الواقع صحیح ہے یا نہیں؟ اس کے بجائے یقیناً بیشتر حضرات نے مولانا مودودی صاحب کی نقل پر اعتماد کر کے اس کتاب سے وہی تاثر لیا ہوگا جو یہ کتاب دے رہی ہے، ایسی حالت میں جب تک ان واقعات کی حقیقت نہ بتائی جائے، عدالتِ صحابہؓ کی بحث "خلافت و ملوکیت" کے ان قارئین کے دلوں میں نہیں اُتر سکے گی جنھوں نے اس کتاب کو عقیدت و محبت کے جذبات کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس لئے ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے ان جزئی واقعات ہی کو سامنے لے آئیں جن پر ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔

پوری کتاب پر کما حقہ تبصرہ کرنا تو چند در چند وجوہ کی بناء پر ہمارے لئے ممکن نہیں ہے، ہم یہاں صرف ان اعتراضات کو زیر بحث لائیں گے جو مودودی صاحب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر وارد کئے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں مولانا مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بھی کئی مقامات پر اپنے اسلوبِ بیان اور کئی جگہوں پر اپنے مواد کے لحاظ سے بہت قابلِ اعتراض ہے، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو وہ انتہائی خطرناک حد تک پہنچ گئے ہیں۔ اور ہماری پُر خلوص دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس سے واپس لوٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اسی جذبے کے تحت ہم نے یہاں صرف ان اعتراضات کو اپنی گفتگو کے لئے چنا ہے جو انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر وارد کیے ہیں۔ ہم ایک بار پھر یہ گزارش کریں گے کہ ہماری ان معروضات کو بحث و مباحثے کی فضا سے ہٹ کر ٹھنڈے دل کے ساتھ پڑھا جائے اور چونکہ معاملہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے اس لئے اس نازک معاملے میں ذہن کو جماعتی تحزب یا شخصی اعتقاد کی قیود سے بالکل آزاد کرلیا جائے۔ اُمید ہے کہ ہماری یہ دردمندانہ گزارش قابلِ قبول ہوگی۔

## بدعت کا الزام

"قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کے عنوان کے تحت مولانا لکھتے ہیں:-

ان بادشاہوں کی سیاست دین کے تابع نہ تھی، اس کے تقاضے وہ

ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورے کرتے تھے اور اس معاملے میں حلال و حرام کی تمیز روا نہ رکھتے تھے، مختلف خلفائے بنی اُمیہ کے عہد میں قانون کی پابندی کا کیا حال رہا، اسے ہم آگے کی سطور میں بیان کرتے ہیں۔

حضرت معاویہؓ کے عہد میں

یہ پالیسی حضرت معاویہؓ ہی کے عہد سے شروع ہوگئی تھی۔

اس ''پالیسی'' کو ثابت کرنے کے لئے مولانا نے چھ سات واقعات لکھے ہیں، پہلا واقعہ وہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ:-

اِمام زہری کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ اور چاروں خلفائے راشدینؓ کے عہد میں سنت یہ تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہوسکتا ہے، نہ مسلمان کافر کا، حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانۂ حکومت میں مسلمانوں کو کافر کا وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث قرار نہ دیا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے آکر اس بدعت کو ختم کیا، مگر ہشام بن عبدالملک نے اپنے خاندان کی روایت کو پھر بحال کردیا۔ (ص:۱۷۳)

اس واقعے کے لئے مولانا نے ''البدایہ والنہایہ'' جلد:۸ صفحہ:۱۳۹ اور جلد:۹ صفحہ:۲۳۲ کا حوالہ دیا ہے، لہٰذا پہلے اس کتاب کی اصل عبارت ملاحظہ فرمالیجئے۔

حدثنی الزهری قال: کان لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم فی عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم وأبی بکر وعمر وعثمان و علی، فلما ولی الخلافة معاویة ورث المسلم من الکافر ولم یورث الکافر من المسلم، وأخذ بذٰلک الخلفاء من بعده فلما قام عمر بن عبدالعزیز راجع السنة الأولٰی وتبعه فی ذٰلک یزید بن عبدالملک، فلما قام هشام أخذ بسنة الخلفاء یعنی

انہ ورث المسلم من الکافر.[1]

ترجمہ:- امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے اربعہؓ کے عہد میں نہ مسلمان کافر کا وارث ہوتا تھا، نہ کافر مسلمان کا، پھر جب معاویہؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا، اور کافر کو مسلمان کا وارث نہ بنایا، ان کے بعد خلفاء نے بھی یہی معمول رکھا، پھر جب عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے پہلی سنت کو لوٹا دیا، اور یزید بن عبدالملک نے بھی ان کی اتباع کی، پھر جب ہشام آیا تو اس نے خلفاء کی سنت پر عمل کیا یعنی مسلمان کو کافر کا وارث قرار دے دیا۔

اب اصل صورتِ حال ملاحظہ فرمایئے، واقعہ اصل میں یہ ہے کہ یہ مسئلہ عہدِ صحابہؓ سے مختلف فیہ رہا ہے، اس بات پر تو اتفاق ہے کہ کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوسکتا، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ مسلمان کافر کا وارث ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس اختلاف کی تشریح علامہ بدرالدین عینی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی سنئے:-

وأما المسلم فهل يرث من الكافر أم لا، فقالت عامة الصحابة رضى الله تعالىٰ عنهم لا يرث، وبه أخذ علماؤنا والشافعي وهٰذا استحسان والقياس أن يرث وهو قول معاذ بن جبل ومعاوية بن أبي سفيان وبه أخذ مسروق والحسن ومحمد بن الحنفية ومحمد بن علي بن حسين.[2]

ترجمہ:- رہی یہ بات کہ مسلمان کافر کا وارث ہوسکتا ہے یا نہیں؟ سو عام صحابہ کرامؓ کا قول تو یہی ہے کہ وہ وارث نہ ہوگا، اور اسی کو ہمارے علماء (حنفیہ) اور امام شافعیؒ نے اختیار کیا ہے، لیکن یہ استحسان ہے۔ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ وارث ہو اور یہی حضرت معاذ

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ ج:۹ ص:۲۳۲ مطبعۃ السعادۃ۔

(۲) عمدۃ القاری ج:۲۳ ص:۲۶۰، الطباعۃ المنیریۃ، باب لا یرث المسلم الکافر .... الخ.

بن جبلؓ اور حضرت معاویہؓ کا مذہب ہے، اور اسی کو مسروقؒ، حسنؒ، محمد بن حنفیہؒ اور محمد بن علی بن حسینؒ نے اختیار کیا ہے۔

اور حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

أخرج ابن أبی شیبة من طریق عبدالله بن معقل قال: ما رأیت قضاء أحسن من قضاء قضی به معاویة نرث أهل الکتاب ولا یرثونا کما یحل النکاح فیهم ولا یحل لهم، وبه قال مسروق وسعید بن المسیب وإبراهیم النخعی وإسحاق.(1)

ترجمہ:- ابنِ ابی شیبہؒ نے حضرت عبداللہ بن معقل سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے تھے کہ: میں نے کوئی فیصلہ حضرت معاویہؓ کے اس فیصلے سے بہتر نہیں دیکھا کہ ہم اہلِ کتاب کے وارث ہوں اور وہ نہ ہوں، یہ ایسا ہی ہے جیسے ہمارے لئے ان کی عورتوں سے نکاح حلال ہے، مگر ان کے لئے ہماری عورتوں سے نکاح حلال نہیں۔ اور یہی مذہب مسروقؒ، سعید بن المسیّبؒ، ابراہیم نخعی اور اسحاقؒ کا ہے۔

پھر حافظ ابنِ حجرؒ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کے حوالے سے حضرت معاویہؓ کے اس مسلک کی تائید میں ایک مرفوع حدیث بھی نقل کی ہے:-

عن معاذ قال: یرث المسلم من الکافر من غیر عکس واحتج بأنه سمع رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول: "الإسلام یزید ولا ینقص" وهو حدیث أخرجه أبوداؤد وصححه الحاکم.

ترجمہ:- حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ: مسلمان کافر کا وارث ہوگا، مگر اس کا عکس نہیں ہوگا۔ وہ دلیل یہ پیش کرتے تھے کہ انہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا

---

(1) فتح الباری ج:۱۲ ص:۴۱، المطبعة البهیة مصر، ۱۳۴۸ھ، باب مذکور۔

ہے کہ: اسلام (انسانی حقوق میں) زیادتی کرتا ہے، کمی نہیں کرتا۔ یہ حدیث امام ابو داؤدؒ نے روایت کی ہے اور حاکمؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔

یہ تمام صورتِ حال آپ کے سامنے ہے، اسے ذہن میں رکھ کر مولانا مودودی کی مذکورہ عبارت کو ایک بار پھر پڑھیے، مولانا نے یہ واقعہ اس طرح ذکر کیا ہے کہ گویا حضرت معاویہؓ اس مسئلے میں بالکل منفرد ہیں، اور کسی اجتہادی رائے کی بنا پر نہیں بلکہ (معاذ اللہ) کسی سیاسی غرض سے انہوں نے یہ "بدعت" جاری کی ہے اور اس طرح "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کر ڈالا ہے، لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ سراسر فقہی مسئلہ ہے جس میں وہ تنہا بھی نہیں ہیں بلکہ صحابہ کرامؓ میں سے حضرت معاذ بن جبلؓ جیسے جلیل القدر صحابی (جن کے علم و فقہ پر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت موجود ہے[1]) اور تابعینؒ میں سے مسروقؒ، حسن بصریؒ، ابراہیم نخعیؒ، محمد بن حنفیہؒ، محمد بن علی بن حسینؒ اور اسحاق بن راہویہؒ جیسے فقہاء بھی ان کے ساتھ ہیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ فقہی مسلک بلاشبہ بعد کے فقہاء نے اختیار نہیں کیا، ہم خود بھی اس مسلک کے قائل نہیں ہیں، لیکن ساتھ ہی ہمارا اعتقاد یہ بھی ہے کہ اگر حضرت معاویہؓ اپنے اس اجتہاد میں بالکل تنہا ہوں تب بھی اس بات کا کوئی جواز نہیں ہے کہ ان کے اس اجتہاد کو "بدعت" کہا جائے، یا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ انہوں نے سیاست کو دِین پر غالب رکھنے اور "حلال وحرام کی تمیز" کو مٹانے کی "پالیسی" شروع کردی تھی۔ کیا حضرت علیؓ سے اختلاف کر کے حضرت معاویہؓ کو اتنا بھی حق نہیں رہا کہ وہ کسی شرعی مسئلے میں اپنے علم وفضل سے کام لے کر کوئی اجتہاد کرسکیں؟ جبکہ وہ فقہاء میں سے ہیں اور ان کے بارے میں صحیح بخاری میں یہ روایت موجود ہے کہ:-

قيل لابن عباس: هل لک فی أمير المؤمنين معاوية؟ ما أوتر إلا بواحدة. قال: أصاب، إنه فقيه.[2]

---

(۱) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم، أعلمهم بالحلال والحرام معاذ بن جبل.

(۲) صحیح بخاری، کتاب المناقب، ذکر معاوية بن أبی سفيان، ج:۱ ص:۵۳۱، نور محمد کراچی۔

ترجمہ:- حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ امیرالمؤمنین معاویہؓ ہمیشہ ایک رکعت وتر پڑھتے ہیں، کیا آپ اس معاملے میں کچھ فرمائیں گے؟ حضرت ابنِ عباسؓ نے جواب دیا: انہوں نے دُرست کیا، وہ فقیہ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہ اِمام زہریؒ جن کا مقولہ مولانا مودودی صاحب نے نقل کیا ہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس معاملے میں اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے اس فعل کو ''بدعت'' نہیں کہتے، بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے:-

راجع السُّنّة الأولىٰ.[1]

ترجمہ:- پہلی سنت کو لوٹا دیا۔

اس میں ''پہلی سنت'' کا لفظ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ دُوسری سنت جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جاری رکھی تھی، وہ بھی سنت ہی تھی، بدعت نہ تھی، لیکن حیرت ہے کہ مولانا مودودی صاحب ان کے اس جملے کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں:-

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آکر اس بدعت کو موقوف کیا۔ (ص:۱۷۳)

## نصف دیت کا معاملہ

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں ''قانون کی بالاتری کے خاتمے'' اور سیاست کو دِین پر غالب رکھنے کی ''پالیسی'' کی دُوسری شہادت مولانا مودودی نے یہ پیش کی ہے:-

حافظ ابنِ کثیرؒ کہتے ہیں[2] کہ دیت کے معاملے میں بھی حضرت

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج:۹ ص:۲۳۲۔

(۲) اس معاملے میں بھی مولانا مودودی سے غلطی ہوئی ہے، یہ مقولہ خود حافظ ابنِ کثیرؒ کا نہیں ہے بلکہ اِمام زہریؒ کا ہے، ''وبه قال الزهري'' کے الفاظ اس پر شاہد ہیں۔

معاویہؓ نے سنت کو بدل دیا، سنت یہ تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی مگر حضرت معاویہؓ نے اس کو نصف کردیا، اور باقی خود لینی شروع کردی۔ (ص:۱۷۳،۱۷۴)

اس میں اوّل تو خط کشیدہ جملہ نہ حافظ ابنِ کثیرؒ کا ہے، نہ اِمام زہریؒ کا، بلکہ یہ خود مولانا کا ہے (یہ نشاندہی ہم نے اس لئے کی ہے کہ مولانا کی عبارت سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ حافظ ابنِ کثیرؒ کا ہے)۔

البدایہ والنہایہ کی اصل عبارت یہ ہے:-

**وبہ قال الزھری ومضت السُّنّة أن دیة المعاھد کدیة المسلم و کان معاویة اول من قصرھا إلی النصف وأخذ النصف لنفسه.**(۱)

ترجمہ:- مذکورہ سند ہی سے اِمام زہریؒ کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے کہ: سنت یہ چلی آتی تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہوگی، اور حضرت معاویہؓ پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے اسے کم کرکے نصف کردیا، اور نصف اپنے واسطے لے لی۔

یہ دُرست ہے کہ یہ عبارت سرسری نظر میں بڑی مغالطہ انگیز ہے، کیونکہ اس سے بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے باقی نصف دیت اپنے ذاتی استعمال میں لانی شروع کردی تھی، لیکن کاش! مولانا مودودی اس مجمل اور سرسری مقولے کو دیکھ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر اتنا سنگین الزام عائد کرنے سے قبل صورتِ حال کی پوری تحقیق فرمالیتے، ہمارا خیال ہے کہ اگر مولانا اس موقع پر شروحِ حدیث میں سے کسی بھی مستند کتاب کی مراجعت فرماتے تو کوئی غلط فہمی باقی نہ رہتی۔

واقعہ اصل میں یہ ہے کہ حافظ ابنِ کثیرؒ نے اِمام زہریؒ کا یہ مقولہ نہایت اختصار اور اجمال کے ساتھ ذکر کیا ہے، ان کا پورا مقولہ سامنے ہو تو بات بالکل صاف

(۱) البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۹۔

ہوجاتی ہے، مشہور محدّث اِمام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں ان کا یہ مقولہ ابنِ جریج کی سند سے پوری تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے، اسے ملاحظہ فرمایئے:-

عن الزهری قال: كانت دية اليهودی والنصرانی فی زمن نبی الله صلى الله عليه وسلم مثل دية المسلم وأبی بكر وعمر وعثمان رضی الله عنهم فلما كان معاوية أعطى أهل المقتول النصف وألقى النصف فی بيت المال. قال: ثم قضى عمر بن عبدالعزيز فی النصف وألقى ما كان جعل معاوية.[1]

ترجمہ:- اِمام زہریؒ فرماتے ہیں کہ یہودی اور نصرانی کی دیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مسلمان کی دیت کے برابر تھی، حضرت ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے عہد میں بھی ایسا ہی رہا، پھر جب حضرت معاویہؓ خلیفہ بنے تو آدھی دیت مقتول کے رشتہ داروں کو دی اور آدھی بیت المال میں داخل کردی، پھر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے دیت تو آدھی ہی رکھی، مگر (بیت المال کا) جو حصہ معاویہؓ نے مقرّر کیا تھا وہ ساقط کردیا۔

اس سے یہ بات تو صاف ہوگئی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے آدھی دیت خود لینی شروع نہیں کی تھی بلکہ بیت المال میں داخل کرنے کا حکم دیا تھا۔ لہٰذا حافظ ابنِ کثیرؒ نے اِمام زہریؒ کا جو مقولہ نقل کیا ہے اس میں "أخذ النصف لنفسه" (آدھی خود لینی شروع کردی) سے مراد بیت المال کے لئے لینا ہے، نہ کہ اپنے ذاتی استعمال کے لئے۔

اب یہ بات رہ جاتی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہد کی دیت مسلمان کے برابر کی تھی تو حضرت معاویہؓ نے اسے نصف کرکے باقی نصف کو

---

(۱) السنن الکبریٰ للبیہقی ج:۸ ص:۱۰۲، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد دکن ۱۳۵۴ھ۔

بیت المال میں کیوں داخل کر دیا؟ سو حقیقت یہ ہے کہ معاہد کی دیت کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف روایتیں مروی ہیں، اس لئے یہ مسئلہ عہدِ صحابہؓ سے مختلف فیہ چلا آتا ہے، ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس طرح منقول ہے کہ:-

عقل الكافر نصف دية المسلم.[1]

ترجمہ:- کافر کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہوگی۔

چنانچہ اسی حدیث کے پیشِ نظر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور امام مالکؒ اسی بات کے قائل ہیں کہ معاہد کی دیت مسلمان کی دیت سے نصف ہونی چاہئے۔[2] اس کے برخلاف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

دية ذمي دية مسلم.[3]

ترجمہ:- ذمی کی دیت مسلمان کی دیت کے برابر ہے۔

چنانچہ امام ابوحنیفہؒ اور حضرت سفیان ثوریؒ کا مسلک اسی حدیث پر مبنی ہے، اور وہ مسلمان اور معاہد کی دیت میں کوئی فرق نہیں کرتے۔[4]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چونکہ یہ دونوں روایتیں مروی ہیں، اس لئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد سے دونوں میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ آدھی دیت مقتول کے ورثاء کو دِلوادی اور باقی نصف بیت المال میں داخل کرنے کا حکم دے دیا، اس کی ایک عقلی وجہ بھی خود بیان فرمائی، حضرت ربیعہؒ فرماتے ہیں کہ:-

فقال معاوية: إن كان أهله أصيبوا به فقد أصيب به بيت

---

(۱) رواه أحمد والنسائي والترمذي وروى مثله ابن ماجة (نيل الأوطار ج:۷ ص:۶۴، مطبعہ عثمانیہ، ۱۳۵۷ھ)

(۲) نيل الأوطار ج:۷ ص:۶۵، و بداية المجتهد ج:۲ ص:۴۱۴۔

(۳) السنن الكبرىٰ للبيهقي ج:۸ ص:۱۰۲۔

(۴) نيل الاوطار ج:۷ ص:۵۵، و بداية المجتهد ج:۲ ص:۴۱۴۔

مال المسلمين فاجعلوا لبيت مال المسلمين النصف ولأهله النصف خمسمائة دينار، ثم قتل رجل اٰخر من أهل الذمة فقال معاوية: لو أنا نظرنا إلىٰ هٰذا الذى يدخل بيت المال فجعلناه وضيعا عن المسلمين وعونا لهم.(۱)

ترجمہ:- حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ ذمی کے قتل سے اگر اس کے رشتہ داروں کو نقصان پہنچا ہے تو مسلمانوں کے بیت المال کو بھی نقصان پہنچا ہے (کیونکہ جو جزیہ وہ ادا کیا کرتا تھا وہ بند ہوگیا-تقی) لہٰذا دیت کا آدھا حصہ (پانچ سو دینار) مقتول کے رشتہ داروں کو دے دو اور آدھا بیت المال کو، اس کے بعد ذمیوں میں سے ایک اور شخص قتل ہوا تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ جو رقم ہم بیت المال میں داخل کر رہے ہیں، اگر ہم اس پر غور کریں تو اس سے ایک طرف مسلمانوں کا بوجھ ہلکا ہو اور دُوسری طرف یہ ان کے لئے اعانت بھی ہوئی۔

ایک مجتہد کو حق ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس اجتہاد سے علمی طور پر اختلاف کرے، لیکن یہ اعتراف ہر غیر جانب دار شخص کو کرنا پڑے گا کہ حضرت معاویہؓ نے اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متعارض احادیث میں جس خوبی کے ساتھ تطبیق دی ہے وہ ان کے تفقہ اور علمی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ انصاف فرمایئے کہ ان کے اس حسین فقہی اجتہاد کی تعریف کرنے کے بجائے اسے ''قانون کی بالاتری کا خاتمہ'' قرار دینا کتنا بڑا ظلم ہے؟

یہاں ایک بات اور واضح کردینا مناسب ہوگا اور وہ یہ کہ اگرچہ امام زہریؒ کا قول یہی ہے کہ حضرت معاویہؓ سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے

(۱) مراسيل أبى داؤد ص:۱۳، مطبوعہ اصح المطابع، والجوهر النقى تحت البيهقى ج:۸ ص:۱۰۲، ۱۰۳۔ ہم نے یہ الفاظ مؤخر الذکر سے نقل کئے ہیں، اوّل الذکر میں ''وضيعا عن'' کے بجائے ''وظيفا على'' کا لفظ ہے۔

راشدینؓ ذمی کی دیت مسلمان کے برابر قرار دیتے آرہے تھے اور حضرت معاویہؓ نے پہلی بار اس میں تغیر کیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس بارے میں روایات بہت مختلف ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثیں تو ہم ابھی لکھ کر آئے ہیں، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے بھی اس معاملے میں مختلف روایات مروی ہیں، بعض روایات میں تو یہاں تک ہے کہ ان کے عہد میں ذمی کی دیت مسلمان کی دیت سے ایک تہائی وصول کی جاتی تھی، مشہور محدث علامہ ابن الترکمانیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

وعمر وعثمان قد اختلف عنها.[1]

ترجمہ:- اور حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے مختلف روایات مروی ہیں۔

اسی لئے امام شافعیؒ نے بھی اسی ایک تہائی والے مسلک کو اختیار کیا ہے۔[2]

## مالِ غنیمت میں خیانت

ایک اسی قسم کا اعتراض مولانا مودودی صاحب نے یہ کیا ہے کہ:-

> مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب وسنت کی رُو سے پورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہیئے اور باقی چار حصے اس فوج میں تقسیم ہونا چاہیئے جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو، لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا ان کے لئے الگ نکال دیا جائے، پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ (ص:۱۷۴)

اس اعتراض کی سند میں مولانا نے پانچ کتابوں کے حوالے دیئے ہیں، جن میں سے ایک البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۲۹ کا حوالہ بھی ہے، ہم یہاں اس کی اصل

---

(۱) الجوهر النقي تحت سنن البيهقي ج:۸ ص:۱۰۳، مزید ملاحظہ ہو: نیل الاوطار ج:۷ ص:۶۵۔

(۲) نیل الاوطار بحوالہ مذکورہ و بدایۃ المجتہد ج:۲ ص:۴۱۴۔

عبارت نقل کرتے ہیں:-

وفی هٰذه السنة غزا الحكم بن عمرو نائب زياد على خراسان جبل الأسل عن أمر زياد فقتل منهم خلقًا كثيرًا وغنم أموالًا جمة فكتب إليه زياد:-

أن أمير المؤمنين قد جاء كتابه أن يصطفى له كل صفراء وبيضاء يعنى الذهب والفضة، يجمع كله من هٰذه الغنيمة لبيت المال، فكتب الحكم بن عمرو: أن كتاب الله مقدم علىٰ كتاب أمير المؤمنين، وأنه والله لو كانت السماوات والأرض على عدو فاتقى الله يجعل له مخرجا، ثم نادى فى الناس أن اغدوا علىٰ قسم غنيمتكم فقسمها بينهم وخالف زيادا فيما كتب إليه عن معاوية وعزل الخمس كما أمر الله ورسوله.[1]

ترجمہ:- اسی سال خراسان میں زیاد کے نائب حضرت حکم بن عمروؓ نے زیاد کے حکم سے جبل الاسل کے مقام پر جہاد کیا، بہت سے آدمیوں کو قتل کیا اور بہت سا مالِ غنیمت حاصل کیا، تو زیاد نے انہیں لکھا کہ:-

امیر المؤمنین کا خط آیا ہے کہ سونا چاندی ان کے لئے الگ کرلیا جائے اور اس مالِ غنیمت کا سارا سونا چاندی بیت المال کے لئے جمع کیا جائے۔ حکم بن عمروؓ نے جواب میں لکھا کہ اللہ کی کتاب امیر المؤمنین کے خط پر مقدم ہے، اور خدا کی قسم! اگر آسمان و زمین کسی کے دشمن ہوجائیں اور وہ اللہ سے ڈرے تو اللہ اس کے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکال دیتا ہے۔ پھر انہوں نے

(۱) البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۲۹۔

لوگوں میں اعلان کیا کہ تم اپنے مالِ غنیمت کو تقسیم کرنا شروع کردو، چنانچہ اس مالِ غنیمت کو انہوں نے لوگوں کے درمیان تقسیم کردیا۔ اور زیاد نے حضرت معاویہؓ کی طرف منسوب کرکے جو کچھ انہیں لکھا تھا اس کی مخالفت کی اور مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مطابق بیت المال کے لئے الگ کیا۔

اس عبارت کا مولانا مودودی صاحب کی عبارت کے ساتھ مقابلہ فرمایئے تو مندرجہ ذیل فرق واضح طور پر نظر آئیں گے:-

۱- البدایہ والنہایہ کی اس عبارت میں صاف تصریح ہے کہ اس حکم کی رُو سے حضرت معاویہؓ کی ذات کے لئے سونا چاندی نکالنے کا ارادہ نہیں تھا بلکہ بیت المال کے لئے نکالنا پیشِ نظر تھا، حافظ ابنِ کثیرؒ حکم کے الفاظ صاف لکھ رہے ہیں کہ:-

يجمع كله من هٰذه الغنيمة لبيت المال.

ترجمہ:- اس مالِ غنیمت میں سے سارا سونا چاندی بیت المال کے لئے جمع کیا جائے۔

مگر مولانا مودودی اسی عبارت کے حوالے سے یہ تحریر فرماتے ہیں کہ:-

حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی، سونا ان کے لئے الگ نکال لیا جائے۔ (ص:۱۷۴)

ہمارا ناطقہ قطعی طور پر سر بگریباں ہے کہ اس تفاوت کی کیا تأویل کیا توجیہ کریں؟

۲- مولانا مودودی کی عبارت کو پڑھ کر ہر پڑھنے والا یہ تأثر لے گا کہ جن تواریخ کا مولانا نے حوالہ دیا ہے ان میں صراحت کے ساتھ حضرت معاویہؓ کا یہ حکم براہِ راست منقول ہوگا، اسی حکم کو دیکھ کر مولانا نے یہ عبارت لکھی ہے، لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ البدایہ والنہایہ میں اور اسی طرح باقی تمام تواریخ میں حضرت معاویہؓ کا براہِ راست کوئی حکم منقول نہیں بلکہ زیاد نے ان کی طرف منسوب کرکے اپنے ایک

نائب کو ایسا لکھا تھا،(۱) اور یہ بات کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ نے واقعۃً زیاد کو ایسا لکھا تھا یا زیاد نے خواہ مخواہ ان کی طرف یہ غلط بات منسوب کردی تھی؟

۳- مولانا مودودی نے اس ''حکم'' کا تو ذکر فرمایا ہے، لیکن یہ نہیں بتلایا کہ اس حکم کی تعمیل سرے سے کی ہی نہیں گئی، چنانچہ اگر اصل کتابوں کی مراجعت نہ کی جائے تو ہر پڑھنے والا یہ سمجھے گا کہ یقیناً اس حکم کی تعمیل بھی کی گئی ہوگی۔ حالانکہ آپ نے دیکھا البدایہ والنہایہ میں صاف تصریح ہے کہ حضرت حکم بن عمرو رضی اللہ عنہ نے اس مجمل حکم کی بھی تعمیل نہیں فرمائی۔

۴- مولانا مودودی صاحب کی عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ حکم مستقل طور سے جاری کردیا ہوگا، حالانکہ اگر زیاد کو سچا مان لیا جائے تو بھی زیادہ سے زیادہ یہ حکم ایک خاص جہاد سے متعلق تھا، گویا صورتِ حال تاریخ کی روشنی میں یہ ہے کہ زیاد نے اپنے ایک نائب کو خط لکھتے وقت یہ لکھا تھا کہ حضرت معاویہؓ نے لکھا ہے کہ جبل الاسل کے جہاد میں جو مالِ غنیمت ملا ہے اس میں سے سونا چاندی بیت المال کے لئے الگ کرلیا جائے۔ نائب کو زیاد کا یہ خط ملا مگر اس نے اس حکم کو کتاب اللہ کے خلاف سمجھ کر اس کی تعمیل نہ کی، لیکن مولانا نے آگے پیچھے کی تمام باتوں کو چھوڑ دیا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں کتاب وسنت کی ''صریح خلاف ورزی'' کا الزام لگا کر براہِ راست لکھ دیا کہ:-

> حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے سونا چاندی ان کے لئے الگ نکال لیا جائے۔

تاریخ کے اندر اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اسے ہم نے اُوپر بعینہٖ نقل کردیا ہے۔ اب مولانا مودودی کی عبارت سے قطع نظر کرکے اصل عبارت پر آپ غور فرمائیں گے تو ممکن ہے کہ ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو کہ اگر حضرت معاویہؓ کا یہ حکم شریعت کے مطابق تھا تو حضرت حکم بن عمروؓ نے جو خود صحابہؓ میں سے ہیں، اس پر اتنی خفگی کا

---

(۱) اسی وجہ سے حافظ ابنِ کثیرؒ نے بھی یہ الفاظ لکھے ہیں کہ: ''خالف زیادا فیما کتب إلیه عن معاویة'' اور ''خالف معاویة'' نہیں فرمایا۔

اظہار کیوں فرمایا؟ اور اسے کتاب اللہ کے خلاف کیوں قرار دیا؟ اس شبہ کے جواب میں عرض ہے کہ جتنی تواریخ ہم نے دیکھی ہیں، ان سب میں یہ واقعہ اس قدر اجمال کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے صحیح صورتِ حال کا پتہ لگانا تقریباً ناممکن ہے۔

اوّل تو زیاد کا واسطہ ہی مخدوش ہے، کچھ پتہ نہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے واقعۃً اس مضمون کا خط لکھا بھی تھا یا نہیں؟ اور اگر لکھا تھا تو اس کے الفاظ کیا تھے؟ اور ان کا واقعی منشاء کیا تھا؟ زیاد نے ان کے الفاظ روایت بالمعنیٰ (Indirect Narration) کے طور پر ذکر کیے ہیں جس میں ردّ و بدل کی بہت کچھ گنجائش ہے۔

اور اگر فرض کرلیا جائے کہ زیاد نے کسی بددیانتی یا غلط فہمی کے بغیر حضرت معاویہؓ کا خط دُرست طور پر نقل کیا ہو، تب بھی عین ممکن ہے کہ اس وقت بیت المال میں سونے چاندی کی کمی ہو، اور حضرت معاویہؓ اپنے اندازے یا کسی اطلاع کی بناء پر یہ سمجھے ہوں کہ جبل الاسل کے جہاد میں جو سونا چاندی ہاتھ آیا ہے وہ کل مالِ غنیمت کے پانچویں حصے سے زائد نہیں ہے، اس لئے انہوں نے بیت المال کی کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ حکم جاری فرمایا ہو کہ مالِ غنیمت میں سے جو پانچواں حصہ بیت المال کے لئے بھیجا جائے گا اس میں دیگر اشیاء کے بجائے صرف سونا چاندی ہی بھیجا جائے۔ ظاہر ہے یہ حکم کسی طرح کتاب وسنت کے خلاف نہ تھا، لیکن حضرت حکم بن عمروؓ نے اس پر اس لئے ناراضگی کا اظہار فرمایا کہ فی الواقعہ مالِ غنیمت کے طور پر ملنے والا سونا چاندی پانچویں حصے سے زائد تھا، ایسی صورت میں وہ سارا سونا چاندی بیت المال میں داخل کرنے کو کتاب اللہ کے خلاف تصوّر کرتے تھے۔

غرض کہ اس مجمل واقعے کی بہت سی توجیہات ممکن ہیں، اب یہ بات عقل اور دیانت کے قطعی خلاف ہوگی کہ ہم ان قوی احتمالات کو قطعی طور پر رَد کردیں جن سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی مکمل براءت واضح ہوتی ہو، اور جو ضعیف احتمالات ان کی ذاتِ والا صفات کو مجروح کرتے ہوں انہیں اختیار کر کے بلا تأمل یہ حکم لگادیں کہ ''حضرت معاویہؓ نے مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے صریح اَحکام کی خلاف ورزی کی۔''

# حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سبّ و شتم

مولانا مودودی صاحب نے ''قانون کی بالاتری کا خاتمہ'' کے عنوان کے تحت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر چوتھا اعتراض یہ کیا ہے کہ:-

ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر، خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سبّ و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، حتیٰ کہ مسجدِ نبوی میں منبرِ رسول پر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف ہے اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دِین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے آکر اپنے خاندان کی دُوسری غلط روایات کی طرح اس روایت کو بھی بدلا اور خطبۂ جمعہ میں سبِّ علیؓ کی جگہ یہ آیت پڑھنی شروع کردی:- إن اللہ یأمر بالعدل والإحسان .... الخ۔ (ص:۱۷۴)

مولانا نے اس عبارت میں تین دعوے کئے ہیں: ایک یہ کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ پر خود سبّ و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، دُوسرے یہ کہ ان کے تمام گورنر یہ حرکت کرتے تھے، تیسرے یہ کہ یہ گورنر حضرت معاویہؓ کے حکم سے ایسا کرتے تھے۔ اب تینوں دعووں کا اصل مآخذ میں مطالعہ کیجئے!

جہاں تک پہلے دعوے کا تعلق ہے، سو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف اس ''مکروہ بدعت'' کو منسوب کرنے کے لئے انہوں نے تین کتابوں کے پانچ حوالے پیش کئے ہیں (طبری ج:۴ ص:۱۸۸، ابنِ اثیر ج:۳ ص:۲۳۴، ج:۴ ص:۱۵۴، البدایہ ج:۹ ص:۸۰)،

ہم نے ان میں سے ایک ایک حوالے کو صرف مذکورہ صفحات ہی پر نہیں بلکہ ان کے آس پاس بھی بنظرِ غائر دیکھا، ہمیں کسی بھی کتاب میں یہ کہیں نہیں ملا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ "خود" حضرت علی رضی اللہ عنہ پر برسرِ منبر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، لیکن چونکہ مولانا نے تصریح کے ساتھ لکھا ہے کہ اس "انسانی اخلاق کے خلاف" فعل کا ارتکاب وہ "خود" کیا کرتے تھے، اس لئے ہم نے سوچا کہ شاید مولانا نے ایسی کوئی روایت کسی اور مقام پر دیکھ لی ہو اور اس کا حوالہ دینا بھول گئے ہوں، چنانچہ ہم نے مذکورہ تمام کتابوں کے متوقع مقامات پر دیر تک جستجو کی کہ شاید کوئی گری پڑی روایت ایسی مل جائے، لیکن یقین فرمایئے کہ ایسی کوئی بات ہمیں کسی کتاب میں نہیں ملی، پھر بعض ان تواریخ کی طرف بھی رُجوع کیا جن کے بارے میں مولانا کو اعتراف ہے کہ ان کے مصنف شیعہ تھے، مثلاً مسعودی کی مروج الذہب، لیکن اس میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ملی۔

اس کے برعکس اس جستجو کے دوران ایسی متعدّد روایات ہمیں ملیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ سے اختلاف کے باوجود ان کا کس قدر احترام کرتے تھے؟ ان میں سے چند روایات ملاحظہ فرمایئے:-

۱- حافظ ابنِ کثیرؒ فرماتے ہیں:-

لما جاء خبر قتل علی إلٰی معاویة جعل یبکی، فقالت له امرأته: أتبکیه وقد قاتلته؟ فقال: ویحک إنک لا تدرین ما فقد الناس من الفضل والفقه والعلم.(۱)

ترجمہ:- جب حضرت معاویہؓ کو حضرت علیؓ کے قتل ہونے کی خبر ملی تو وہ رونے لگے، ان کی اہلیہ نے ان سے کہا کہ: آپ اب ان کو روتے ہیں حالانکہ زندگی میں ان سے لڑ چکے ہیں؟ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ: تمہیں پتہ نہیں کہ آج لوگ کتنے علم و فضل اور فقہ سے محروم ہو گئے۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۰۔

یہاں حضرت معاویہؓ کی اہلیہ محترمہ نے یہ اعتراض تو کیا کہ ''اب آپ انہیں کیوں روتے ہیں جبکہ زندگی میں ان سے لڑتے رہے؟'' لیکن یہ نہیں کہا کہ ''زندگی میں تو آپ ان پر سبّ وشتم کیا کرتے تھے، اب ان پر کیوں روتے ہیں؟''

۲- اِمام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت بسر بن ارطاۃؓ نے حضرت معاویہؓ اور حضرت زید بن عمر بن خطابؓ کی موجودگی میں حضرت علیؓ کو کچھ بُرا بھلا کہا، حضرت معاویہؓ نے اس پر انہیں توبیخ کرتے ہوئے فرمایا:-

تشتم عليًّا وهو جده.[1]

ترجمہ:- تم علیؓ کو گالی دیتے ہو حالانکہ وہ ان کے دادا ہیں۔

۳- علامہ ابنِ اثیر جزریؒ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا جو آخری خطبہ نقل کیا ہے، اس میں ان کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ:-

لن يأتيكم من بعدى إلا من أنا خير منه كما أن من قبلى كان خيرًا منّى.[2]

ترجمہ:- میرے بعد تمہارے پاس (جو خلیفہ) بھی آئے گا، میں اس سے بہتر ہوں گا، جس طرح مجھ سے پہلے جتنے (خلفاء) تھے مجھ سے بہتر تھے۔

۴- علامہ ابنِ عبدالبرؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بڑے اصرار کے ساتھ ضرار صدائی سے کہا کہ: ''میرے سامنے علیؓ کے اوصاف بیان کرو'' ضرار صدائی نے بڑے بلیغ الفاظ میں حضرت علیؓ کی غیر معمولی تعریفیں کیں، حضرت معاویہؓ سنتے رہے اور آخر میں رو پڑے، پھر فرمایا:-

رحم الله أبا الحسن، كان والله كذٰلك.[3]

---

(۱) الطبری ج:۴ ص:۲۴۸، مطبعة الاستقامة بالقاهرة ۱۳۵۸ھ و الكامل لابن الأثير ج:۴ ص:۵۔

(۲) الكامل لابن الأثير ج:۴ ص:۲۔

(۳) الاستيعاب تحت الإصابة ج:۳ ص:۴۳، ۴۴، المكتبة التجارية الكبرىٰ، القاهرة ۱۹۳۰ء۔

ترجمہ:- اللہ ابوالحسن (علیؓ) پر رحم کرے، خدا کی قسم وہ ایسے ہی تھے۔

نیز حافظ ابنِ عبدالبرؒ لکھتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مختلف فقہی مسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خط وکتابت کے ذریعے معلومات حاصل کیا کرتے تھے، چنانچہ جب ان کی وفات کی خبر پہنچی تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ:-

ذھب الفقه والعلم بموت ابن أبی طالب.[1]

ترجمہ:- ابنِ ابی طالبؓ کی موت سے فقہ اور علم رُخصت ہوگئے۔

غرض اس جستجو کے دوران ہمیں اس قسم کی تو کئی روایتیں ملیں، لیکن کوئی ایک روایت بھی ایسی نہ مل سکی جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ (معاذ اللہ) خطبوں میں حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کیا کرتے تھے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر یہ الزام کس بنیاد پر؟ کس دِل سے عائد کیا ہے؟

پھر دُوسرا دعویٰ مولانا نے یہ کیا ہے کہ ''ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔''

ظاہر ہے کہ مولانا کا یہ دعویٰ اس وقت تو ثابت ہوسکتا ہے جب وہ حضرت معاویہؓ کے ''تمام گورنروں'' کی ایک فہرست جمع فرما کر ہر ایک گورنر کے بارے میں یہ ثابت فرمائیں کہ ان میں سے ہر ایک نے انفرادی یا اجتماعی طور پر (نعوذ باللہ) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالیاں دی تھیں، نیز اس بات کا بھی ثبوت ان کے پاس ہو کہ ان میں سے ہر ایک کو انفرادی یا اجتماعی طور پر حضرت معاویہؓ نے یہ حکم دیا تھا کہ حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کیا کرو۔

لیکن اپنے اس الزام کی تائید میں جو حوالے مولانا نے پیش کئے ہیں، ہم نے ان کی طرف رُجوع کیا تو ان میں سے ایک بات بھی صحیح ثابت نہیں ہوسکی۔ اوّل تو یہ سمجھ لیجئے کہ مولانا کے دیئے ہوئے پانچ حوالوں میں حضرت معاویہؓ کے صرف دو گورنروں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی مذمت کیا کرتے تھے، ایک

---

(۱) الاستیعاب تحت الإصابة ج:۳ ص:۴۵، ذکر سیدنا علی بن أبی طالب رضی اللہ عنہ۔

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، دُوسرے مروان بن الحکم۔[1] اگر ان روایات کو تھوڑی دیر کے لئے دُرست مان لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ حضرت معاویہؓ کے دو گورنروں پر یہ الزام لگایا جاسکتا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کو بُرا بھلا کہا کرتے تھے۔ اس سے آخر یہ کیسے لازم آگیا کہ حضرت معاویہؓ کے ''تمام گورنر'' خود حضرت معاویہؓ کے حکم سے ایسا کیا کرتے تھے۔ یہ ''تمام گورنر'' کا الزام تو ایسا ہے کہ اسے شاید کسی موضوع روایتوں کے مجموعے سے بھی ثابت نہ کیا جاسکے۔

اس کے بعد اب ان دو روایتوں کی حقیقت بھی سن لیجئے جن میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور مروان بن الحکم کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ (معاذ اللہ) حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کیا کرتے تھے۔

پہلی روایت اصلاً علامہ ابن جریر طبریؒ نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کی ہے اور انہیں سے نقل کرکے ابنِ اثیر جزریؒ نے اپنی تاریخ الکامل میں اسے درج کردیا ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:-

قال هشام بن محمد عن أبى مخنف عن المجالد بن سعيد والصقعب بن زهير وفضيل بن خديج والحسين بن عقبة المرادى قال: كل قد حدثنى بعض هٰذا الحديث فاجتمع حديثهم فيما سقت من حديث حجر بن عدى الكندى وأصحابه أن معاوية بن أبى سفيان لما ولى المغيرة بن شعبة فى جمادى سنة ٤١ دعاه فحمد الله وأثنى عليه ثم قال: أما بعد .... وقد أردت إيصاك

---

(۱) طبری ج:۴ ص:۱۸۸، وکامل ابنِ اثیر ج:۳ ص:۲۳۴ کا حوالہ مولانا نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے متعلق دیا ہے، اور البدایہ ج:۸ ص:۲۵۹ کا حوالہ مروان بن الحکم سے متعلق ہے۔ رہ گیا البدایہ ج:۹ ص:۸۰ کا حوالہ سو اس میں حجاج بن یوسف کے بھائی محمد بن یوسف الثقفی کا ذکر ہے جو حضرت معاویہؓ کا نہیں بلکہ ان کے بہت بعد ولید بن عبدالملک کا گورنر تھا۔ اسی طرح ابنِ اثیر ج:۴ ص:۱۵۴ میں بنواُمیہ کے خلفاء کا عمومی تذکرہ ہے، حضرت معاویہؓ یا ان کے کسی گورنر کا نہیں۔

بأشياء كثيرة فأنا تاركها اعتمادًا على بصرك بما يرضيني ويسعد سلطاني ويصلح به رعيتي ولست تاركًا إيصاءك بخصلة لا تتحم عن شتم علي وذمه والترحم على عثمان والإستغفار له والعيب على أصحاب علي والإقصاء لهم وترك الاستماع منهم ...

قال أبو مخنف: قال الصقعب بن زهر: سمعت الشعبي يقول: .... وأقام المغيرة على الكوفة عاملا لمعاوية سبع سنين وأشهرًا وهو من أحسن شيء سيرة وأشد حبا للعافية غير أنه لا يدع ذم علي والوقوع فيه.[1]

ترجمہ:- ہشام بن محمد نے ابومخنف سے اور انہوں نے مجالد بن سعید، صقعب بن زہیر، فضیل بن خدیج اور حسین بن عقبۃ مرادی سے روایت کیا ہے کہ ابومخنف کہتے ہیں کہ: ان چاروں نے مجھے آئندہ واقعے کے تھوڑے تھوڑے ٹکڑے سنائے، لہٰذا حجر بن عدی کندی کا جو واقعہ میں آگے سنا رہا ہوں اس میں ان چاروں کی مختلف روایتیں جمع ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ: جب ماہِ جمادی ۴۱ھ میں معاویہ بن ابی سفیانؓ نے کوفہ پر مغیرہ بن شعبہؓ کو گورنر بنایا تو انہیں بلاکر پہلے اللہ کی حمد و ثنا کی، پھر کہا کہ ..... میرا ارادہ تھا کہ میں تمہیں بہت چیزوں کی نصیحت کروں، لیکن چونکہ مجھے اعتماد ہے کہ تم مجھے راضی رکھنے، میری سلطنت کو کامیاب بنانے اور میری رعایا کی اصلاح کرنے پر پوری نظر رکھتے ہو، اس لئے میں ان تمام باتوں کو چھوڑتا ہوں۔ البتہ تمہیں ایک نصیحت کرنا میں ترک نہیں کرسکتا وہ یہ کہ علیؓ کی مذمت کرنے اور انہیں گالی دینے سے پرہیز نہ کرنا، عثمانؓ پر رحمت بھیجتے رہنا اور ان کے لئے

---

(۱) الطبری ج:۴ ص:۱۸۷، ۱۸۸۔

> اِستغفار کرتے رہنا۔ علیؓ کے اصحاب پر عیب لگانا، انہیں دُور رکھنا اور ان کی بات نہ سننا، عثمانؓ کے اصحاب کی خوب تعریف کرنا، انہیں قریب کرنا اور ان کی باتیں سنا کرنا.... ابومخنف کہتا ہے کہ صقعب بن زہیر نے کہا کہ میں نے شعبی کو کہتے ہوئے سنا کہ .... مغیرہؓ کوفہ میں معاویہؓ کے عامل کی حیثیت سے سات سال اور کچھ مہینے رہے، وہ بہترین سیرت کے مالک تھے اور عافیت کو تمام لوگوں سے زیادہ پسند کرتے تھے، البتہ وہ علیؓ کی مذمت اور انہیں بُرا بھلا کہنا نہیں چھوڑتے تھے۔

یہ ہے وہ روایت جو مولانا کے مذکورہ بیان کی اصل الأصول ہے، اور جسے دیکھ کر مولانا نے صرف حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر نہیں بلکہ خود حضرت معاویہؓ اور ان کے تمام گورنروں پر بلا استثناء الزام لگادیا ہے کہ وہ برسرِ منبر حضرت علیؓ پر سب وشتم کیا کرتے تھے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر اس روایت کو دُرست مان لیا جائے تو خود اسی روایت میں آگے چل کر صاف لکھا ہوا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی مذمت کس طرح کیا کرتے تھے؟ ٹھیک اسی صفحے پر جس پر ابومخنف کے مذکورہ بالا الفاظ لکھے ہیں، آگے یہ الفاظ بھی ہیں کہ:-

> قام المغيرة فقال في علي وعثمان كما كان يقول وكانت مقالته: اللّٰهم ارحم عثمان بن عفان وتجاوز عنه واجزه بأحسن عمله فإنه عمل بكتابك واتبع سنة نبيك صلى الله عليه وسلم وجمع كلمتنا وحقن دماءنا وقتل مظلومًا اللّٰهم فارحم أنصاره وأولياءه ومحبيه والطالبين بدمه ويدعو علىٰ قتلتله.[1]

ترجمہ:- حضرت مغیرہؓ کھڑے ہوئے اور حضرت علیؓ اور عثمانؓ کے

---

(۱) الطبری ج:۴ ص:۱۸۸۔

بارے میں جو کچھ کہا کرتے تھے وہی کہا۔ ان کے الفاظ یہ تھے کہ: یا اللہ! عثمانؓ بن عفان پر رحم فرما اور ان سے درگزر فرما اور ان کے بہتر عمل کی انہیں جزا دے، کیونکہ انہوں نے تیری کتاب پر عمل کیا اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی اور ہماری بات ایک کردی، اور ہمارے خون کو بچایا اور مظلوم ہوکر قتل ہوگئے، یا اللہ! ان کے مددگاروں، دوستوں، محبت کرنے والوں اور ان کے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں پر رحم فرما۔ اور وہ ان کے قاتلوں کے لئے بددُعا کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت حضرت مغیرہؓ حضرت علیؓ کی ذات پر کوئی شتم نہیں فرماتے تھے بلکہ وہ قاتلینِ عثمانؓ کے لئے بددُعا کیا کرتے تھے جسے شیعہ راویوں نے حضرت علیؓ پر لعن طعن سے تعبیر کردیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب راوی حضرت مغیرہؓ کے الفاظ صراحتاً نقل کررہے ہیں تو فیصلہ ان الفاظ پر کیا جائے گا نہ کہ اس تأثر پر جو ان الفاظ سے راویوں نے لیا، یا اس تعبیر پر جو ''روایت بالمعنیٰ'' (Indirect Narration) میں انہوں نے اختیار کی۔

پھر دُوسری اہم ترین بات یہ ہے کہ حافظ ابنِ جریرؒ نے یہ روایت جس سند کے ساتھ نقل کی ہے، وہ اوّل سے آخر تک شیعہ یا کذاب اور جھوٹے راویوں پر مشتمل ہے۔

اس روایت کا پہلا راوی ہشام بن الکلبی ہے، جو مشہور راوی محمد بن السائب الکلبی کا بیٹا ہے، اس کے بارے میں ابنِ عساکرؒ کا قول ہے کہ:-

رافضی لیس بثقة. (۱)

ترجمہ:- وہ رافضی ہے، ثقہ نہیں۔

اور حافظ ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں کہ ابنِ ابی طی نے اسے اِمامیہ (شیعوں کا ایک فرقہ) میں شمار کیا ہے، اور ابنِ ابی یعقوب حربیؒ فرماتے ہیں کہ:-

راوية للمثالب غاية.

---

(۱) لسان المیزان ج:۶ ص:۱۹۶، دائرۃ المعارف ۱۳۳۰ھ

ترجمہ:- انتہا درجے کی مثالب روایت کرتا ہے۔

پھر دُوسرا راوی ابومخنف لوط بن یحییٰ ہے، اس کے بارے میں حافظ ابنِ عدیؒ فرماتے ہیں:-

شیعی محترق صاحب أخبارهم. (۱)

ترجمہ:- جلا بھنا شیعہ ہے اور انہی کی روایت کا ذکر کرتا ہے۔

تیسرا راوی مجالد بن سعید ہے، ان کے ضعیف ہونے پر تو تمام اَئمہ حدیث کا اتفاق ہے ہی، یہاں تک کہ تاریخی روایات میں بھی انہیں ضعیف مانا گیا ہے۔ اِمام یحییٰ بن سعید قطانؒ کے کوئی دوست کہیں جارہے تھے، انہوں نے پوچھا: ''کہاں جارہے ہو؟'' انہوں نے کہا: ''وہب بن جریر کے پاس جارہا ہوں، وہ سیرت کی کچھ کتابیں اپنے باپ سے بواسطہ مجالد سناتے ہیں۔'' یحییٰ بن سعیدؒ نے فرمایا: ''تم بہت جھوٹ لکھ کر لاؤ گے۔'' (۲)

اس کے علاوہ اشج کا قول ہے کہ: ''یہ شیعہ ہے۔'' (۳)

چوتھے راوی فضیل بن خدیج ہیں، ان کے بارے میں حافظ ذہبیؒ اور حافظ ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں کہ ابوحاتم کا قول ہے کہ فضیل بن خدیج اشتر کے غلام سے روایت کرتا ہے، مجہول ہے، اور جو راوی اس سے روایت کرتا ہے وہ متروک ہے۔ (۴) ان کے علاوہ دو راوی جن کا ذکر ابومخنف نے کیا ہے، یعنی صقعب بن زہیر اور فضیل بن خدیج، وہ تو سرے سے مجہول ہی ہیں۔ (۵)

---

(۱) لسان المیزان ج:۶ ص:۱۹۷۔

(۲) ابو حاتم الرازی، کتاب الجرح والتعدیل ج:۴ ص:۳۶۱، قسم اوّل، دائرۃ المعارف دکن ۱۳۲۶ھ، تہذیب التہذیب ایضاً ج:۱۰ ص:۴۰ سن ۱۳۲۶ھ

(۳) میزان الاعتدال ج:۳ ص:۴۳۸۔

(۴) میزان الاعتدال ج:۲ ص:۳۳۴، و لسان المیزان ج:۴ ص:۴۵۳۔

(۵) صقعب بن زہیر کو اگرچہ اِمام ابوزرعہؒ نے ثقہ قرار دیا ہے مگر اس کے بارے میں ابوحاتم رازیؒ فرماتے ہیں: ''شیخ لیس بمشهور'' (الجرح والتعدیل ج:۲ ص:۴۵۵، قسم:۱) اور فضیل کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''هو مجهول روى عنه رجل متروک الحدیث''۔ (ج:۳ ص:۷۲ قسم:۲)

اب آپ غور فرمائیے کہ جس روایت کے تمام راوی اَز اوّل تا آخر شیعہ ہوں، اور ان میں سے بعض نے مقصد ہی یہ بنا رکھا ہو کہ صحابہ کرامؓ کی طرف بُری بھلی باتیں منسوب کریں، کیا ایسی روایت کے ذریعے حضرت معاویہؓ یا حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے خلاف کوئی الزام عائد کرنا سراسر ظلم نہ ہوگا؟ مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ: ''میں نے قاضی ابوبکر بن العربیؒ اور علامہ ابنِ تیمیہؒ کی کتابوں پر اعتماد کرنے کے بجائے خود تحقیق کر کے آزادانہ رائے قائم کرنے کا راستہ اس لئے اختیار کیا ہے کہ ان بزرگوں نے اپنی کتابیں شیعوں کی رَدّ میں لکھی ہیں، لہٰذا ان کی حیثیت ''وکیلِ صفائی'' کی سی ہوگئی ہے''۔(۱)

اب مولانا مودودی صاحب خود ہی انصاف فرمائیں کہ کیا یہ غیر جانبداری کا تقاضا ہے کہ ''وکیلِ صفائی'' کی بات تو سنی ہی نہ جائے، خواہ وہ کتنی ثقہ، قابلِ اعتماد اور قابلِ احترام شخصیت ہو، اور دُوسری طرف ''مدعی'' کی بات کو بے چوں و چرا تسلیم کرلیا جائے، خواہ وہ کتنا ہی جھوٹا اور افتراء پرداز ہو؟ قاضی ابوبکر بن عربیؒ اور ابنِ تیمیہؒ (معاذ اللہ) حضرت علیؓ کے دُشمن نہیں، صرف حضرت معاویہؓ کے ثقہ دوست ہیں۔ دُوسری طرف ہشام بن الکلبی اور ابومخنف حضرت معاویہؓ کے کھلے دُشمن ہیں، اور ان کی افتراء پردازی ناقابلِ تردید دلائل کے ساتھ ثابت ہے، یہ آخر غیر جانبداری کا کون سا تقاضا ہے کہ پہلے فریق کی روایات سے صرف ان کے ''حبِ معاویہ'' کی وجہ سے یکسر پرہیز کیا جائے اور دُوسرے فریق کی روایات پر ان کے ''بغضِ معاویہ'' کے باوجود کوئی تنقید ہی نہ کی جائے؟

مولانا مودودی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:-

> بعض حضرات تاریخی روایات کو جانچنے کے لئے اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں فلاں راویوں کو ائمہ رجال نے مجروح قرار دیا ہے..... یہ باتیں کرتے وقت یہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ محدثین نے روایات کی جانچ پڑتال کے یہ طریقے دراصل اَحکامی احادیث کے لئے

(۱) خلافت وملوکیت ص:۳۲۰۔

اختیار کئے ہیں ....الخ۔

پھر آگے لکھتے ہیں:۔

اس لئے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ ابنِ سعد، ابنِ عبدالبر، ابنِ کثیر، ابنِ جریر، ابنِ حجر اور ان جیسے دُوسرے ثقہ علماء نے اپنی کتابوں میں جو حالات مجروح راویوں سے نقل کئے ہیں انہیں رَدّ کردیا جائے ....الخ۔ (ص:۳۱۷ تا ۳۱۹)

یہاں سب سے پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاریخی روایات میں سند کی جانچ پڑتال کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور جو روایتیں ان مؤرّخین نے اپنی کتابوں میں درج کردی ہیں، انہیں بس آنکھ بند کرکے قبول ہی کرلینا چاہئے، تو آخر ان حضرات نے تقریباً ہر روایت کے شروع میں سند کو نقل کرنے کی زحمت ہی کیوں اُٹھائی؟ کیا اس طرزِ عمل کا واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ روایات کی صحت و سقم کی ذمہ داری اپنے قارئین اور محققین پر ڈال رہے ہیں کہ مواد ہم نے جمع کردیا، اب یہ تمہارا فرض ہے کہ اسے تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر پرکھو اور اہم نتائج اخذ کرنے کے لئے صرف ان روایات پر بھروسہ کرو جو تحقیق و تنقید کے معیار پر پوری اُترتی ہوں۔ ورنہ اگر تاریخی روایات کے معاملے میں ''اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر بیٹھ جانے'' کی ممانعت کردی جائے،[1] تو خدارا مولانا مودودی صاحب یہ بتلائیں کہ ابنِ جریرؒ نے جو یہ نقل کیا ہے کہ

(۱) پھر یہ بات کس قدر عجیب ہے کہ ابومخنف، کلبی اور ہشام جیسے لوگوں کے حالات دیکھنے کے لئے تو مولانا اسماء الرجال کی کتابیں کھولنے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں اور دُوسرے مؤرّخین کو قابلِ اعتماد ثابت کرنے کے لئے ص:۳۰۹ سے ۳۲۰ تک وہ بلاتکلف اسماء الرجال ہی کے علماء اور کتابوں کے حوالے دیتے چلے گئے ہیں۔ ہم یہ سمجھنے سے بالکل قاصر رہے ہیں کہ کیا جرح و تعدیل صرف ان مؤرّخین ہی کے بارے میں کی جاسکتی ہے جن کی کتابیں اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں اور ان سے اُوپر کے مؤرّخین کے حالات کی چھان بین نہیں کرنی چاہئے؟ یا اسماء الرجال کی کتابوں میں سے مؤرّخین کی، صرف ''تعدیل'' ہی نقل کی جاسکتی ہے اور ''جرح'' نقل کرنا ممنوع ہے؟ یا صرف ان مؤرّخین کے حالات اسماء الرجال کی کتابوں میں دیکھنے چاہئیں جو ثقہ ہیں اور مجروح مؤرّخین کے حالات کے لئے ان کتابوں کی طرف رُجوع نہ کرنا چاہئے؟ ان میں سے کون سی بات ہے جسے صحیح کہا جائے؟

"حضرت داؤد علیہ السلام (معاذ اللہ) "اوریا" کی بیوی پر فریفتہ ہوگئے تھے، اس لئے اسے متعدّد خطرناک جنگی مہمات پر روانہ کرکے اسے مروادیا، پھر اس کی بیوی سے شادی کرلی" اسے رَدّ کردینے کی آخر کیا وجہ ہے؟ نیز ابنِ جریرؒ نے جو اپنی تاریخ میں بے شمار متعارض احادیث نقل کی ہیں، ان میں ترجیح آخر کس بناء پر دی جاسکے گی؟

تطویل سے بچنے کے لئے ہم اس بحث کو یہاں چھوڑتے ہیں کہ حدیث اور تاریخ کے درمیان معیارِ صحت کے اعتبار سے کیا فرق ہے؟ ہم چونکہ یہاں خاص اس روایت کے بارے میں گفتگو کررہے ہیں جس سے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے حکم سے برسرِ منبر حضرت علیؓ کی مذمت کیا کرتے تھے، اس لئے مختصراً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ روایت کیوں ناقابلِ قبول ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ تاریخ اور حدیث کے فرق کو ملحوظ رکھنے کے باوجود مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر مولانا کو بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ یہ روایت قطعی طور پر ناقابلِ اعتماد ہے:-

۱- اس کے راوی سارے کے سارے شیعہ ہیں، اور کسی روایت سے جو صرف شیعوں سے منقول ہو حضرت معاویہؓ پر طعن کرنا کسی طرح دُرست نہیں ہے۔

۲- اس کے تمام راوی ضعیف یا مجہول ہیں، اور ایسی روایت تاریخ کے عام واقعات کے معاملے میں تو کسی درجے میں شاید قابلِ قبول ہوسکتی ہو، لیکن اس کے ذریعے کوئی ایسی بات ثابت نہیں ہوسکتی جس سے کسی صحابی کی ذات مجروح ہوتی ہو۔[1]

---

(۱) مولانا نے ایک جگہ لکھا ہے: "بعض حضرات اس معاملے میں یہ نرالا قاعدہ کلیہ پیش کرتے ہیں کہ ہم صحابہ کرامؓ کے بارے میں صرف وہی روایات قبول کریں گے جو ان کی شان کے مطابق ہو اور ہر اس بات کو رَدّ کردیں گے جس سے ان پر حرف آتا ہو خواہ وہ کسی صحیح حدیث ہی میں وارد ہوئی ہو" (ص:۳۰۵) ہمیں معلوم نہیں کہ مولانا کے معترضین میں سے کسی نے یہ "قاعدہ کلیہ" بیان کیا بھی ہے یا نہیں، بہرحال ہم اس قاعدہ کلیہ کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ دُرست مانتے ہیں۔ ہماری نظر میں قاعدہ یہ ہے کہ: "ہر اس ضعیف روایت کو رَدّ کردیا جائے گا جس سے کسی صحابی کی ذات مجروح ہوتی ہو، خواہ وہ روایت تاریخ کی ہو، یا حدیث کی" ہمارا خیال ہے کہ مولانا کو اس "قاعدہ کلیہ" پر کوئی اشکال نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ بقول حضرت شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلویؒ: صحابہؓ کی عدالت قرآن، سنتِ متواترہ اور اجماع سے ثابت ہے، اور اس کے خلاف کوئی بات ضعیف روایات کے بل پر ثابت نہیں کی جاسکتی۔

۳- یہ روایت درایت کے معیار پر بھی پوری نہیں اُترتی، اس لئے کہ اگر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ حضرت معاویہؓ کے حکم سے سات سال سے زائد مدّت تک منبروں پر کھڑے ہوکر حضرت علیؓ پر "سبّ وشتم کی بوچھاڑ" کرتے رہے تو:-

الف:- اس "سبّ وشتم" کی روایت کرنے والے تو بے شمار ہونے چاہئیں، یہ صرف ایک شخص ہی اس کی روایت کیوں کر رہا ہے؟ اور ایک بھی وہ جو شیعہ ہے اور اس کا جھوٹا ہونا معروف ہے؟

ب:- کیا پوری اُمتِ اسلامیہ اپنے "خیر القرون" میں ایسے اہلِ جرأت اور اہلِ انصاف سے قطعی طور پر خالی ہوگئی تھی جو اس "مکروہ بدعت" سے حضرت معاویہؓ اور ان کے گورنروں کو روکتے، کیا حضرت حجر بن عدی کے علاوہ کوئی باغیرت مسلمان کوفہ میں موجود نہیں تھا؟

ج:- عدالت و دیانت کا معاملہ تو بہت بلند ہے، حضرت معاویہؓ کے عقل و تدبر اور سیاسی بصیرت سے تو ان کے دشمنوں کو بھی انکار نہیں ہوگا، کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان جیسا صاحبِ فراست انسان محض بغض کے جذبات میں بہہ کر ایک ایسا بے فائدہ اقدام کرے جو اس کی حکومت کے استحکام کے لئے خطرہ بن سکتا ہے؟ کوفہ حضرت علیؓ کے معتقدین کا مرکز تھا کیا حضرت معاویہؓ ان کے سامنے حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کرواکر یہ چاہتے تھے کہ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد بھی اہلِ کوفہ سے برابر لڑائی ٹھنی رہے اور وہ کبھی دِل سے حضرت معاویہؓ کے ساتھ نہ ہوں؟ کوئی گھٹیا سے گھٹیا سیاست دان بھی کبھی یہ نہیں کرسکتا کہ اپنے مخالف قائد کے مرنے کے بعد اس قائد کے معتقدین کے گڑھ میں بلاوجہ اسے گالیاں دیا کرے۔ ایسا کام وہی شخص کرسکتا ہے جسے لوگوں کو خواہ مخواہ اپنی حکومت کے خلاف بھڑکانے کا شوق ہو۔[1]

---

(۱) جناب مولانا مودودی صاحب تو اس قسم کے درایتی قرائن کی بناء پر بالکل صحیح الاسناد احادیث کو بھی رَدّ کردینے کے قائل ہیں، چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں صحیح بخاری کی ایک حدیث کو صحیح الاسناد ماننے کے باوجود مولانا نے اسے رَدّ کردیا ہے کہ وہ درایت کے اس جیسے قرائن کے خلاف ہے، حالانکہ وہ حدیث بھی کوئی "احکامی حدیث" نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی واقعہ ہی ہے، کیا اس موقع پر وہ درایت کے ان قرائن کی بناء پر ایسی ظاہر ضعیف روایت کو رَدّ نہیں فرمائیں گے؟

ان وجوہ کی بناء پر یہ روایت تو قطعی طور پر ناقابلِ قبول ہے، دُوسری روایت جس کا حوالہ مولانا نے دیا ہے البدایہ والنہایہ کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:-

ولما كان (مروان) متوليا على المدينة لمعاوية كان يسب عليًّا كل جمعة على المنبر، وقال له الحسن بن علي: لقد لعن الله أباک الحكم وأنت في صلبه على لسان نبيه فقال: لعن الله الحكم وما ولد، والله أعلم.(۱)

ترجمہ:- جب مروان مدینہ منوّرہ میں حضرت معاویہؓ کا گورنر تھا، اس وقت وہ ہر جمعہ کو منبر پر کھڑے ہوکر حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کیا کرتا تھا، اور اس سے حضرت حسن بن علیؓ نے فرمایا کہ: تیرے باپ حکم پر اللہ نے اپنے نبیؐ کی زبان سے اس وقت لعنت کی تھی جب تو اس کی صلب میں تھا، اور یہ کہا تھا کہ: حکم اور اس کی اولاد پر خدا کی لعنت ہو۔

اگرچہ یہ روایت کئی وجہ سے مشکوک ہے،(۲) لیکن اتنی بات کچھ اور روایتوں سے بھی مجموعی طور پر معلوم ہوتی ہے کہ مروان بن الحکم مدینہ منوّرہ کی گورنری کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کچھ ایسے الفاظ استعمال کیا کرتا تھا جو حضرت علیؓ کو محبوب رکھنے والوں کو ناگوار گزرتے تھے، لیکن یہ نازیبا الفاظ کیا تھے؟ ان تاریخی روایتوں میں سے کسی میں ان کا ذکر نہیں، البتہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ایک واقعہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ:-

إن رجلًا جاء إلٰى سهل بن سعد فقال: هٰذا فلان لأمير المدينة يدعو عليًّا عند المنبر، قال: فيقول ماذا؟ قال

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۲۵۹۔

(۲) اوّل تو اس لئے کہ یہ پوری عبارت البدایہ والنہایہ کے اصل مصری نسخے میں موجود نہیں ہے، دُوسرے اس لئے کہ اس کے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو الفاظ منسوب کئے گئے ہیں وہ بہت مشکوک ہیں۔

يقول له: أبو تراب، فضحك وقال: والله ما سماه إلا النبي صلى الله عليه وسلم وما كان له اسم أحب إليه منه.[1]

ترجمہ:- ایک شخص حضرت سہلؓ کے پاس آیا اور بولا کہ امیرِ مدینہ منبر پر کھڑے ہوکر حضرت علیؓ کو سبّ وشتم کرتا ہے، حضرت سہلؓ نے پوچھا: وہ کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا کہ: انہیں ''ابوتراب'' کہتا ہے۔ حضرت سہلؓ ہنس پڑے اور فرمایا: خدا کی قسم اس نام سے تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پکارا ہے اور آپ کے نزدیک ان کا اس سے پیارا نام کوئی نہ تھا۔

اگر یہاں ''امیرِ مدینہ'' سے مراد مروان ہی ہے، جیسا کہ ظاہر یہی ہے تو اس ''سبّ وشتم'' کی حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے۔ ابوتراب کے معنی ہیں ''مٹی کا باپ'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو محبت میں اس نام سے پکارا کرتے تھے، مروان زیادہ سے زیادہ اسے اس کے حقیقی معنوں میں استعمال کرتا ہوگا۔ اگر فرض کیجئے کہ مروان اس سے بھی زیادہ کچھ نازیبا الفاظ حضرت علیؓ کی شان میں استعمال کرتا تھا تو آخر یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ وہ یہ کام حضرت معاویہؓ کے حکم سے کرتا تھا؟ مولانا نے البدایہ کی جس عبارت کا حوالہ دیا ہے، اس میں بھی کہیں یہ مذکور نہیں کہ حضرت معاویہؓ نے اسے اس کام کا حکم دیا تھا یا وہ اس کے اس فعل پر راضی تھے، ایسی صورت میں یہ الفاظ لکھنے کا کوئی جواز ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت معاویہؓ:-

خود، اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ:-

۱- خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سبّ وشتم کی جو نسبت مولانا نے کی ہے، اس کا تو کوئی ادنیٰ ثبوت بھی مولانا کے بیان کردہ حوالوں میں، بلکہ کہیں نہیں ہے، اور اس کے برعکس حضرت معاویہؓ سے حضرت علیؓ کی تعریف وتوصیف کے جملے منقول ہیں۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب علیؓ ج:۱ ص:۵۲۵، اصح المطابع کراچی۔

۲- اسی طرح ''تمام گورنر'' کا جو لفظ مولانا نے استعمال کیا ہے، وہ بھی بالکل بلادلیل ہے، مولانا کے بیان کردہ حوالوں میں صرف دو گورنروں کا ذکر ہے۔

۳- ان دو گورنروں میں سے ایک یعنی مروان بن الحکم کے بارے میں مولانا کے دیئے ہوئے حوالے کے اندر یا اور کہیں یہ بات موجود نہیں ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے حکم سے حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کیا کرتا تھا۔

۴- ''سبّ وشتم کی بوچھاڑ'' کا لفظ بھی بلادلیل ہے، اس لئے کہ مولانا کے دیئے ہوئے حوالے میں تو ''سبّ وشتم'' کے الفاظ منقول نہیں، صحیح بخاری کی روایت سے جو الفاظ معلوم ہوتے ہیں انہیں ''سبّ وشتم'' کھینچ تان کر ہی کہا جاسکتا ہے۔

۵- دُوسرے گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں مولانا نے حوالہ صحیح دیا ہے، لیکن ساتھ ہی اس میں یہ تصریح ہے کہ وہ قاتلینِ عثمانؓ کے لئے بددُعا کیا کرتے تھے، دُوسرے یہ روایت از اوّل تا آخر سارے کے سارے شیعہ راویوں سے مروی ہے اور روایت و درایت ہر اعتبار سے واجب الرد ہے۔

## استلحاقِ زیاد

''قانون کی بالاتری کا خاتمہ'' کے عنوان کے تحت مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر پانچواں اعتراض یہ کیا ہے کہ:-

> زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ کے ان افعال میں سے ہے جن میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مُسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی، زیاد طائف کی ایک لونڈی سمیہ نامی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، لوگوں کا بیان یہ تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں حضرت معاویہؓ کے والد جناب ابوسفیانؓ نے اس لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا تھا اور اسی سے وہ حاملہ

ہوئی، حضرت ابوسفیانؓ نے خود بھی ایک مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ زیاد ان ہی کے نطفے سے ہے، جوان ہوکر یہ شخص اعلیٰ درجے کا مدبر، منتظم، فوجی لیڈر اور غیر معمولی قابلیتوں کا مالک ثابت ہوا، حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں وہ آپؓ کا زبردست حامی تھا اور اس نے بڑی اہم خدمات انجام دی تھیں، ان کے بعد حضرت معاویہؓ نے اس کو اپنا حامی و مددگار بنانے کے لئے اپنے والد ماجد کی زنا کاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد ان ہی کا ولد الحرام ہے، پھر اسی بنیاد پر اسے اپنا بھائی اور اپنے خاندان کا فرد قرار دے دیا۔ یہ فعل اخلاقی حیثیت سے جیسا مکروہ ہے، وہ تو ظاہر ہی ہے، مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریح ناجائز فعل ہے، کیونکہ شریعت میں کوئی نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف حکم موجود ہے کہ ''بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا اور زانی کے لئے کنکر پتھر ہیں'' اُمّ المومنین حضرت اُمِّ حبیبہؓ نے اسی وجہ سے اس کو اپنا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس سے پردہ فرمایا۔ (ص:۱۷۵)

مولانا نے جس افسوسناک انداز سے یہ واقعہ نقل فرمایا ہے، اس پر کوئی تبصرہ سوائے اس کے نہیں کیا جاسکتا کہ اصل تواریخ کی عبارت نقل کر دی جائے۔ قارئین دونوں کا مقابلہ کر کے خود جو چاہیں فیصلہ کرلیں۔

مولانا نے اس واقعے کے لئے چار کتابوں کے حوالے دیئے (الاستیعاب ج:۱ ص:۱۹۶، ابن الاثیر ج:۳ ص:۲۲۰، ۲۲۱، البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۲۸، اور ابنِ خلدون ج:۳ ص:۷، ۸)، ان میں سے البدایہ والنہایہ میں تو اس واقعے کے سلسلے میں کل سات ہی سطریں لکھی ہیں، جن سے واقعے کی کوئی تفصیل ہی نہیں معلوم ہوتی، باقی تین کتابوں میں سے جس

کتاب میں یہ واقعہ سب سے زیادہ مرتب طریقے پر بیان کیا گیا ہے وہ ابنِ خلدون کی تاریخ ہے، جس کا حوالہ مولانا نے سب سے آخر میں دیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:-

> سمیہ جو زیاد کی ماں ہے، حارث بن کلدہ طبیب کی لونڈی تھی، اسی کے پاس اس سے حضرت ابوبکرہؓ پیدا ہوئے، پھر اس نے اس کی شادی اپنے ایک آزاد کردہ غلام سے کردی تھی، اور اس کے یہاں زیاد پیدا ہوا (واقعہ یہ تھا کہ) ابوسفیان اپنے کسی کام سے طائف گئے ہوئے تھے، وہاں انہوں نے سمیہ سے اس طرح کا نکاح کیا جس طرح کے نکاح جاہلیت میں رائج تھے، اور اس سے مباشرت کی، اسی مباشرت سے زیاد پیدا ہوا اور سمیہ نے زیاد کو ابوسفیان سے منسوب کیا، خود ابوسفیان نے بھی اس نسب کا اقرار کرلیا تھا مگر خفیہ طور پر۔ (۱)

آگے لکھتے ہیں:-

> جب حضرت علیؓ شہید ہوگئے اور زیاد نے حضرت معاویہؓ سے صلح کرلی تو زیاد نے مصقلہ بن ہبیرۃ شیبانی کو مامور کیا کہ وہ حضرت معاویہؓ کو ابوسفیان کے نسب کے بارے میں بتلائیں، اور حضرت معاویہؓ کی رائے یہ ہوئی کہ اسے استلحاق کے ذریعہ مائل کریں، چنانچہ انہوں نے ایسے گواہ طلب کئے جو اس بات سے واقف ہوں کہ زیاد کا نسب ابوسفیان سے لاحق ہوچکا ہے، چنانچہ بصرہ کے باشندوں میں سے کچھ لوگوں نے اس بات کی

---

(۱) كانت سمية أم زياد مولاة للحارث بن كلدة الطبيب، وولدت عنده أبا بكرة ثم زوجها بمولًى له وولدت زيادًا وكان أبو سفيان قد ذهب إلى الطائف في بعض حاجاته فأصابها بنوع من أنكحة الجاهلية، وولدت زيادًا هذا ونسبته إلى أبي سفيان وأقر لها به إلا أنه كان بخفية۔
(تاريخ ابن خلدون ج:۳ ص:۱۴، دار الكتاب اللبناني، بيروت ۱۹۵۷ء)۔

گواہی دی اور اکثر شیعانِ علی اس بات کو بُرا سمجھتے تھے یہاں تک کہ ان کے بھائی حضرت ابوبکرۃؓ بھی۔[1]

مولانا کا دُوسرا مأخذ کامل ابنِ اثیر ہے، علامہ ابنِ اثیر جزریؒ نے شروع میں تو بس یہی لکھا ہے کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے جاہلیت میں سمیہ سے مباشرت کی تھی، پھر اس مباشرت کے بارے میں بھی بڑی داستان طرازیاں نقل کی ہیں، اس کے بعد لکھا ہے کہ:-

اس کے علاوہ بھی بڑے قصوں نے رواج پایا، جن کے ذکر سے کتاب طویل ہوجائے گی، اس لئے ہم ان سے اعراض کرتے ہیں، اور جو لوگ حضرت معاویہؓ کو معذور قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے زیاد کا استلحاق اس لئے کیا تھا کہ جاہلیت میں نکاح کی بہت سی قسمیں تھیں، ان سب قسموں کو ذکر کرنے کی تو ضرورت نہیں، البتہ ان میں سے ایک قسم یہ تھی کہ کسی کسبی عورت سے بہت سے لوگ مباشرت کرتے تھے، پھر جب وہ حاملہ ہوکر بچہ جنتی تو اس بچے کو جس کی طرف چاہتی منسوب کردیتی تو وہ اس کا بیٹا قرار پاجاتا، جب اسلام آیا تو نکاح کا یہ طریقہ حرام ہوگیا، لیکن نکاح کے جاہلی طریقوں میں سے جس طریقے سے بھی کوئی بچہ کسی باپ کی طرف منسوب ہوا ہو، اسلام کے بعد بھی اس کو اس نسب پر برقرار رکھا گیا اور ثبوتِ

---

(۱) ولما قتل علی، وصالح زیاد معاویة وضع مصقلة بن هبیرة الشیبانی علی معاویة لیعرض له بنسب أبی سفیان ففعل... ورأی معاویة ان یستمیله باستلحاقه فالتمس الشهادة بذلک ممن علم لحوق نسبه بأبی سفیان فشهد له رجال من أهل البصرة وألحقه، وکان أکثر شیعة علی ینکرون ذلک وینقمونه علی معاویة حتی أخوه أبو بکرة ۔ (ابن خلدون ج:۳ ص:۱۵)۔

نسب کے معاملے میں کوئی تفریق نہیں کی گئی۔ (۱)

ابنِ خلدونؒ اور ابنِ اثیرؒ کے ان بیانات سے یہ بات تو صاف ہوگئی کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے طائف میں سمیہ سے زنا نہیں بلکہ ایک خاص قسم کا نکاح کیا تھا جو جاہلیت میں جائز سمجھا جاتا تھا، اسلام نے اسے ممنوع تو کردیا مگر اس سے پیدا ہونے والی اولاد کو غیر ثابت النسب یا ولد الحرام قرار نہیں دیا، لیکن آگے چل کر ابنِ اثیر جزریؒ نے ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ:-

> حضرت معاویہؓ یہ سمجھے کہ یہ استلحاق جائز ہے، اور انہوں نے جاہلیت اور اسلام کے استلحاق میں فرق نہیں کیا، اور یہ فعل ناقابلِ قبول ہے، کیونکہ اس فعل کے منکر ہونے پر مسلمانوں کا اتفاق ہے، اور اسلام میں اس طرح کا استلحاق کسی نے نہیں کیا کہ اسے حجت قرار دیا جائے۔

لیکن واقعات کی مجموعی تحقیق کرنے سے ابنِ اثیر جزریؒ کا یہ اعتراض بھی بالکل ختم ہوجاتا ہے۔ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ اگر حضرت ابوسفیانؓ نے جاہلی نوع کا ایک نکاح کرنے کے بعد زیاد کو اسلام سے قبل اپنا بیٹا قرار نہ دیا ہوتا اور وہ خود اسلام کے بعد اسے اپنا بیٹا بنانا چاہتے تب تو یہ اعتراض دُرست ہوتا کہ حضرت معاویہؓ نے جاہلیت اور اسلام کے استلحاق میں فرق نہیں کیا، یہاں واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ نے زمانۂ جاہلیت ہی میں اپنے ساتھ زیاد کا استلحاق کرلیا تھا، البتہ عام لوگوں کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا تھا، ابنِ خلدونؒ صاف لکھتے ہیں کہ:-

---

(۱) وجری أقاصیص یطول بذکرها الکتاب فأضربنا عنها ومن اعتذر لمعاویة قال إنما استلحق معاویة زیادًا لأن أنکحة الجاهلیة کانت أنواعًا لا حاجة إلی ذکر جمیعها وکان منها أن الجماعة یجامعون البغی فاذا حملت وولدت ألحقت الولد بمن شائت منهم فیلحقه، فلما جاء الاسلام حرم هذا النکاح إلا أنه أقر کل ولد کان ینسب إلی أب من أی نکاح کان من أنکحتهم علی نسبه ولم یفرق بین شیء منها۔ (کامل ابن اثیر ج:۳ ص:۱۷۷، طبع قدیم)۔ اس کے بعد کی عبارت اور اس پر تبصرہ آگے آرہا ہے۔

وولدت زيادًا هٰذا ونسبته إلٰى أبى سفيان وأقر لها به إلا أنه كان بخفية.[۱]

ترجمہ:- سمیہ کے یہاں زیاد پیدا ہوا اور اس نے اسے ابوسفیانؓ سے منسوب کیا اور ابوسفیانؓ نے بھی اس نسب کا اقرار کیا، مگر خفیہ طور پر۔

زیاد چونکہ حضرت ابوسفیانؓ کے مسلمان ہونے سے پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا،[۲] اس لئے یہ استلحاق یقیناً اسلام سے پہلے ہوا تھا، البتہ اس کا اظہار لوگوں پر نہیں ہوا تھا۔ جب حضرت معاویہؓ کے سامنے دس گواہوں نے (جن میں بعض جلیل القدر صحابہ بھی شامل تھے) اس بات کی گواہی دی کہ حضرت ابوسفیانؓ نے اپنے ساتھ زیاد کے نسب کا اقرار کیا تھا، تب حضرت معاویہؓ نے ان کے لئے اس نسب کا اعلان کیا، مشہور محدث حافظ ابنِ حجر رحمۃ اللہ علیہ اس واقعے کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

حضرت معاویہؓ نے ۴۴ھ میں ان (زیاد) کا استلحاق کیا، اور اس بات پر زیاد بن اسماء الحرمازی، مالک بن ربیعہ سلولیؓ اور منذر بن زبیر نے شہادت دی تھی، یہ بات مدائنیؒ نے اپنی مختلف سندوں سے روایت کی ہے اور گواہوں میں مندرجہ ذیل ناموں کا اضافہ کیا ہے: جویریہ بنت ابی سفیان، مسور بن قدامۃ الباہلی، ابنِ ابی نصر الثقفی، زید بن نفیل الازدی، شعبہ بن العلقم المازنی، بنو عمرو بن شیبان کا ایک شخص، اور بنو المصطلق کا ایک شخص، ان سب نے ابوسفیانؓ کے بارے میں گواہی دی کہ زیاد ان کا بیٹا ہے، البتہ منذر نے گواہی یہ دی تھی کہ میں نے حضرت علیؓ کو یہ

---

(۱) ابنِ خلدون ج:۳ ص:۱۴۔

(۲) کیونکہ حضرت ابوسفیانؓ فتحِ مکہ کے موقع پر اسلام لائے تھے اور زیاد کی ولادت کے بارے میں چار قول ہیں: ۱-ہجرت سے پہلے، ۲-ہجرت کے سال، ۳-غزوۂ بدر کے دن، ۴-اور ٹھیک فتحِ مکہ کے سال (استیعاب ج:۱ ص:۵۴۸)۔

کہتے سنا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ ابوسفیانؓ نے یہ بات کہی تھی۔ پھر حضرت معاویہؓ نے خطبہ دیا اور زیاد کا استلحاق کرلیا۔

پھر زیاد بولے اور انہوں نے کہا کہ: جو کچھ ان گواہوں نے کہا ہے اگر وہ حق ہے تو الحمدللہ! اور اگر یہ غلط ہے تو میں نے اپنے اور اللہ کے درمیان ان لوگوں کو ذمہ دار بنادیا ہے۔[1]

حافظ ابنِ حجرؒ نے دسویں گواہ کا نام نہیں لکھا ہے، بلکہ ''بنو المصطلق کا ایک شخص'' کہا ہے، ابوحنیفہ الدینوریؒ (متوفی ۲۸۲ھ) نے ان کا نام ''یزید'' لکھا ہے اور ان کی گواہی اس طرح نقل کی ہے:-

**أنه سمع أبا سفيان يقول إن زيادًا من نطفة أقرها في رحم أمه سميّة فتم ادعاؤه إياه.**[2]

ترجمہ:- میں نے ابوسفیانؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ زیاد اس نطفے سے ہے جو میں نے اس کی ماں سمیہ کے رحم میں ڈالا تھا، لہٰذا یہ ثابت ہوگیا کہ ابوسفیانؓ نے زیاد کے حق میں اپنا بیٹا ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔

جن گواہوں کے نام حافظ ابنِ حجرؒ نے مدائنیؒ کے حوالے سے لکھے ہیں ان میں حضرت مالک بن ربیعہ سلولیؓ صحابہؓ میں سے ہیں اور بیعتِ رضوان میں شریک رہے ہیں۔[3] ان حالات میں ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ حضرت معاویہؓ نے زیاد کا جو استلحاق دس گواہوں کی گواہی پر مجمعِ عام میں کیا، اس میں شریعت کے کون سے مُسلّمہ قاعدے کی خلاف ورزی ہوئی؟ جبکہ ابنِ اثیر جزریؒ کی تصریح کے مطابق جاہلی نکاح سے جاہلیت میں پیدا ہونے والی اولاد کو اسلام میں غیر ثابت النسب قرار نہیں دیا جاتا

---

(۱) الاصابة ج:۱ ص:۵۶۳، المكتبة التجارية الكبرىٰ، القاهرة ۱۳۵۸ھ ''زیاد بن ابیہ''۔

(۲) الدینوریؒ: الاخبار الطوال ص:۲۱۹، بتحقیق عبدالمنعم عامر، الادارة العامة للثقافة، القاهرة ۱۹۶۰ء۔

(۳) الاصابة ج:۳ ص:۳۲۴۔

تھا، یہی وجہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ:-

أما واللہ لقد علمت العرب أنی كنت أعزها فی الجاهلية وأن الإسلام لم يزدنی إلا عزا وأنی لم أتكثر بزياد من قلة ولم أتعزز به من ذلة لٰكن عرفت حقا له فوضعته موضعه.[1]

ترجمہ:- خدا کی قسم! تمام عرب جانتے ہیں کہ جاہلیت میں مجھے تمام عربوں سے زیادہ عزّت حاصل تھی، اور ظاہر ہے کہ اسلام نے بھی میری عزّت میں ہی اضافہ کیا ہے، لہٰذا نہ تو ایسا ہے کہ میری نفری قلیل ہو اور میں نے زیاد کے ذریعہ اس میں اضافہ کرلیا ہو، اور نہ کبھی میں ذلیل تھا کہ زیاد کی وجہ سے مجھے عزّت مل گئی ہو، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ میں نے اس کا حق سمجھا ہے اور اسے اس کے حقدار تک پہنچادیا ہے۔

کیا مذکورہ بالا واقعات کی روشنی میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس حلفیہ بیان کے بعد (جسے مولانا مودودی نے یقیناً ابنِ اثیر اور ابنِ خلدون کی تواریخ میں دیکھا ہوگا) یہ کہنے کی کوئی گنجائش باقی رہتی ہے کہ:-

زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ کے ان افعال میں سے ہے جن میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مُسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ (ص:۱۷۵)

یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھی جو حضرات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس فعل پر اعتراض کر رہے تھے، ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ زیاد تو زنا سے پیدا ہوا تھا، اس لئے اس کا نسب حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے لاحق نہیں کیا جاسکتا۔ اس

---

(۱) ابن أثیر ج:۳ ص:۱۷۶، طبع قدیم، الطبری ج:۴ ص:۱۶۳، مطبعة الاستقامة بالقاهرة ۱۳۵۸ھ، وابن خلدون ج:۳ ص:۱۶، دار الكتاب اللبنانی، بیروت ۱۹۵۷ء، تینوں نے یہ مقولہ نقل کیا ہے، البتہ ابنِ خلدونؒ نے صرف خط کشید جملہ لکھا ہے اور اس میں "حق اللہ" کے الفاظ ہیں۔

کے بجائے ان کا اعتراض یہ تھا کہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے سمیہ سے مباشرت ہی نہیں کی، حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مخالفت کا بڑا شہرہ ہے لیکن کسی بندۂ خدا نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ ان کی وجۂ اعتراض کیا تھی؟ حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے:-

لا واللہ ما علمت سمية رأت أبا سفيان قط.[1]

ترجمہ:- نہیں، خدا کی قسم! مجھے معلوم نہیں کہ سمیہ نے کبھی ابوسفیانؓ کو دیکھا بھی ہے۔

اور عبدالرحمٰن بن الحکم نے اس موقع پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ہجو میں جو شعر کہے تھے، ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے ؎

واشهد أنها حملت زيادًا
وصخر من سميّة غير دان[2]

یعنی: میں گواہی دیتا ہوں کہ سمیہ کے بطن میں زیادہ کا استقرارِ حمل اس حالت میں ہوا تھا کہ صخر (ابوسفیانؓ) سمیہ کے قریب بھی نہیں تھا۔

اور ابنِ مفرغ نے کہا تھا ؎

شهدت بأن أمك لم تباشر
أبا سفيان واضعة القناع[3]

ترجمہ:- میں گواہی دیتا ہوں کہ تیری ماں نے کبھی اوڑھنی اُتار کر ابوسفیانؓ کے ساتھ مباشرت ہی نہیں کی۔

اور وہ ابنِ عامر جنھیں ایک خاص وجہ سے اس استلحاق کو ناجائز قرار دینے کی سب سے زیادہ خواہش تھی، انہوں نے بھی ایک شخص کے سامنے بس اپنے اس

---

(۱) الاستیعاب تحت الاصابۃ ج:۱ ص:۵۵۰۔

(۲) ایضاً ج:۱ ص:۵۵۱۔

(۳) الاستیعاب ج:۱ ص:۵۵۲۔

ارادے کا اظہار کیا تھا کہ:-

لقد هممت أن آتي بقسامة من قريش يحلفون أن أبا سفيان لم ير سمية.(۱)

ترجمہ:- میرا ارادہ ہے کہ میں قریش کے بہت سے قسم کھانے والوں کو لاؤں جو اس بات پر قسم کھائیں کہ ابوسفیانؓ نے کبھی سمیہ کو دیکھا تک نہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ تمام معترضین اس بات کو ثابت کرنے پر کیوں زور لگا رہے تھے کہ حضرت ابوسفیانؓ کبھی سمیہ کے قریب تک نہیں گئے، انہوں نے سیدھی بات یہ کیوں نہیں کہی کہ ابوسفیانؓ اگر سمیہ کے قریب گئے بھی ہوں تو یہ سراسر زنا تھا، اور زنا سے کوئی نسب ثابت نہیں ہوتا، یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ ان حضرات کے نزدیک بھی اگر یہ ثابت ہوجائے کہ ابوسفیانؓ نے سمیہ سے جاہلیت میں مبینہ مباشرت کی تھی تو پھر ان کو بھی زیاد کے استلحاق میں کوئی اعتراض نہیں تھا، ان کو اعتراض صرف یہ تھا کہ ان کے علم کے مطابق ابوسفیانؓ سمیہ کے قریب تک نہیں گئے، اس لئے زیاد کا استلحاق دُرست نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان کا یہ علم حضرت معاویہؓ پر حجت نہیں ہوسکتا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس دس قابلِ اعتماد شہادتیں اثبات پر گزر چکی تھیں، ان کے مقابلے میں یہ حضرات ہزار بار نفی پر شہادت دیں تو شرعاً اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ہم پر تو اس واقعے کی تمام تفصیلات پڑھنے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جذبۂ احترامِ شریعت کا غیر معمولی تأثر قائم ہوا ہے۔ غور فرمایئے کہ حضرت معاویہؓ کی شرافت وفضیلت کا معاملہ تو بہت بلند ہے، ایک معمولی آدمی کے نفس کے لئے بھی یہ بات کس قدر ناگوار ہوتی ہے کہ جس شخص کو کل تک ساری دُنیا ولد الحرام اور غیر ثابت النسب کہتی اور سمجھتی آئی تھی، آج اسے اپنا بھائی بنالیا جائے۔ ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابی، سردار اور سردار زادے کے لئے یہ بات کس قدر

---

(۱) الطبری ج:۴ ص:۱۶۳۔

شاق ہوگی؟ لیکن جب دس گواہوں کے بعد ایسے شخص کو اپنا بھائی قرار دینا ''حق اللہ'' بن جاتا ہے تو وہ اپنے تمام جذبات کو ختم کر کے اور مخالفین کی کھڑی ہوئی صعوبتوں کو جھیل کر پکار اُٹھتے ہیں کہ:-

عرفت حق اللہ فوضعته موضعه۔ (۱)

ترجمہ:- میں نے اللہ کے حق کو پہچان لیا، اس لئے اسے اس کے حقدار تک پہنچا دیا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے جن معترضین کو اصل واقعے کا علم ہوتا گیا، انہوں نے اپنے اعتراضات سے رُجوع کرلیا۔ حافظ ابنِ عبدالبرؒ ہی نے نقل کیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن الحکم اور ابنِ مفرغ جنھوں نے اس واقعے پر حضرت معاویہؓ کے حق میں ہجویہ اشعار کہے تھے، حضرت معاویہؓ کے مذکورہ بالا ارشاد کے بعد انہوں نے بھی اپنے سابقہ رویے پر شرمندگی ظاہر کی، (۲) نیز وہ ابنِ عامر جن کے بارے میں حافظ ابنِ جریرؒ نے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس استلحاق کی مخالفت کرنے کے لئے نفی پر گواہیاں جمع کرنے کا ارادہ کیا تھا، طبری ہی کی تصریح کے مطابق وہ بھی بعد میں حضرت معاویہؓ سے معافی مانگنے آئے تھے اور حضرت معاویہؓ نے انہیں معاف کردیا تھا۔ (۳)

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی شروع میں اس استلحاق کے خلاف تھیں، ابنِ خلدونؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ زیاد نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ''زیاد بن ابی سفیان'' کے نام سے خط لکھا، مقصد یہ تھا کہ حضرت عائشہؓ بھی جواب میں ''زیاد بن ابی سفیان'' لکھ دیں گی تو اسے اپنے استلحاقِ نسب کی سند مل جائے گی، لیکن حضرت عائشہؓ نے جواب میں یہ الفاظ لکھے کہ:-

من عائشة أمّ المؤمنين إلى ابنها زياد۔ (۴)

---

(۱) ابنِ خلدون ج:۳ ص:۱۶۔

(۲) الاستیعاب ج:۱ ص:۵۵۱ تا ۵۵۵ (تحت الاصابة)۔

(۳) الطبری ج:۴ ص:۱۶۳۔

(۴) ابنِ خلدونؒ ج:۳ ص:۱۶۔

ترجمہ:- تمام مؤمنین کی ماں کی طرف سے اپنے بیٹے زیاد کے نام۔

لیکن بعد میں جب حقیقتِ حال سامنے آئی تو خود حضرت عائشہؓ نے زیاد کو ''زیاد بن ابی سفیان'' کے نام سے خط لکھا۔ حافظ ابنِ عساکرؒ نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ مرہ قبیلے کے لوگ زیاد کے پاس حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کا سفارشی خط لے جانا چاہتے تھے، حضرت عبدالرحمٰنؓ زیاد کو ''ابنِ ابی سفیان'' لکھتے ہوئے ہچکچا رہے تھے، اس لئے حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچے، حضرت عائشہؓ نے صاف یہ الفاظ لکھے کہ:-

من عائشة أم المؤمنين إلٰی زياد بن أبي سفيان.[1]

ترجمہ:- اُمّ المؤمنین عائشہ کی طرف سے ابوسفیان کے بیٹے زیاد کے نام۔

جب زیاد کے پاس یہ خط پہنچا تو اس نے خوش ہو کر یہ خط مجمعِ عام میں سنایا۔

ان حالات میں ہمیں یہ توقع رکھنا بے محل نہیں کہ مولانا مودودی صاحب بھی مجموعی صورتِ حال سے واقف ہونے کے بعد اپنے اس اعتراض سے رُجوع کرلیں گے، اور انہوں نے اس معاملے میں عام معترضین سے زیادہ جو سخت اور مکروہ اُسلوبِ بیان اختیار فرمایا ہے، اس پر ندامت کا اظہار فرمائیں گے...!

## گورنروں کی زیادتیاں

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر چھٹا اعتراض مولانا مودودی صاحب نے یہ کیا ہے کہ:-

> حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور ان کی زیادتیوں پر شرعی اَحکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف انکار کردیا۔ (ص:۱۷۵)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس ''کلیہ'' کا استنباط مولانا نے چھ واقعات سے کیا ہے، پہلا واقعہ وہ یوں نقل فرماتے ہیں:-

---

(۱) تهذيب ابن عساكر ج:۵ ص:۴۱۱، مطبعة الروضة، الشام، ۱۳۳۲ھ۔

ان کا گورنر عبداللہ بن عمرو بن غیلان ایک مرتبہ بصرے میں منبر پر خطبہ دے رہا تھا، ایک شخص نے دوران خطبہ میں اس کو کنکر مار دیا، اس پر عبداللہ نے اس شخص کو گرفتار کرایا اور اس کا ہاتھ کٹوا دیا۔ حالانکہ شرعی قانون کی رُو سے یہ ایسا جرم نہ تھا جس پر کسی کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، حضرت معاویہؓ کے پاس استغاثہ کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں ہاتھ کی دیت تو بیت المال سے ادا کردوں گا مگر میرے عُمّال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں۔ (ص:۱۷۵، ۱۷۶)

مولانا نے یہاں بھی واقعے کے انتہائی اہم جزو کو حذف کر کے قصہ اس طرح بیان کیا ہے کہ جس سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نہایت غلط اور خلافِ واقعہ تأثر قائم ہوتا ہے۔ مولانا نے اس واقعے کے لئے ابن کثیرؒ (ج:۸ ص:۷۱) اور ابنِ اثیرؒ کا حوالہ دیا ہے، یہاں ہم ابنِ کثیرؒ کی پوری عبارت نقل کردیتے ہیں۔ مولانا کی عبارت کا اس سے مقابلہ کرلیا جائے:-

اسی[1] سال میں حضرت معاویہؓ نے عبداللہ بن غیلان کو بصرہ سے معزول کر کے اس کی جگہ عبیداللہ بن زیاد کو مقرر کیا، اور حضرت معاویہؓ نے ابنِ غیلان کو جو معزول فرمایا، اس کا سبب یہ تھا کہ ایک مرتبہ وہ خطبہ دے رہا تھا کہ بنو ضبّہ کے کسی شخص نے اس کو کنکر مار دیا، اس نے اس شخص کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا، اس کے بعد اس شخص کی قوم کے لوگ ابنِ غیلان کے پاس آئے اور

(۱) ثم دخلت سنة خمس وخمسين فيها عزل معاوية عبدالله بن غيلان عن البصرة وولى عليها عبيدالله بن زياد وكان سبب عزل معاوية ابن غيلان عن البصرة أنه كان يخطب الناس فحصبه رجل من بنى ضبة فأمر بقطع يده فجاء قومه إليه فقالوا له: إنه متى بلغ أمير المؤمنين أنک قطعت يده فى هٰذا الصنع فعل به وبقومه نظير ما فعل بحجر بن عدى فاكتب لنا كتابا أنک قطعت يده فى شبهة فكتب لهم فتركوه عندهم حينا ثم جائوا معاوية فقالوا له: إن نائبک قطع يد صاحبنا فى شبهة فاقدنا منه، قال: لا سبيل إلى القود من عمالى ولٰكن الدية فأعطاهم الدية وعزل ابن غيلان. (البدايہ ج:۸ ص:۷۱)۔

اس سے کہا کہ اگر امیر المؤمنین کو یہ معلوم ہوگیا کہ تم نے اس کا ہاتھ اس وجہ سے کاٹا تھا تو وہ اس کے اور اس کی قوم کے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو حجر بن عدی کے ساتھ کیا تھا، اس لئے تم ہمیں ایک تحریر لکھ دو جس میں یہ تحریر ہو کہ تم نے ہمارے آدمی کا ہاتھ شبہ کی بنا پر کاٹا تھا، ابنِ غیلان نے ان کو یہ تحریر لکھ دی، ان لوگوں نے کچھ عرصے تک یہ تحریر اپنے پاس رکھی، پھر حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچے اور شکایت کی کہ آپ کے گورنر نے ہمارے آدمی کا ہاتھ شبہ کی وجہ سے کاٹ دیا ہے، لہٰذا اس سے ہمیں قصاص دِلوایئے۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ میرے گورنروں سے قصاص کی تو کوئی سبیل نہیں لیکن دیت لے لو، چنانچہ انہیں حضرت معاویہؓ نے دیت دِلوائی اور ابنِ غیلان کو معزل کر دیا۔

الفاظ کے معمولی اختلاف کے ساتھ بالکل یہی واقعہ علامہ ابنِ اثیر جزریؒ نے بھی نقل کیا ہے، ہماری سمجھ سے بالکل باہر ہے کہ جو شخص قصاص اور دیت کے شرعی قوانین سے واقف ہو، وہ اس واقعے کو پڑھ کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے پر کوئی ادنیٰ اعتراض کس طرح کرسکتا ہے؟

اس واقعے میں صاف تصریح ہے کہ حضرت معاویہؓ کے سامنے بنو ضبّہ کے لوگوں نے ابنِ غیلان کے تحریری اقرار کے ساتھ مقدمے کی جو صورت پیش کی، وہ یہ تھی کہ ابنِ غیلان نے ایک شخص کا ہاتھ شبہ میں کاٹ دیا ہے۔

''شبہ میں ہاتھ کاٹ دینا'' اسلامی فقہ کی ایک اصطلاح ہے، قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص پر سرقہ کا الزام ہو اور اس کے ثبوت میں کوئی ادنیٰ سا شبہ بھی پیش آجائے تو ہاتھ کاٹنے کی سزا موقوف ہوجاتی ہے اور شبہ کا فائدہ (Benefit Of Doubt) ملزم کو دیا جاتا ہے، اگر ایسی صورت میں کوئی حاکم غلطی سے ملزم پر سزا جاری کر کے ہاتھ کاٹ دے تو کہا جاتا ہے کہ ''اس نے شبہ میں ہاتھ کاٹ دیا ہے''۔

''شبہ میں ہاتھ کاٹ دینا'' بلاشبہ حاکم کی سنگین غلطی ہے، لیکن اس غلطی کی بناء پر کسی کے نزدیک بھی یہ حکم نہیں ہے کہ اس حاکم سے قصاص لینے کے لئے اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے، کیونکہ شبہ کا فائدہ اس کو بھی ملتا ہے۔

فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر کوئی حاکم غلطی سے کسی شخص پر شبہ میں سزا جاری کر دے تو حاکم سے قصاص نہیں لیا جاتا، اس کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اگر حاکموں کے ایسے فیصلوں کی وجہ سے ان پر حد جاری کی جایا کرے یا ان سے قصاص لیا جانے لگے تو اس اہم منصب کو کوئی قبول نہیں کرے گا، کیونکہ انسان سے ہر وقت غلطی کا احتمال ہے، اس بات کو حضرت معاویہؓ نے ان الفاظ میں تعبیر فرمایا ہے کہ:-

میرے گورنروں سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں۔

پھر چونکہ اس واقعے سے ایک طرف اس شخص کو نقصان پہنچا تھا جس کا ہاتھ کاٹا گیا، اس لئے حضرت معاویہؓ نے اسے دیت دِلوادی اور دُوسری طرف حاکم کی نااہلیت بھی ظاہر ہوگئی تھی، اس لئے اسے معزول کر دیا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر حضرت معاویہؓ محض اس بناء پر ابنِ غیلان سے قصاص نہیں لے رہے تھے کہ وہ ان کے گورنر ہیں تو انہیں معزول کیوں فرمایا؟ اور معزول کرنے کے بعد تو وہ گورنر نہیں رہے تھے، پھر ان سے قصاص کیوں نہیں لیا؟

اس پر حیرت کا اظہار کیجئے یا افسوس کا، کہ ابنِ اثیرؒ اور ابنِ کثیرؒ (جن کے حوالے سے مولانا مودودی صاحب نے یہ واقعہ نقل کیا ہے) دونوں نے ابتداء ہی معزولی کے بیان سے کی ہے، اور غیر مبہم الفاظ میں بتلایا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے سامنے ملزم کے اقرار کے ساتھ مقدمہ کس طرح پیش ہوا تھا؟ مگر مولانا نہ تو معزولی کا ذکر کرتے ہیں اور نہ پیش ہونے والے مقدمے کی صحیح نوعیت کا، اور صرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ نقل کر دیتے ہیں کہ:-

میرے عُمّال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں۔

اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:-

حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دے

دیا اور ان کی زیادتیوں پر شرعی اَحکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

اس کے بعد دوسرا واقعہ مولانا نے طبری اور ابنِ اثیرؒ کے حوالے سے یہ بیان فرمایا ہے کہ زیاد نے ایک مرتبہ بہت سے آدمیوں کے ہاتھ صرف اس جرم میں کاٹ دیئے تھے کہ انہوں نے خطبے کے دوران اس پر سنگ باری کی تھی، یہ واقعہ بلاشبہ اسی طرح طبری اور ابنِ اثیر میں موجود ہے، لیکن اگر اس روایت کو دُرست مان لیا جائے تو یہ زیاد کا ذاتی فعل تھا، حضرت معاویہؓ پر اس کا الزام اس لئے عائد نہیں ہوتا کہ کسی تاریخ میں یہ مذکور نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی اور انہوں نے اس پر زیاد کو تنبیہ نہیں کی، ہوسکتا ہے کہ انہیں اس کی اطلاع نہ ہوئی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کو اطلاع پہنچی ہو جس طرح ابنِ غیلان کے مذکورہ بالا واقعے میں پہنچی تھی اور یہ بھی مستبعد نہیں کہ حضرت معاویہؓ نے زیاد کو اس حرکت پر مناسب سرزنش کی ہو لہٰذا تعیین کے ساتھ یہ بات کیسے کہی جاسکتی ہے کہ:-

دربارِ خلافت سے اس کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔

(خلافت وملوکیت ص:۱۷۶)

تیسرا واقعہ مولانا نے حضرت بسر بن ارطاۃ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے یمن میں حضرت علیؓ کے گورنر عبیداللہ بن عباسؓ کے دو بچوں کو قتل کر دیا، ہمدان میں بعض مسلمان عورتوں کو لونڈیاں بنالیا۔

جہاں تک بچوں کو قتل کرنے کا تعلق ہے، اگر یہ روایت دُرست ہو تو یہ حضرت معاویہؓ کے عہدِ خلافت کا نہیں بلکہ مشاجرات کے زمانے کا قصہ ہے، جبکہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے لشکر باہم برسرِ پیکار تھے، اس دور کی جنگوں کے بیانات اس قدر رنگ آمیزیاں کی گئی ہیں کہ حقیقت کا پتہ چلانا بہت دُشوار ہے، ٹھیک اسی روایت میں جس سے مولانا نے استدلال کیا ہے، علامہ طبریؒ نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بسر بن ارطاۃؓ کے مقابلے کے لئے حضرت علیؓ نے حضرت جاریہ بن قدامہؓ کو دو ہزار لشکر دے کر روانہ کیا۔ حضرت جاریہؓ نے نجران پہنچ کر پوری بستی کو

آگ لگادی اور حضرت عثمانؓ کے ساتھیوں میں سے بہت سے افراد کو پکڑ کر قتل کر ڈالا، پھر جاریہؓ مدینہ طیبہ پہنچے، اس وقت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے، وہ انہیں دیکھ کر بیچ ہی میں بھاگ کھڑے ہوئے، جاریہؓ نے کہا:-

والله لو أخذت أبا سنور لضربت عنقه.[1]

ترجمہ:- خدا کی قسم! اگر بلی والا (حضرت ابو ہریرہؓ) مجھے ہاتھ آ گیا تو میں اس کی گردن مار دوں گا۔

حضرت علیؓ نے انہیں بصرہ بھیجا، وہاں انہوں نے حضرت معاویہؓ کے گورنر عبداللہ بن الحضرمی کو گھر میں محصور کر کے زندہ جلادیا۔[2] لیکن ہم ان زیادتیوں سے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کو بَری سمجھتے ہیں، اور ناقابلِ اعتماد تاریخی روایات کی بناء پر ان حضرات میں سے کسی کو موردِ الزام قرار دینا جائز نہیں سمجھتے، کیونکہ ان روایات کی صحت کا کچھ پتہ نہیں۔

انہی بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہ کے بارے میں جنہیں مذکورہ روایات کی بناء پر مولانا مودودی نے ''ظالم شخص'' کا خطاب دے دیا ہے، خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گواہی تو حافظ ابنِ کثیرؒ نے اس طرح نقل کی ہے کہ:-

عن زهير بن الأرقم قال: خطبنا عليٌّ يوم جمعة فقال: نبئت أن بسرًا قد طلع اليمن، وأنى والله لأحسب أن هٰؤلاء القوم سيظهرون عليكم وما يظهرون عليكم إلا بعصيانكم إمامكم وطاعتهم إمامهم وخيانتكم وأمانتهم وإفسادكم في أرضكم وإصلاحهم.[3]

ترجمہ:- زہیر بن ارقمؒ کہتے ہیں کہ: ایک جمعہ کو حضرت علیؓ نے ہمیں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ: مجھے خبر ملی ہے کہ بسر (بن

---

(۱) الطبری ج:۴ ص:۱۰۷، مطبعة الاستقامة، القاهرة ۱۳۵۸ھ۔

(۲) الاستيعاب تحت الاصابة ج:۱ ص:۲۴۷، ذکر "جارية بن قدامة"۔

(۳) البداية والنهاية ج:۷ ص:۳۲۵، مطبعة السعادة۔

ارطاۃ) یمن پہنچ گئے ہیں، اور خدا کی قسم! میرا گمان یہ ہے کہ یہ لوگ تم پر غالب آ جائیں گے اور صرف اس بناء پر غالب آئیں گے کہ تم اپنے امام کی نافرمانی کرتے ہو اور یہ لوگ اپنے امام کی اطاعت کرتے ہیں، تم لوگ خیانت کرتے ہو اور یہ لوگ امین ہیں، تم اپنی زمین میں فساد مچاتے ہو اور یہ اصلاح کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ حافظ ابن حجرؒ، حافظ ابن حبانؒ سے نقل کرتے ہیں کہ:-

ولہ أخبار شہیرۃ فی الفتن لا ینبغی التشاغل بہا.[1]

ترجمہ:- فتنے کے دور میں ان کے (بسرؓ کے) بہت قصے مشہور ہیں جن میں مشغول ہونا نہیں چاہیے۔

اس کے علاوہ ان جنگوں میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں نے اپنے ماتحتوں کو یہ تاکید فرمائی تھی کہ وہ قتل و قتال میں حد ضرورت سے آگے نہ بڑھیں، حضرت علیؓ کا یہ ارشاد تو متعدد مقامات پر منقول ہے،[2] اور حضرت معاویہؓ کے بارے میں خود انہی بسر بن ارطاۃؓ کا یہ مقولہ بہت سی تواریخ نے نقل کیا ہے کہ:-

یا أہل المدینۃ! لو لا ما عہد إلیّ معاویۃ ما ترکت بہا محتلما إلا قتلتہ.[3]

ترجمہ:- اے اہل مدینہ! اگر مجھ سے معاویہؓ نے عہد نہ لیا ہوتا تو میں اس شہر میں کسی بالغ انسان کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑتا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ نے تو انہیں ہر بالغ انسان کو قتل کرنے سے بھی منع کیا تھا، چہ جائیکہ چھوٹے بچوں کو قتل کرنے کی اجازت دیتے۔ لہٰذا حضرت علیؓ کے گورنر ہوں یا حضرت معاویہؓ کے، اگر انہوں نے فی الواقع دوران جنگ کوئی زیادتی کی بھی ہو تو اس کی کوئی ذمہ داری حضرت علیؓ یا حضرت معاویہؓ پر عائد نہیں

---

(۱) الاصابۃ ج:۱ ص:۱۵۲۔

(۲) مثال کے طور پر طبری ج:۳ ص:۵۰۱ ملاحظہ فرمایئے۔

(۳) الطبری ج:۳ ص:۱۰۶، الاستیعاب تحت الاصابۃ ج:۱ ص:۱۶۶، ابن عساکر ج:۳ ص:۲۲۲۔

ہوتی، چنانچہ تواریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ فتنے کا وقت گزر جانے کے بعد حضرت معاویہؓ نے ان زیادتیوں کی تلافی کر کے بسر بن ارطاۃؓ کو گورنری سے معزول کر دیا۔[1]

رہ گیا یہ قصہ کہ بسر بن ارطاۃؓ نے ہمدان پر حملہ کر کے وہاں کی مسلمان عورتوں کو کنیز بنالیا تھا، سو یہ بات الاستیعاب کے سوا کسی بھی تاریخ میں موجود نہیں ہے، یہاں تک کہ حافظ ابنِ عساکرؒ جنھوں نے بسر بن ارطاۃؓ کے حالات چھ صفحات میں ذکر کئے ہیں[2] اور ان میں بسر سے متعلق تمام صحیح و سقیم روایات جمع کی ہیں اور ہمدان پر ان کے حملے کا بھی ذکر کیا ہے، انھوں نے بھی کہیں یہ نہیں لکھا کہ انہوں نے مسلمان عورتوں کو کنیز بنالیا تھا، یہ روایت صرف حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے الاستیعاب میں نقل کی ہے اور اس کی سند بھی نہایت ضعیف ہے۔ بعض متکلم فیہ راویوں سے قطع نظر اس میں ایک راوی موسیٰ بن عبیدہ ہیں، جن کی محدثین نے تضعیف کی ہے، امام احمدؒ کا ان کے بارے میں ارشاد ہے کہ:-

لا تحل الرواية عنه عن موسى بن عبيدة.[3]

ترجمہ:- میرے نزدیک موسیٰ بن عبیدہ سے روایت کرنا حلال نہیں۔

آپ اندازہ فرمایئے کہ اگر یہ واقعہ صحیح ہوتا کہ "مسلمان عورتوں کو بازار میں کھڑا کر کے بیچا گیا"[4] تو کیا اس واقعے کو کسی ایک ہی شخص نے دیکھا تھا؟ یہ تو تاریخ کا ایسا منفرد سانحہ ہوتا کہ اس کی شہرت حدِ تواتر تک پہنچ جانی چاہئے تھی، اور حضرت معاویہؓ سے بغض رکھنے والا گروہ جو پَر کا کوّا بنانے بلکہ بسا اوقات بے پَر کی اُڑانے پر تلا ہوا تھا وہ تو اس واقعے کو نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیتا؟ اس کے باوجود اس واقعے کی صرف ایک ہی روایت کیوں ہے؟ اور وہ بھی ضعیف اور مجروح جسے کسی مؤرخ نے بھی اپنی تاریخ میں درج کرنا مناسب نہیں سمجھا، لہٰذا محض اس ضعیف اور

---

(۱) دیکھئے: ابن خلدون ج:۳ ص:۸، ۹، "بعث معاوية العمال إلى الأمصار"۔

(۲) ابن عساکر ج:۳ ص:۲۲۰ تا ۲۲۵، "بسر بن أبي أرطاة"۔

(۳) ابو حاتم الرازیؒ: الجرح والتعدیل ج:۴ ص:۱۵۲، قسم اول۔

(۴) الاستیعاب ج:۱ ص:۱۶۶۔

منفرد روایت کی بناء پر صحابہ کرامؓ کی تاریخ پر اتنا بڑا داغ نہیں لگایا جاسکتا۔

چوتھا واقعہ مولانا نے اس طرح بیان فرمایا ہے:-

> سر کاٹ کر ایک جگہ سے دُوسری جگہ بھیجنے اور انتقام کے جوش میں لاشوں کی بے حرمتی کرنے کا وحشیانہ طریقہ بھی، جو جاہلیت میں رائج تھا اور جسے اسلام نے مٹادیا تھا، اسی دور میں مسلمانوں کے اندر شروع ہوا۔
>
> سب سے پہلا سر جو زمانۂ اسلام میں کاٹ کر لے جایا گیا وہ حضرت عمار بن یاسرؓ کا تھا، اِمام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں صحیح سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے اور ابنِ سعدؒ نے بھی طبقات میں اسے نقل کیا ہے کہ جنگِ صفّین میں حضرت عمارؓ کا سر کاٹ کر حضرت معاویہؓ کے پاس لایا گیا، اور دو آدمی اس پر جھگڑ رہے تھے کہ عمارؓ کو میں نے قتل کیا۔

یہ روایت تو مولانا نے صحیح نقل کی ہے، لیکن اگر یہ واقعہ دُرست ہو تو اس واقعے سے حضرت معاویہؓ پر الزام عائد کرنا کسی طرح دُرست نہیں ہے، اس لئے کہ اس روایت میں صرف اتنا بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کا سر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس لے جایا گیا، یہ نہیں بتلایا کہ حضرت معاویہؓ نے اس فعل پر کیا اثر لیا؟ بالکل اسی قسم کا ایک واقعہ اِمام ابنِ سعدؒ ہی نے طبقات میں یہ نقل فرمایا ہے کہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت علیؓ کے ایک شخص عمیر بن جرموز نے قتل کیا اور ان کا سر تن سے جدا کر کے حضرت علیؓ کے پاس لے گیا۔ (۱)

ہماری گزارش یہ ہے کہ ان دونوں قصوں میں کوئی الزام حضرت علیؓ یا حضرت معاویہؓ پر اس لئے عائد نہیں ہوتا کہ دونوں میں سے کسی نے نہ اس بات کا حکم دیا تھا کہ فلاں کا سر کاٹ کر ہمارے پاس لایا جائے، نہ انہوں نے اس فعل کی توثیق کی تھی، بلکہ یقیناً انہوں نے اس فعل کو بُرا قرار دے کر ایسا کرنے والے کو تنبیہ کی ہوگی۔

---

(۱) طبقات ابن سعد ج:۳ ص:۱۱۲ جزو:۸ "زبیر بن عوام"۔

حضرت علیؓ کے بارے میں تو اسی روایت میں یہ بھی موجود ہے کہ انہوں نے حضرت زبیرؓ کی شہادت پر افسوس کا اظہار فرمایا، حضرت معاویہؓ کے قصے میں راوی نے ایسی کوئی بات ذکر نہیں کی، اگر راوی نے کسی وجہ سے تنبیہ کا ذکر نہیں کیا تو یہ ''عدمِ ذکر'' ہی تو ہے، ''ذکرِ عدم'' تو نہیں کہ اس سے ان حضرات پر کوئی الزام لگایا جاسکے اور اس سے یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ ان حضرات نے اپنے ماتحتوں کو شرعی حدود پامال کرنے کی چھٹی دے رکھی تھی۔

آگے مولانا لکھتے ہیں:-

> دُوسرا سر عمرو بن الحمق کا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں میں سے تھے، مگر حضرت عثمانؓ کے قتل میں انہوں نے بھی حصہ لیا تھا، زیاد کی ولایتِ عراق کے زمانے میں ان کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی، وہ بھاگ کر ایک غار میں چھپ گئے، وہاں ایک سانپ نے ان کو کاٹ لیا اور وہ مرگئے، تعاقب کرنے والے ان کی مردہ لاش کا سر کاٹ کر زیاد کے پاس لے گئے، اس نے حضرت معاویہؓ کے پاس دمشق بھیج دیا، وہاں اسے برسرِ عام گشت کرایا گیا اور پھر لے جا کر ان کی بیوی کی گود میں ڈال دیا گیا۔

اس واقعے کے لئے مولانا نے چار کتابوں کے حوالے دیئے ہیں (طبقات ابنِ سعد، استیعاب، البدایہ والنہایہ اور تہذیب التہذیب) لیکن اس واقعے کا قابلِ اعتراض حصہ (یعنی یہ کہ حضرت معاویہؓ نے عمرو بن الحمق کے سر کو گشت کرایا) نہ طبقات میں ہے، نہ استیعاب میں، نہ تہذیب میں، یہ صرف البدایہ میں نقل کیا گیا ہے اور وہ بھی بلاسند و حوالہ۔ البدایہ والنہایہ کا مأخذ عموماً طبریؒ کی تاریخ ہوا کرتی ہے، اور طبریؒ نے عمرو بن الحمق کے قتل کا جو واقعہ ذکر کیا ہے اس میں اس داستان کا کوئی ذکر نہیں بلکہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فتنے کے عروج کے دور میں بھی حضرت معاویہؓ نے عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور انتقام کے جذبات سے مغلوب نہیں ہوئے۔

اِمام ابنِ جریر طبریؒ ابومخنف کی سند سے روایت کرتے ہیں کہ عمرو بن الحمق کو موصل کے عامل نے گرفتار کرلیا تھا، اس کے بعد انہوں نے حضرت معاویہؓ سے خط لکھ کر معلوم کیا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ حضرت معاویہؓ نے جواب میں لکھا کہ:۔

انہوں نے حضرت عثمان بن عفانؓ پر نیزے کے نو وار کئے تھے، ہم ان پر زیادتی کرنا نہیں چاہتے، لہٰذا تم بھی ان پر نیزے کے نو وار کرو، جس طرح انہوں نے حضرت عثمانؓ پر کئے تھے۔ (۱)

اس روایت میں نہ سر کاٹنے کا ذکر ہے، نہ اسے حضرت معاویہؓ کے پاس لے جانے کا بیان ہے، نہ اسے گشت کرانے کا قصہ ہے، اس کے بجائے حضرت معاویہؓ کا ایک ایسا حکم بیان کیا گیا ہے جو عدل وانصاف کے عین مطابق ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس روایت کا راوی بھی ابومخنف ہے اور وہ شیعہ ہونے کے باوجود حضرت معاویہؓ کی کسی ایسی بات کا ذکر نہیں کرتا جس سے ان پر الزام عائد ہوسکے۔

اس کے مقابلے میں البدایہ والنہایہ کی روایت نہ سند کے ساتھ ہے، نہ اس کا کوئی حوالہ مذکور ہے، نہ وہ حضرت معاویہؓ کے بُردبارانہ مزاج سے کوئی مناسبت رکھتی ہے، ایسی صورت میں آخر کس بناء پر طبری کی صاف اور سیدھی روایت کو چھوڑ کر اسے اختیار کیا جائے؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مولانا مودودی صاحب نے ایک بڑا زرّیں اُصول یہ لکھا ہے کہ:۔

جب دونوں طرح کی روایات موجود ہیں اور سند کے ساتھ بیان ہوئی ہیں تو آخر ہم ان روایات کو کیوں نہ ترجیح دیں جو ان کے مجموعی طرزِ عمل سے مناسبت رکھتی ہیں اور خواہ مخواہ وہی روایت کیوں قبول کریں جو اس کی ضد نظر آتی ہیں؟

(خلافت وملوکیت ص:۳۴۸)

---

(۱) أنه طعن عثمان بن عفان تسع طعنات بمشاقص كانت معه وأنا لا نريد أن نعتدى عليه فأطعنه تسع طعنات كما طعن عثمان. (الطبرى ج:۴ ص:۱۹۷)

سوال یہ ہے کہ کیا اس اُصول کا اطلاق حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر نہیں ہوتا؟ ان حالات میں مولانا مودودی صاحب کا یہ استنباط بڑا ہی سرسری اور جذباتی استنباط ہے کہ:-

> یہ ساری کارروائیاں گویا اس بات کا عملاً اعلان تھیں کہ اب گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھوٹ ہے، اور سیاسی معاملات میں شریعت کی کسی حد کے وہ پابند نہیں ہیں۔ (ص:۱۷۷)

جن واقعات سے مولانا نے اس بات کا استنباط فرمایا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دے دیا تھا، ان کی حقیقت تو آپ اُوپر دیکھ چکے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ اپنے گورنروں کے جن خلافِ شرع اُمور سے واقف ہوجاتے تھے ان پر انہیں مناسب تنبیہ فرمایا کرتے تھے، اس کے بھی بہت سے واقعات تاریخ میں ملتے ہیں، یہاں ایک واقعے پر اکتفا کیا جاتا ہے:-

> حافظ ابنِ عساکر نقل فرماتے ہیں کہ سعد بن سرح حضرت علیؓ کے حامیوں میں سے ایک صاحب تھے، جب حضرت معاویہؓ نے زیاد کو کوفہ میں گورنر بنایا تو اس نے سعد بن سرح کی دھمکیاں دیں، اس لئے یہ حضرت حسن بن علیؓ کے پاس جاکر پناہ گزیں ہوگئے، زیاد نے ان کے پیچھے ان کے بھائی اور ان کے بیوی بچوں کو پکڑ کر قید کرلیا اور ان کے مال و دولت پر قبضہ کر کے ان کا گھر منہدم کرادیا۔ جب حضرت حسنؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے زیاد کے نام ایک خط لکھا کہ: "تم نے ایک مسلمان کا گھر منہدم کرکے، اس کے مال و دولت اور بیوی بچوں کو گرفتار کرلیا ہے، جب میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے تو تم فوراً ان کا گھر دوبارہ تعمیر کراؤ اور اس کے بیوی بچے اور مال و اسباب انہیں واپس کردو، میں نے انہیں پناہ دی ہوئی ہے، لہٰذا تم ان کے بارے میں میری سفارش قبول کرو۔"

اس خط کے جواب میں زیاد نے حضرت حسنؓ کے نام ایک خط لکھا جس میں حضرت حسنؓ کی شان میں گستاخی کی گئی تھی، حضرت حسنؓ زیاد کا خط پڑھ کر مسکرائے اور حضرت معاویہؓ کے نام ایک خط لکھا جس میں انہیں پورے واقعے سے مطلع کیا اور زیاد کا خط بھی ساتھ بھیج دیا۔ حافظ ابنِ عساکر لکھتے ہیں کہ:-

فلمّا وصل كتاب الحسن إلٰى معاوية وقرأ معاوية الكتاب ضاقت به الشام.

جب حضرت حسنؓ کا خط حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچا اور انہوں نے خط پڑھا تو (رنج و ملال کی وجہ سے) شام کی زمین انہیں تنگ معلوم ہونے لگی۔

اس کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے زیاد کے نام سخت تہدید آمیز خط لکھا جس میں متعدّد ملامتوں کے علاوہ یہ الفاظ بھی تھے کہ:-

تم نے حسنؓ کے نام خط میں ان کے والد کو بُرا بھلا کہا ہے اور کنایۃً ان پر فسق کا الزام لگایا ہے، میری زندگی کی قسم! تم فسق کے خطاب کے ان سے زیادہ مستحق ہو، جس باپ کی طرف تم پہلے منسوب تھے وہ حسنؓ کے والد سے زیادہ اس خطاب کے مستحق تھے، جونہی میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے تم فوراً سعد بن سرح کے عیال کو چھوڑ دو، ان کا گھر تعمیر کراؤ، اس کے بعد ان سے کوئی تعرض نہ کرو اور ان کا مال لوٹا دو۔ میں نے حسنؓ کو لکھ دیا ہے کہ وہ اپنے آدمی کو اختیار دے دیں کہ وہ چاہیں تو انہیں کے پاس رہیں اور چاہیں تو اپنے شہر میں لوٹ آئیں اور تمہارے ہاتھ یا زبان کو ان پر کوئی بالادستی حاصل نہیں ہوگی۔[1]

---

(۱) ابن عساکر ج:۵ ص:۴۱۸، ۴۱۹، مطبعة الروضة، شام ۱۳۳۲ھ۔

# حضرت حجر بن عدیؓ کا قتل

یہ تو وہ اعتراضات تھے جو مولانا مودودی نے ''قانون کی بالاتری کا خاتمہ'' کے عنوان کے تحت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر عائد کئے تھے، اس کے علاوہ ایک اعتراض مولانا نے ''آزادیٔ اظہارِ رائے کا خاتمہ'' کے عنوان کے تحت اس طرح کیا ہے:-

دورِ ملوکیت میں ضمیروں پر قفل چڑھا دیئے گئے اور زبانیں بند کردی گئیں، اب قاعدہ یہ ہوگیا کہ منہ کھولو تو تعریف کے لئے کھولو، ورنہ چپ رہو، اور اگر تمہارا ضمیر ایسا ہی زوردار ہے کہ تم حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تو قید اور قتل اور کوڑوں کی مار کے لئے تیار ہو جاؤ، چنانچہ جو لوگ بھی اس دور میں حق بولنے اور غلط کاریوں پر ٹوکنے سے باز نہ آئے ان کو بدترین سزائیں دی گئیں تاکہ پوری قوم دہشت زدہ ہو جائے۔

اس نئی پالیسی کی ابتداء حضرت معاویہؓ کے زمانے میں حضرت حجر بن عدی کے قتل (۵۱ھ) سے ہوئی، جو ایک زاہد و عابد صحابی اور صلحائے اُمت میں ایک اُونچے مرتبے کے شخص تھے۔ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں جب منبروں پر خطبوں میں علانیہ حضرت علیؓ پر لعنت اور سبّ وشتم کا سلسلہ شروع ہوا تو عام مسلمانوں کے دِل ہر جگہ ہی اس سے زخمی ہو رہے تھے، کوفہ میں حجر بن عدیؓ سے صبر نہ ہو سکا اور انہوں نے جواب میں حضرت علیؓ کی تعریف اور حضرت معاویہؓ کی مذمت شروع کردی، حضرت مغیرہ جب تک کوفہ کے گورنر رہے وہ ان کے ساتھ رعایت برتتے رہے، ان کے بعد جب زیاد کی گورنری میں بصرہ کے ساتھ کوفہ بھی شامل ہوگیا تو اس کے اور ان کے درمیان کشمکش برپا ہوگئی، وہ خطبے میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا اور یہ اُٹھ کر اس کا جواب دینے لگتے

تھے، اسی دوران میں ایک مرتبہ انہوں نے نمازِ جمعہ میں تاخیر پر بھی اس کو ٹوکا، آخرکار اس نے انہیں اور ان کے بارہ ساتھیوں کو گرفتار کرلیا اور ان کے خلاف بہت سے لوگوں کی شہادتیں اس فردِ جرم پر لیں کہ ''انہوں نے ایک جتھا بنالیا ہے، خلیفہ کو علانیہ گالیاں دیتے ہیں، امیرالمؤمنین کے خلاف لڑنے کی دعوت دیتے ہیں، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ خلافت آلِ ابی طالب کے سوا کسی کے لئے دُرست نہیں ہے، انہوں نے شہر میں فساد برپا کیا اور امیرالمؤمنین کے عامل کو نکال باہر کیا، یہ ابوتراب (حضرت علیؓ) کی حمایت کرتے ہیں، ان پر رحمت بھیجتے ہیں اور ان کے مخالفین سے اظہارِ براءت کرتے ہیں۔'' ان گواہیوں میں سے ایک گواہی قاضی شریح کی بھی ثبت کی گئی، مگر انہوں نے ایک الگ خط میں حضرت معاویہؓ کو لکھ بھیجا کہ: ''میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس حجر بن عدی کے خلاف جو شہادتیں بھیجی گئی ہیں ان میں سے ایک میری شہادت بھی ہے، میری اصل شہادت حجر کے متعلق یہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، دائماً حج اور عمرہ کرتے رہتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے اور بدی سے روکتے ہیں، ان کا خون اور مال حرام ہے، آپ چاہیں تو انہیں قتل کریں، ورنہ معاف کردیں۔''

اس طرح یہ ملزم حضرت معاویہؓ کے پاس بھیجے گئے اور انہوں نے ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ قتل سے پہلے جلادوں نے ان کے سامنے جو بات پیش کی وہ یہ تھی کہ: ''ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم علیؓ سے براءت کا اظہار کرو اور ان پر لعنت بھیجو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے گا'' ان لوگوں نے یہ بات ماننے سے انکار کردیا اور حجر نے کہا: ''میں زبان سے وہ بات نہیں نکال سکتا جو ربّ کو ناراض

کرے" آخر وہ اور ان کے ساتھی (سات) قتل کر دیئے گئے،
ان میں سے ایک صاحب عبدالرحمٰن بن حسان کو حضرت معاویہؓ
نے زیاد کے پاس واپس بھیج دیا، اور اس کو لکھا کہ انہیں بدترین
طریقے سے قتل کر، چنانچہ اس نے انہیں زندہ دفن کرادیا۔
اس واقعے نے اُمت کے تمام صلحاء کا دِل ہلادیا، حضرت عبداللہ
بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ کو یہ خبر سن کر سخت رنج ہوا، حضرت
عائشہؓ نے حضرت معاویہؓ کو اس فعل سے باز رکھنے کے لئے پہلے
ہی خط لکھا تھا، بعد میں جب ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ ان سے
ملنے آئے تو انہوں نے فرمایا: "اے معاویہ! تجھے حجر کو قتل کرتے
ہوئے خدا کا ذرا خوف نہ ہوا" حضرت معاویہؓ کے گورنر خراسان
ربیع بن زیاد الحارثی نے جب یہ خبر سنی تو کہا: "خدایا! اگر تیرے
علم میں میرے اندر کچھ خیر باقی ہے تو مجھے دُنیا سے اُٹھالے۔"

(خلافت وملوکیت ص:۱۶۳ تا ۱۶۵)

اس واقعے میں بھی مولانا مودودی صاحب نے اوّل تو بعض باتیں ایسی کہی ہیں جن کا ثبوت کسی بھی تاریخ میں یہاں تک کہ ان کے دیئے ہوئے حوالوں میں بھی نہیں ہے۔ دُوسرے یہاں بھی مولانا نے واقعے کے ضروری اجزاء کو سرے سے حذف کر کے بڑا ہی خلافِ واقعہ تأثر قائم کیا ہے۔ مولانا مودودی صاحب کی پوری عبارت ہم نے من وعن نقل کردی ہے، اب اصل واقعہ سنئے!

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ حضرت حجر بن عدیؓ کون تھے؟ مولانا نے انہیں علی الاطلاق "زاہد و عابد صحابی" کہہ دیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کا صحابی ہونا مختلف فیہ ہے، اگرچہ بعض حضرات مثلاً ابنِ سعدؒ اور مصعب زبیریؒ کا کہنا تو یہی ہے کہ یہ صحابی تھے، لیکن اِمام بخاری، ابنِ ابی حاتم، ابو حاتم، خلیفہ بن خیاط اور ابنِ حبان رحمہم اللہ نے انہیں تابعین میں شمار کیا ہے۔[1] علامہ ابنِ سعدؒ نے بھی ان

---

(۱) الاصابۃ ج:۱ ص:۳۱۳، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، القاہرۃ ۱۳۵۸ھ۔

کو ایک مقام پر صحابہ میں اور ایک مقام پر تابعین میں شمار کیا ہے۔(۱) اور ابو احمد عسکریؒ فرماتے ہیں کہ:-

أكثر المحدثين لا يصحون له صحبة.(۲)

ترجمہ:- اکثر محدثین ان کا صحابی ہونا صحیح نہیں قرار دیتے۔

یہ خود شیعانِ علیؓ میں سے تھے،(۳) اور بلا شبہ تمام تاریخی روایات ان کی بزرگی اور عبادت و زہد پر متفق ہیں، لیکن ان کے ساتھ کچھ غالی اور فتنہ پرداز قسم کے روافض لگ گئے تھے جو ان کی بزرگی سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اُمتِ مسلمہ میں انتشار برپا کرنا چاہتے تھے۔

حافظ ابنِ کثیرؒ لکھتے ہیں:-

وقد التفت على حجر جماعات من شيعة على يتولون أمره ويشدون على يده ويسبون معاويه ويتبرؤن منه.(۴)

ترجمہ:- حضرت حجرؒ کو شیعانِ علیؓ کی کچھ جماعتیں لپٹ گئی تھیں جو ان کے تمام اُمور کی دیکھ بھال کرتی تھیں اور حضرت معاویہؓ کو بُرا بھلا کہتی تھیں۔

تقریباً یہی بات علامہ ابنِ خلدونؒ نے بھی لکھی ہے۔(۵)

غالباً ان ہی لوگوں کے کان بھرنے کی وجہ سے ان کی طبیعت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس قدر مکدّر تھی کہ جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہؓ سے صلح فرمائی تو یہ حضرت معاویہؓ کی امارت پر کسی طرح راضی نہیں تھے، تیسری صدی کے مشہور مؤرّخ ابو حنیفۃ الدینوریؒ اس صلح کا واقعہ لکھنے کے بعد لکھتے ہیں:-

---

(۱) طبقات ابن سعد ج:۶ ص:۲۱۷ جزو:۲۲۔

(۲) البداية والنهاية ج:۸ ص:۵۰، مطبعة السعادة۔

(۳) الأخبار الطوال للدينوریؒ ص:۲۲۳، القاهرة ۱۹۶۰ء۔

(۴) البداية والنهاية ج:۸ ص:۵۰۔

(۵) ابن خلدون ج:۳ ص:۲۳، الكتاب اللبناني بيروت ۱۹۵۷ء۔

قالوا: وكان أول من لقي الحسن بن علي رضي الله عنه فندمه على ما صنع ودعاه إلى رد الحرب حجر ابن عدى، فقال له: يا ابن رسول الله! لوددت انى مت قبل ما رأيت، أخرجتنا من العدل إلى الجور فتركنا الحق الذى كنا عليه ودخلنا فى الباطل الذى نهرب منه، وأعطينا الدنية من أنفسنا وقبلنا الخسيسة التى لم تلق بنا.

ترجمہ:- مؤرّخین کا کہنا ہے کہ (صلح کے بعد) حضرت حسن بن علیؓ کی ملاقات سب سے پہلے حجر بن عدیؓ سے ہوئی، انہوں نے حضرت حسنؓ کو ان کے اس فعل پر شرم دِلائی اور دعوت دی کہ حضرت معاویہؓ سے لڑائی دوبارہ شروع کردیں، اور کہا کہ: اے رسول اللہ کے بیٹے! کاش کہ میں یہ واقعہ دیکھنے سے پہلے مرجاتا، تم نے ہمیں انصاف سے نکال کر ظلم میں مبتلا کردیا، ہم جس حق پر قائم تھے، ہم نے وہ چھوڑ دیا اور جس طرح باطل سے بھاگ رہے تھے اس میں جا گھسے، ہم نے خود ذِلت اختیار کرلی اور اس پستی کو قبول کرلیا جو ہمارے لائق نہیں تھی۔

اس کے بعد الدینوریؒ لکھتے ہیں کہ حضرت حسنؓ کو حجر بن عدیؓ کی یہ بات ناگوار گزری اور انہوں نے جواب میں اس صلح کے فوائد سے آگاہ فرمایا، لیکن حجر بن عدیؓ راضی نہ ہوئے اور حضرت حسینؓ کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ:-

أبا عبدالله! شريتم الذل بالعز وقبلتم القليل وتركتم الكثير، أطعنا اليوم وأعصنا الدهر، دع الحسن وما رأى من هذا الصلح وأجمع إليك شيعتك من أهل الكوفة وغيرها وولنى وصاحبى هذه المقدمة، فلا يشعر ابن هند إلا ونحن نقارعه بالسيوف.

ترجمہ:- اے ابوعبداللہ! تم نے عزّت کے بدلے ذِلت خرید لی،

زیادہ کو چھوڑ کر کم کو قبول کرلیا، بس آج ہماری بات مان لو پھر عمر بھر نہ ماننا، حسنؓ کو ان کی صلح پر چھوڑ دو اور کوفہ وغیرہ کے باشندوں میں سے اپنے شیعہ (حامیوں) کو جمع کرلو اور یہ مقدمہ میرے اور میرے دوست کے سپرد کردو، ہند کے بیٹے (حضرت معاویہؓ) کو ہمارا پتہ صرف اس وقت چلے گا جب ہم تلواروں سے اس کے خلاف جنگ کر رہے ہوں گے۔

لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں یہی جواب دیا کہ: "إنا قد بايعنا وعاهدنا، ولا سبيل إلى نقض بيعتنا" ہم بیعت کر چکے، عہد ہو چکا، اب اسے توڑنے کی کوئی سبیل نہیں۔[1]

اس کے بعد یہ کوفہ میں مقیم ہو گئے تھے، کوفہ اس وقت فتنہ پرداز قسم کے غالی سبائیوں کا مرکز بنا ہوا تھا، جو یوں تو حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کی محبت و مودّت کا دعویٰ کرتے تھے، لیکن ان کا اصل مقصد حضرت معاویہؓ کی حکومت کو ناکام بنانا تھا۔ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اور اسے کسی قیمت پر توڑنے کے لئے تیار نہ تھے، دوسری طرف حضرت معاویہؓ کا معاملہ بھی یہ تھا کہ بقول علامہ ابوحنیفہ الدینوریؒ:۔

لم یر حسن ولا الحسين طول حياة معاوية منه سوءًا في أنفسهما ولا مكروها، ولا قطع عنهما شيئًا مما كان شرط لهما ولا تغير لهما عن بر.[2]

ترجمہ:۔ حضرت معاویہؓ کی پوری زندگی میں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو ان کی طرف سے کوئی تکلیف اٹھانی نہیں پڑی، نہ انہوں نے ان کی طرف سے اپنے بارے میں کوئی بُری بات دیکھی، حضرت معاویہؓ نے ان سے جو عہد کئے تھے ان میں سے

---

(۱) ابوحنیفة الدینوری: الأخبار الطوال ص:۲۲۰، ادارة العامة للثقافة، القاهرة.

(۲) الدینوری ص:۲۲۵۔

کسی کی خلاف ورزی نہیں کی، اور کبھی ان کے ساتھ حسنِ سلوک کے طرز کو نہ بدلا۔

گویا اصل فریقین میں مکمل صلح ہو چکی تھی اور اب کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی، لیکن ان لوگوں کے دل میں بغضِ معاویہ کی آگ برابر سلگ رہی تھی اور یہ ہر ایسے موقع کی تاک میں رہتے تھے جس میں حضرت معاویہؓ اور ان کی حکومت کے خلاف کوئی شورش کھڑی کی جاسکے اور چونکہ حضرات حسنینؓ اس فتنہ پردازی میں ان کے ساتھ نہیں تھے، اس لئے یہ دل میں ان سے بھی خوش نہ تھے، یہاں تک ان میں سے ایک صاحب نے ایک موقع پر حضرت حسنؓ کو ان الفاظ میں خطاب کیا کہ:-

يا مذل المؤمنين!

ترجمہ:- اے مؤمنوں کو ذلیل کرنے والے!

چنانچہ جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو انہوں نے کوفہ سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ:-

فإن من قبلنا من شيعتك متطلعة أنفسهم إليك، لا يعدلون بك أحدا وقد كانوا عرفوا رأى الحسن أخيك في دفع الحرب، وعرفوك باللين لأوليائك والغلظة على أعدائك، والشدة في أمر الله فإن كنت تحب أن تطلب هذا الأمر فاقدم إلينا، فقد وطنا أنفسنا على الموت معك.[1]

ترجمہ:- ہمارے یہاں جتنے آپ کے شیعہ (حامی) ہیں، ان سب کی نگاہیں آپ پر لگی ہوئی ہیں، وہ آپ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے، آپ کے بھائی حسنؓ نے جنگ کو دفع کرنے کی جو پالیسی اختیار کی تھی یہ لوگ اس سے واقف ہیں، اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ اپنے دوستوں کے لئے نرم اور دشمنوں کے لئے سخت

(۱) ... البلاذری ص:۲۲۱۔

ہیں، اور اللہ کے کام میں اٹل ہیں، لہٰذا اگر آپ اس معاملے (خلافت) کو طلب کرنا پسند کرتے ہوں تو ہمارے پاس آجایئے، اس لئے کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ مرنے کے لئے اپنی جانوں کو تیار کرچکے ہیں۔

لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ بدستور اپنے عہد پر قائم رہے، ان کو اس انتشار انگیزی سے روکا اور جواب میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہاں تک لکھا کہ:-

فلن يحدث الله به حدثا وأنا حي.[1]

ترجمہ:- جب تک میں زندہ ہوں، اللہ ہرگز ان پر کوئی نئی آفت نہیں بھیجے گا۔

اس قماش کے لوگ تھے جو کوفہ میں بقول حافظ ابنِ کثیرؒ، حضرت حجر بن عدیؓ کو چمٹے ہوئے تھے۔ حالات کے اس پسِ منظر کو ذہن میں رکھ کر اب زیرِ بحث واقعے کی طرف آیئے۔ مولانا نے اس واقعے کے لئے جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے (طبری، استیعاب، ابنِ اثیر، البدایہ والنہایہ، ابنِ خلدون) ہم یہاں ٹھیک انہی کتابوں سے نقل کرکے اس سے اصل واقعہ ذکر کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ واقعے کے جو ضروری اجزاء مولانا نے حذف کردیئے ہیں، انہیں ہم بیان کردیں گے، نیز جو باتیں مولانا نے ان کتابوں کی طرف غلط منسوب فرمائی ہیں، ان پر تنبیہ کردیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھیوں کا معمول ہی یہ بن گیا تھا کہ بقول ابنِ جریرؒ و ابنِ کثیرؒ:-

إنهم كانوا ينالون من عثمان ويطلقون فيه مقالة الجور وينتقدون على الأمراء ويسارعون فى الإنكار عليهم ويبالغون فى ذلك ويتولون شيعة على ويتشددون فى الدين.[2]

---

(۱) الدینوری ص:۲۲۲۔ (۲) البداية والنهاية ج:۸ ص:۵۴۔

ترجمہ:- یہ لوگ حضرت عثمانؓ کی بدگوئی کرتے تھے اور ان کے بارے میں ظالمانہ باتیں کرتے تھے، اور اُمراء پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے اور ان کی تردید کی تاک میں رہتے تھے اور اس معاملے میں غلوّ کرتے تھے، اور شیعانِ علیؓ کی حمایت کرتے اور دِین میں تشدّد کرتے تھے۔

ابنِ جریر طبریؒ لکھتے ہیں کہ: ایک مرتبہ کوفہ کے گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبے میں حسبِ معمول حضرت عثمانؓ کے لئے رحم و مغفرت کی دُعا فرمائی اور ان کے قاتلوں کے حق میں بددُعا فرمائی،(۱) اس پر حجر بن عدیؓ کھڑے ہوگئے اور حضرت مغیرہؓ کے خلاف اس زور کا نعرہ لگایا کہ مسجد کے اندر اور باہر سب لوگوں نے سنا اور حضرت مغیرہؓ سے خطاب کر کے کہا:-

إنک لا تدری بمن تولع من هرمک أیها الإنسان مولنا بأرزاقنا أعطیاتنا فإنک قد حبستها عنا ولیس ذٰلک لک ولم یکن یطمع فی ذٰلک من کان قبلک وقد أصبحت مولعًا بذم أمیر المؤمنین وتقریظ المجرمین.

ترجمہ:- اے انسان! تجھے سٹھیا جانے کی وجہ سے یہ پتہ نہیں کہ تو کس سے عشق کا اظہار کر رہا ہے؟ ہماری تنخواہوں کی ادائیگی کا حکم جاری کر، کیونکہ وہ تو نے روک رکھی ہیں حالانکہ تجھے اس کا حق نہیں اور تجھ سے پہلے گورنروں نے کبھی ہماری تنخواہوں کی لالچ نہیں کی تھی اور تم امیر المؤمنین (حضرت علیؓ) کی مذمت اور مجرموں (حضرت عثمانؓ) کی مدح کرنے کے بڑے شوقین ہو۔

لیکن اس پر حضرت مغیرہؓ نے انہیں کچھ نہیں کہا اور گھر تشریف لے گئے،

---

(۱) یہی وہ بددُعا ہے جسے مولانا مودودی نے ''منبروں پر خطبوں میں علانیہ حضرت علیؓ پر لعنت اور سبّ وشتم کا سلسلہ'' سے تعبیر فرمایا ہے، اور جس کے بارے میں طبریؒ کے الفاظ یہ ہیں کہ: ''ویدعو علٰی قتلته فقام حجر بن عدی فنعر نعرة بالمغیرة ..... الخ''۔ (طبری ج:۴ ص:۱۸۸، ۱۸۹)

لوگوں نے انہیں سمجھایا بھی کہ ایسے شخص کو تنبیہ کئے بغیر چھوڑنا مناسب نہیں، مگر حضرت مغیرہؓ نے فرمایا: ''میں خطا کار سے درگزر کرنے والا ہوں۔''

حضرت مغیرہؓ کے بعد زیاد کوفہ کا بھی گورنر ہوگیا تو اس نے اپنے خطبے میں حضرت عثمانؓ کی تعریف کی اور ان کے قاتلوں پر لعنت بھیجی۔[1] اس پر حجر حسبِ معمول کھڑے ہوگئے اور جو باتیں حضرت مغیرہؓ سے کہی تھیں وہی زیاد سے بھی کہیں، زیاد نے اس وقت انہیں کچھ نہ کہا۔[2]

اس کے بعد اِمام ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ زیاد نے حضرت حجر بن عدیؓ کو تنہائی میں بلا کر ان سے کہا کہ:۔

---

(۱) اسی کو مولانا مودودی نے ان الفاظ میں تعبیر کیا ہے کہ: ''وہ خطبے میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا اور یہ اُٹھ کر اس کا جواب دینے لگتے تھے'' حالانکہ جتنے حوالے مولانا نے دیئے ہیں ان میں کہیں یہ موجود نہیں ہے کہ زیاد حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا۔

طبری کے الفاظ یہ ہیں: ''ذكر عثمان وأصحابه فقرظهم وذكر قتلته ولعنهم فقام حجر .... الخ'' (طبری ج:۴ ص:۱۹۰) اس نے حضرت عثمانؓ اور ان کے اصحاب کا ذکر کر کے ان کی تعریف کی اور ان کے قاتلین کا ذکر کر کے ان پر لعنت بھیجی تو حجر کھڑے ہوگئے۔

اور ابنِ اثیرؒ کے الفاظ یہ ہیں: ''ترحم علىٰ عثمان وأثنى علىٰ أصحابه ولعن قاتليه فقام حجر .... الخ'' (ابنِ اثیر ج:۳ ص:۱۸۷ طبع قدیم)۔ اس نے حضرت عثمانؓ پر رحمت بھیجی اور ان کے اصحاب کی تعریف کی اور ان کے قاتلوں پر لعنت بھیجی۔

اور حافظ ابنِ کثیرؒ کے الفاظ یہ ہیں: ''وذكر في اخرها فضل عثمان وذم قتله أو أعان علىٰ قتله فقام حجر'' (البدایہ ج:۸ ص:۱۰) خطبے کے آخر میں اس نے حضرت عثمانؓ کی فضیلت بیان کی اور ان کے قتل کرنے والوں اور قتل میں اعانت کرنے والوں کی مذمت کی تو حجر کھڑے ہوگئے۔

اور ابنِ خلدون کے الفاظ یہ ہیں: ''وترحم علىٰ عثمان ولعن قاتليه وقال حجر .... الخ'' (ابنِ خلدون ج:۳ ص:۲۳) اس نے حضرت عثمانؓ پر رحمت بھیجی اور ان کے قاتلوں پر لعنت اور حجر نے کہا....الخ۔

اور ابنِ عبدالبرؒ نے تو اس خطبے کا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ان کے الفاظ سے مولانا مودودی صاحب نے یہ کہاں سے مستنبط کرلیا کہ ''وہ خطبے میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا''۔

(۲) یہاں تک کا واقعہ طبریؒ، ابن اثیرؒ، ابنِ کثیرؒ اور ابن خلدونؒ نے متفقہ طور پر بیان کیا ہے۔

اپنی زبان اپنے قابو میں رکھیے اور اپنے گھر کو اپنے لئے کافی سمجھئے، اور یہ میرا تخت حاضر ہے، یہ آپ کی نشست ہے، آپ کی تمام ضروریات میں پوری کروں گا، لہٰذا آپ اپنے معاملے میں مجھے مطمئن کردیجئے اس لئے کہ آپ کی جلد بازی مجھے معلوم ہے، اے ابوعبدالرحمٰن! میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں، ان پست فطرت اور بے وقوف لوگوں سے بچیئے، یہ لوگ کہیں آپ کو آپ کی رائے سے پھسلا نہ دیں، لہٰذا اب اگر آپ کی قدر میری نگاہ میں کم ہوئی یا میں نے آپ کے حقوق میں کوتاہی کی تو یہ میری طرف سے ہرگز نہیں ہوگی۔ (۱)

حجر بن عدیؓ نے یہ بات سن کر کہا کہ: ''میں سمجھ گیا۔'' پھر وہ اپنے گھر چلے گئے، وہاں ان سے ان کے شیعہ دوست آکر ملے اور پوچھا کہ: ''امیر نے کیا کہا؟'' انہوں نے پوری گفتگو بتلادی، اس پر شیعہ ساتھیوں نے کہا کہ: ''اس نے آپ کی خیرخواہی کی بات نہیں کہی''۔ (۲)

اس کے بعد حافظ ابنِ کثیرؒ فرماتے ہیں کہ: زیاد حضرت عمرو بن حریثؓ کو کوفہ میں اپنا نائب بناکر بصرہ جانے لگا تو اس نے حجر بن عدیؓ کو بھی ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا، تاکہ پیچھے کوئی فتنہ کھڑا نہ ہو، لیکن حجر بن عدیؓ نے یہ عذر کردیا کہ: ''میں بیمار ہوں'' اس پر زیاد نے جل کر کہا کہ: ''تم دِین، قلب اور عقل ہر اعتبار سے بیمار ہو، خدا

---

(۱) ''أمسك عليك لسانك وليسعك منزلك، وهٰذا سريري فهو مجلسك، وحوائجك مقضية لدي فاكفني نفسك فإني أعرف عجلتك، فأنشدك الله يا أبا عبدالرحمٰن في نفسك، وإياك وهٰذه السفلة وهؤلاء السفهاء أن يستزلوك عن رأيك فإنك لو هنت عليّ أو استخففت بحقك لم أخصك بهٰذا من نفسي.'' (طبقات ابن سعد ج:۸ ص:۲۱۸ جز:۲۲، دار صادر بیروت)

(۲) أيضاً والبداية والنهاية ج:۸ ص:۵۳ مطبعة السعادة مصر۔

کی قسم! اگر تم نے کوئی ہنگامہ کیا تو میں تمہارے قتل کی کوشش کروں گا"۔ (۱)

اِمام ابنِ سعدؒ لکھتے ہیں کہ: جب زیاد بصرہ چلا گیا تو شیعہ صاحبان حجر بن عدیؒ کے پاس بکثرت آتے جاتے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ:-

إنک شیخنا وأحق الناس بإنکار هٰذا الأمر.

ترجمہ:- آپ ہمارے شیخ ہیں، اور تمام لوگوں سے زیادہ اس بات کے حق دار ہیں کہ اس معاملے (خلافتِ معاویہؓ) کا انکار کریں۔

حجر بن عدیؒ مسجد میں جاتے تو یہ لوگ بھی ان کے ساتھ جاتے، زیاد کے نائب حضرت عمرو بن حریثؓ نے جب یہ دیکھا تو ایک قاصد کے ذریعہ حجرؒ کو پیغام بھیجا کہ: "اے ابوعبدالرحمٰن! آپ تو اَمیر سے اپنے بارے میں عہد کرچکے ہیں، پھر یہ جماعت آپ کے ساتھ کیسی ہے؟" حجرؒ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ: "جن چیزوں میں تم مبتلا ہو، تم ان کا انکار کرتے ہو، پیچھے ہٹو، تمہاری خیریت اسی میں ہے"۔ (۲)

اس پر حضرت عمرو بن حریثؓ نے زیاد کو لکھا کہ: "اگر تم کوفہ کو بچانے کی ضرورت سمجھتے ہو تو جلدی آجاؤ"۔ (۳)

علامہ ابنِ جریر طبریؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ: زیاد کو یہ اطلاع ملی کہ حجر کے پاس شیعانِ علیؓ جمع ہوتے ہیں اور حضرت معاویہؓ پر علی الاعلان لعنت کرتے اور ان سے براءت کا اظہار کرتے ہیں اور انہوں نے حضرت عمرو بن حریثؓ پر پتھر بھی برسائے ہیں۔ (۴)

اِمام ابنِ سعدؒ فرماتے ہیں کہ: زیاد یہ اطلاع پاکر بڑی برق رفتاری سے

---

(۱) البدایة والنهایة ج:۸ ص:۵۱۔

(۲) پورا جملہ یہ ہے: "تنکرون ما أنتم علیه، إلیک وراءک أوسع لک" دُوسرے جملے کا مفہوم یقینی طور سے میں نہیں سمجھ سکا۔

(۳) طبقات ابن سعد ج:۸ ص:۲۱۸ جز:۲۲، والبدایة والنهایة ج:۸ ص:۵۳۔

(۴) الطبری ج:۴ ص:۱۹۰، ابن أثیر ج:۳ ص:۱۸۷، ابن خلدون ج:۳ ص:۲۳، البدایة والنهایة ج:۸ ص:۵۱، پہلی تین کتابوں کے الفاظ یہ ہیں: "فبلغه أن حجرًا یجتمع إلیه شیعة علیّ ویظهرون لعن معاویة والبراءة منه وأنهم حصبوا عمرو بن حریث"۔

کوفہ پہنچا، یہاں آکر اس نے مشہور صحابہ حضرت عدی بن حاتم، حضرت جریر بن عبداللہ البجلی اور حضرت خالد بن عرفطہ الازدی رضی اللہ عنہم اور کوفہ کے بعض دوسرے شرفاء کو بلایا اور ان سے کہا کہ: آپ جاکر حجر بن عدیؓ کو اتمامِ حجت کے طور پر سمجھائیں کہ وہ اس جماعت سے باز رہیں اور جو باتیں وہ کہتے رہتے ہیں ان سے اپنی زبان قابو میں رکھیں۔ یہ حضرات ان کے پاس گئے مگر حجر بن عدیؓ نے نہ کسی سے بات کی، نہ کسی کی بات کا جواب دیا بلکہ ان کا ایک اُونٹ گھر کے ایک کونے میں کھڑا تھا، اس کی طرف اشارہ کرکے اپنے غلام سے کہا کہ: "لڑکے! اُونٹ کو چارہ کھلاؤ" جب انہوں نے ان حضرات کی بات اس طرح سنی اَن سنی کردی تو حضرت عدیؓ بن حاتم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:-[1]

> کیا تم دیوانے ہو؟ میں تم سے بات کر رہا ہوں، اور تم کہتے ہو کہ لڑکے! اُونٹ کو چارہ کھلاؤ۔

اس کے بعد حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے خطاب کرکے فرمایا: "مجھے گمان بھی نہ تھا کہ یہ بے چارہ ضعف کے اس درجے کو پہنچ گیا ہوگا جو میں دیکھ رہا ہوں۔"

اس طرح یہ حضرات واپس آگئے اور زیاد کے پاس آکر حجر کی کچھ باتیں بتائیں اور کچھ چھپالیں، اور زیاد سے درخواست کی کہ ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے، زیاد نے جواب میں کہا کہ: "اگر میں اب ان کے ساتھ نرمی کروں تو میں ابوسفیان کا بیٹا نہیں"۔[2]

علامہ ابنِ جریر طبریؒ وغیرہ نے حضرت عدیؓ بن حاتم کا یہ واقعہ نقل نہیں کیا، اس کے بجائے انہوں نے لکھا ہے کہ زیاد نے کوفہ میں ایک خطبہ دیا، غالباً یہ خطبہ حضرت عدیؓ بن حاتم کی واپسی کے بعد دیا ہوگا۔ بہر حال! ابنِ جریرؒ وغیرہ کے مطابق زیاد جمعہ کے دن منبر پر پہنچا، اس وقت حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھ حلقہ بنائے بیٹھے

---

(۱) البدایة والنهایة ج:۸ ص:۵۱۔

(۲) طبقات ابن سعد ج:۸ ص:۲۱۸ و ۲۱۹ جز:۲۲، والبدایة والنهایة ج:۸ ص:۵۳۔

تھے، زیاد نے کہا:-

حمد وصلوٰۃ کے بعد، یاد رکھو! کہ ظلم اور بغاوت کا انجام بہت بُرا ہے، یہ لوگ (حجر اور ان کے ساتھی) جتھہ بنا کر بہت اِترا گئے ہیں، انہوں نے مجھے اپنے حق میں بے ضرر پایا تو مجھ پر جری ہوگئے اور خدا کی قسم! اگر تم سیدھے نہ ہوئے تو میں تمہارا علاج اسی دوا سے کروں گا جو تمہارے لائق ہے، اور اگر میں کوفہ کی زمین کو حجر سے محفوظ نہ کردوں اور اس کو آنے والوں کے لئے سامانِ عبرت نہ بناؤں تو میں بھی کوئی چیز نہیں۔ (۱)

حافظ ابنِ کثیرؒ لکھتے ہیں کہ: اس کے بعد زیاد نے خطبے میں یہ بھی کہا کہ:-

إن من حق أمير المؤمنين يعني كذا و كذا.

ترجمہ:- تم پر امیر المؤمنین کے فلاں اور فلاں حقوق ہیں۔

اس پر حجر بن عدیؓ نے کنکریوں سے ایک مٹھی بھری اور زیاد پر دے ماری اور کہا کہ:-

كذبت! عليك لعنة الله. (۲)

ترجمہ:- تم پر خدا کی لعنت! تم نے جھوٹ کہا۔

اس پر زیاد منبر سے اُترا اور نماز پڑھی۔

بعض راویوں نے اس خطبے میں یہ قصہ ذکر کیا ہے کہ جب زیاد کا خطبہ طویل ہوگیا اور نماز کو دیر ہونے لگی تو حجر بن عدیؓ نے مٹھی بھر کنکریاں زیاد پر دے ماریں، تب زیاد منبر سے اُترا اور نماز پڑھی۔

بہرکیف! اس خطبے میں حجر بن عدیؓ کے کنکریاں مارنے کی وجہ خواہ کچھ ہو،

---

(۱) الطبری ج:۴ ص:۱۹۰، ابن اثیر ج:۳ ص:۱۸۷، البداية والنهاية ج:۸ ص:۵۱۔ الفاظ یہ ہیں: "أما بعد فإن غب البغي وخيم أن هؤلاء جموا فأشروا وأمنوني فاجترءوا عليّ وأيم الله لئن لم تستقيموا لأداوينكم بدوائكم وقال ما أنا بشيء إن لم أمنع باحة الكوفة من حجر وأدعه نكالا لمن بعده"۔

(۲) البداية والنهاية ج:۸ ص:۵۱۔

اسی خطبے کے بعد زیاد نے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حجر بن عدیؓ کے تمام حالات تفصیل کے ساتھ بھیجے، اس پر حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ: ”حجر کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو“۔ (۱)

اس مرحلے پر زیاد نے اپنے اَمیرِ شرطہ (پولیس سپرنٹنڈنٹ) شداد بن الہیثم کو حکم دیا کہ حجر کو بلا لاؤ، حسین بن عبداللہ ہمدانی کہتے ہیں کہ جس وقت زیاد کا یہ حکم آیا، میں شداد کے پاس بیٹھا تھا، شداد نے مجھ سے کہا کہ تم جا کر حجر کو بلا لاؤ، میں نے حجر کے پاس جا کر کہا کہ: ”امیر آپ کو بلاتے ہیں“ اس پر ان کے ساتھیوں نے کہا: ”یہ اس کے پاس نہیں جائیں گے“ میں نے واپس آ کر شداد کو ان کا جواب سنایا تو اس نے میرے ساتھ کچھ اور آدمی بھیج دیئے، ہم سب نے جا کر ان سے کہا کہ: ”امیر کے پاس چلئے“۔

فسبونا وشتمونا۔

تو حجر کے ساتھیوں نے ہمیں گالیاں دیں اور بُرا بھلا کہا۔ (۲)

جب صورتِ حال اس درجہ سنگین ہوگئی تو زیاد نے شرفائے کوفہ کو جمع کر کے ایک جوشیلی تقریر کی اور کہا کہ ہر شخص اپنے اپنے رشتہ داروں کو حجر کی جماعت سے الگ کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے بعد پھر اَمیرِ شرطہ شداد بن الہیثم کو زیادہ آدمی دے کر بھیجا اور تاکید کی کہ اگر حجر تمہاری بات مان لیں تو انہیں لے آؤ، ورنہ ان سے لڑائی کرو، چنانچہ شداد نے تیسری بار جا کر حجرؓ سے کہا کہ: ”امیر کے پاس چلو“ مگر حجرؓ کے ساتھیوں نے جواب میں کہا کہ: ”ہم پلک جھپکنے کی دیر کے لئے بھی امیر کا یہ حکم نہیں مانیں گے“۔ (۳) اس پر فریقین میں لاٹھیوں اور پتھروں سے سخت لڑائی ہوئی، (۴) مگر

(۱) الطبری ج:۴ ص:۱۹۰، البدایة والنهایة ج:۸ ص:۵۱، الاستیعاب تحت الاصابة ج:۱ ص:۳۵۵۔

(۲) الطبری ج:۴ ص:۱۹۱۔

(۳) ”لا ولا نعمة عین لا نجیبه“ (طبری ج:۴ ص:۱۹۱)۔

(۴) طبری ج:۴ ص:۱۹۱، ۱۹۲، البدایة ج:۸ ص:۵۱، طبقات ابن سعد ج:۶ ص:۲۱۹، ابنِ کثیرؒ کے الفاظ یہ ہیں: ”فکان بینهم قتال بالحجارة والعصی فعجزوا عنه“ اور ابنِ سعدؒ فرماتے ہیں: ”فقاتلهم بمن معه“۔

زیاد کی پولیس حجرؓ اور ان کے ساتھیوں پر غالب نہ آسکی اور وہ گرفتار نہ ہوئے۔

اس کے بعد حجر بن عدیؓ جائے واردات سے فرار ہوکر کندہ کے محلے میں پہنچ گئے، کندہ میں سب حجر بن عدیؓ کی قوم کے افراد آباد تھے، حجرؓ کے ساتھیوں نے یہاں کے تمام لوگوں کو جنگ پر آمادہ کیا، حجرؓ کا ایک ساتھی قیس بن قہدان ایک گدھے پر سوار ہوکر یہ اَشعار پڑھتا پھر رہا تھا کہ:-

یا قوم حجر دافعوا وصاولوا
وعن أخیکم ساعة فقاتلوا
لا یلفین منکم لحجر خاذل
ألیس فیکم رامح ونابل
وفارس مستلئم وراجل
وضارب بالسیف لا یزائل (۱)

ترجمہ:- اے حجر کی قوم! دِفاع کرو اور آگے بڑھ کر حملے کرو، اور اسی وقت اپنے بھائی کی طرف سے لڑنے کے لئے تیار ہوجاؤ، تم میں کوئی شخص ایسا نہ ہو جو حجر کو بے یار و مددگار چھوڑ جائے، کیا تم میں کوئی تیرانداز اور نیزے کا دَھنی نہیں؟ کیا تم میں کوئی جم کر بیٹھنے والا شہسوار نہیں؟ کیا تم میں کوئی ایسا تیغ زَن نہیں جو ہٹنا نہ جانتا ہو؟

زیاد نے کوفہ کے مختلف باشندوں کو کندہ پر چڑھائی کرنے کے لئے بھیجا، یہاں بھی سخت جنگ ہوئی، مگر حجر بن عدیؓ فرار ہوکر رُوپوش ہوگئے۔(۲) جب ان کو پکڑنے کی کوئی اور صورت نہ رہی تو زیاد نے محمد بن الاشعث کو بلاکر ان سے کہا کہ تم تین دن کے اندر حجر کو تلاش کرکے پہنچادو، ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ محمد بن الاشعث سواروں کی ایک جماعت کے ساتھ ان کو تلاش کرتے رہے، بالآخر حجرؓ نے خود ہی اپنے آپ کو اس

---

(۱) الطبری ج:۴ ص:۱۹۳۔

(۲) طبریؒ نے ص:۱۹۴ سے ۱۹۶ تک اس لڑائی اور رُوپوشی کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں۔

شرط پر حاضر ہونے کے لئے پیش کیا کہ: ''مجھے امان دی جائے اور معاویہؓ کے پاس بھیج دیا جائے'' زیاد نے اس شرط کو منظور کرلیا تو حجرؓ اس کے پاس پہنچے، زیاد نے انہیں دیکھ کر کہا:-

مرحبا ابو عبدالرحمٰن! تم جنگ کے زمانے میں تو جنگ کرتے ہی تھے، اس وقت بھی جنگ کرتے ہو جب سب لوگ صلح کر چکے ہیں۔

اس کے جواب میں حجرؓ نے کہا:-

میں نے اطاعت نہیں چھوڑی، اور نہ جماعت سے علیحدگی اختیار کی ہے، میں اب بھی اپنی بیعت پر قائم ہوں۔

زیاد نے کہا:-

حجر! افسوس ہے کہ تم ایک ہاتھ سے زخم لگاتے ہو اور دُوسرے سے مرہم، تم یہ چاہتے ہو کہ جب اللہ نے ہمیں تم پر قابو دیا تو ہم تم سے خوش ہو جائیں۔

حجر نے کہا:-

کیا تم نے معاویہؓ کے پاس پہنچنے تک مجھے امن نہیں دیا؟

زیاد نے کہا:-

کیوں نہیں، ہم اپنے عہد پر قائم ہیں۔

یہ کہہ زیاد نے انہیں قید خانہ بھیج دیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ: ''اگر مجھے امانت کا خیال نہ ہوتا تو یہ شخص جان بچا کر یہاں سے نہ جا سکتا۔''

اس طرح حجر بن عدیؓ تو گرفتار ہو گئے، لیکن ان کے دُوسرے ساتھی جو اصل فتنے کا سبب تھے، بدستور رُوپوش رہے، اس کے بعد زیاد نے کوفہ کے چار سرداروں حضرت عمر بن حریثؓ، حضرت خالد بن عرفطہؓ، حضرت ابو بردہ بن ابی موسیٰؓ اور قیس بن الولید کو جمع کر کے ان سے کہا:-

اشهدوا علی حجر بما رأيتم منه.

ترجمہ:- حجر کے بارے میں تم نے جو کچھ دیکھا ہے اس کی گواہی دو۔

ان چاروں حضرات نے گواہی دی، اس کے الفاظ طبریؒ نے اس طرح نقل کئے ہیں:-

> حجرؓ نے (۱) اپنے گرد بہت سے جتھے جمع کر لئے ہیں اور خلیفہ کو کھلم کھلا بُرا بھلا کہا ہے اور امیر المؤمنین کے خلاف جنگ کرنے کی دعوت دی ہے اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خلافت کا آلِ ابی طالب کے علاوہ کوئی مستحق نہیں، انہوں نے ہنگامہ برپا کر کے امیر المؤمنین کے گورنر کو نکال باہر کیا اور یہ ابوترابؓ (حضرت علیؓ) کو معذور سمجھتے اور ان پر رحمت بھیجتے ہیں اور ان کے دُشمن اور ان سے جنگ کرنے والوں سے براءت کا اظہار کرتے ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ ان کے ساتھیوں کے سرگروہ ہیں اور ان ہی جیسی رائے رکھتے ہیں۔

پھر زیاد نے چاہا کہ ان چار حضرات کے علاوہ دُوسرے لوگ بھی اس گواہی میں شریک ہوں، چنانچہ اس نے ان حضرات کی گواہی لکھ کر لوگوں کو جمع کیا، ان کو یہ گواہی پڑھ کر سنائی اور لوگوں کو دعوت دی کہ جو لوگ اس گواہی میں شریک ہونا چاہیں وہ اپنا نام لکھوا دیں، چنانچہ لوگوں نے نام لکھوانے شروع کئے، یہاں تک کہ ستر افراد نے اپنے نام لکھوائے، لیکن زیاد نے کہا کہ ان میں سے صرف وہ نام باقی رکھے جائیں جو اپنی دِین داری اور حسب و نسب کے اعتبار سے معروف ہوں، چنانچہ چوالیس نام لکھے گئے اور باقی ساقط کر دیئے گئے۔ (۲)

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چوالیس گواہوں میں سے بعض حضرات

---

(۱) إن حجرًا جمع إليه الجموع وأظهر شتم الخليفة ودعا إلى حرب أمير المؤمنين وزعم أن هٰذا الأمر لا يصلح إلّا في آلِ أبي طالب ووثب بالمصر وأخرج عامل أمير المؤمنين وأظهر عذرا أبي تراب والترحم عليه والبراءة من عدوه وأهل حربه وأن هٰؤلاء النفر الذين معه هم رءوس أصحابه وعلى مثل رأيه وأمره.

(۲) الطبری ج:۴ ص:۱۹۳ تا ۲۰۱۔

کا مختصر تعارف کرادیا جائے۔

جن چار گواہوں نے ابتداءً گواہی دی، ان میں سب سے پہلے تو حضرت عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ ہیں، یہ باتفاق صحابہ میں سے ہیں، البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر کیا تھی؟ بعض حضرات نے بارہ سال عمر بتائی ہے، مگر ابوداؤد میں ان ہی کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک مکان کی جگہ عطا فرمائی تھی۔ اس سے حافظ ابنِ حجرؒ نے استدلال کیا ہے کہ یہ کبار صحابہؓ میں سے ہیں، انہوں نے بعض احادیث براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں اور بعض حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ وغیرہ کبار صحابہؓ کے واسطے سے۔[1]

دُوسرے حضرت خالد بن عرفطہ ازدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، یہ بھی مشہور صحابی ہیں، انہوں نے بھی براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی حدیثیں روایت کی ہیں، جنگِ قادسیہ میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ان کو نائب سپہ سالار بنایا تھا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بذاتِ خود حضرت سعدؓ کو یہ حکم دیا تھا کہ ان کو اَمیرِ لشکر بنایا جائے، ایک مرتبہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ان کو کوفہ میں اپنا نائب بھی بنایا تھا۔[2]

تیسرے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے حضرت ابوبردہؒ ہیں، جو صحابی تو نہیں، مگر جلیل القدر تابعی ہیں، اعلیٰ درجے کے فقہاء میں سے ہیں اور بے شمار احادیث کے راوی ہیں، حضرت علیؓ کے شاگردوں میں سے ہیں، ان کے علاوہ بہت سے جلیل القدر صحابہؓ سے بکثرت احادیث روایت کی ہیں، کوفہ کے قاضی بھی رہے ہیں، اِمام ابنِ سعدؒ فرماتے ہیں کہ: "کان ثقة كثير الحديث" (ثقہ ہیں

---

(۱) طبقات ابن سعد ج:۶ ص:۲۳ جزو:۲۱، وتهذيب التهذيب ج:۸ ص:۱۷، دائرة المعارف دکن ۱۳۲۶ھ، والاصابة ج:۲ ص:۵۲۴۔ و تجريد أسماء الصحابة لابن أثير الجزريؒ ج:۱ ص:۴۳۵، دائرة المعارف دکن ۱۳۱۵ھ۔

(۲) ابن سعد ج:۶ ص:۲۱ جزو:۲۱، والاصابة ج:۱ ص:۴۰۹، و تهذيب التهذيب ج:۳ ص:۱۰۶۔

اور بہت سی احادیث کے راوی ہیں)۔ امام عجلیؒ فرماتے ہیں: "کوفی تابعی ثقة"۔ [1]

چوتھے صاحب قیس بن الولید ہیں، ان کے حالات ہمیں کہیں نہ مل سکے، اس کے بعد جن ستر حضرات نے اپنے نام لکھوائے، ان میں سے ایک حضرت وائل بن حجر حضرمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو معروف صحابہؓ میں سے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی احادیث روایت کی ہیں۔ [2]

دُوسرے حضرت کثیر بن شہابؓ ہیں، ابنِ عساکرؒ نے انہیں صحابی قرار دیا ہے، ابنِ عبدالبرؒ کہتے ہیں کہ ان کا صحابی ہونا مشکوک ہے، مگر حافظ ابنِ حجرؒ نے راجح اسی کو قرار دیا ہے کہ یہ صحابی ہیں، اور حضرت عمرؓ نے انہیں کسی جگہ کا امیر بھی بنایا تھا۔ [3]

ان کے علاوہ ایک بزرگ حضرت موسیٰ بن طلحہؒ ہیں، جو مشہور صحابی حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں، اور بے شمار احادیث کے راوی ہیں۔ امام عجلیؒ فرماتے ہیں کہ: "تابعی ثقة وکان خیارًا" اور حضرت مرہؒ کا کہنا ہے کہ: "کوفی ثقة رجل صالح"، امام ابوحاتمؒ فرماتے ہیں کہ: "انہیں حضرت طلحہؓ کے تمام صاحبزادوں میں محمد کے بعد سب سے افضل کہا جاتا ہے اور اپنے زمانے میں لوگ انہیں ہدایت یافتہ کہا کرتے تھے"، ابنِ خراشؒ کا کہنا ہے کہ: "جلیل القدر مسلمانوں میں سے ہیں" [4]، امام ابنِ سعدؒ فرماتے ہیں کہ: "ثقہ تھے اور بہت سی احادیث کے راوی"۔ [5]

اسی طرح حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے ایک اور صاحبزادے حضرت اسحاق بن طلحہ نے بھی گواہوں میں اپنا نام لکھوایا تھا، یہ بھی روائے حدیث ہیں، اور ابنِ حبانؒ نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔ [6]

---

(۱) تہذیب التہذیب ج:۱۲ ص:۱۸، وطبقات ابنِ سعد ج:۶ ص:۲۶۸ جزو:۲۳۔

(۲) الاصابة ج:۳ ص:۵۹۲، الاستیعاب تحت الاصابة ج:۳ ص:۶۰۵، ابن سعد ج:۶ ص:۲۶ جزو:۲۱۔

(۳) الاصابة ج:۳ ص:۲۷۱، الاستیعاب ج:۳ ص:۳۰۰، ابن سعد ج:۶ ص:۱۴۹ جزو:۲۲۔

(۴) تہذیب التہذیب ج:۱۰ ص:۳۵۰، ۳۵۱۔

(۵) ابن سعد ج:۶ ص:۲۱۲ جزو:۲۲۔ (۶) تہذیب التہذیب ج:۱ ص:۲۳۸۔

ان کے علاوہ دُوسرے گواہوں کے حالات کی تحقیق کی ہم نے ضرورت نہیں سمجھی۔ یہاں یہ واضح رہنا ضروری ہے کہ طبریؒ ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان گواہیوں پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا گیا، کیونکہ زیاد نے مختار بن ابی عبید اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عروہ کو بھی گواہی دینے کے لئے بلایا مگر انہوں نے انکار کردیا تھا، چنانچہ ان کا نام گواہوں میں نہ لکھا گیا۔[1]

غرض ان تمام گواہوں کی گواہی قلم بند کی گئی، اور گواہیوں کا یہ صحیفہ شرعی اُصول کے مطابق حضرت وئل بن حجر اور حضرت کثیر بن شہاب رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حوالے کیا گیا کہ وہ خود جاکر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو پہنچائیں، حجر بن عدیؓ اور ان کے بارہ ساتھی بھی ان ہی دو حضراتِ صحابہ کی تحویل میں دے دیئے گئے۔

اس کے ساتھ زیاد نے حضرت معاویہؓ کے نام ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:۔

اللہ نے امیر المؤمنین سے بڑی بلا دُور کرکے احسان فرمایا ہے کہ آپ کے دُشمنوں کو زیر کردیا، ان ترابی اور سبائی سرکشوں نے جن کے سرگروہ حجر بن عدی ہیں، امیرالمؤمنین کے خلاف بغاوت کی تھی اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ ڈالا تھا، اور ہمارے خلاف جنگ ٹھان لی تھی، اللہ نے ہمیں ان پر غلبہ عطا فرمایا اور ہمیں ان پر قابو دے دیا، میں نے شہر کے چیدہ صلحاء، اشراف، معمر اور بزرگ افراد کو بلایا تھا، انہوں نے جو کچھ دیکھا اس کی شہادت دی، اب ان لوگوں کو میں نے امیر المؤمنین کے پاس بھیج دیا ہے اور اہلِ شہر کے صلحاء کی گواہی میں نے اپنے اس خط کے ساتھ بھیج دی ہے۔[2]

اس طرح یہ مقدمہ حضرت وائل بن حجرؓ اور حضرت کثیر بن شہابؓ نے حضرت معاویہؓ کی خدمت میں پیش کیا۔

---

(۱) الطبری ج:۴ ص:۲۰۱۔

(۲) الطبری ج:۴ ص:۲۰۲۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھیوں کی شورشوں کا پہلے ہی کافی علم ہو چکا تھا، اب ان کے پاس چوالیس قابلِ اعتماد گواہیاں ان کی باغیانہ سرگرمیوں پر پہنچ گئیں، ان گواہوں میں حضرت وائل بن حجر، حضرت کثیر بن شہاب، حضرت عمرو بن حریث اور حضرت خالد بن عرفطہ رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر صحابہ بھی تھے اور حضرت ابو بردہؒ، حضرت موسیٰ بن طلحہؒ اور حضرت اسحاق بن طلحہؒ جیسے فقہاء و محدثین اور صلحائے اُمت بھی، حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھیوں کے جرمِ بغاوت کو ثابت کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ ان کا یہ جرم روزِ روشن کی طرح ثابت ہو گیا اور ظاہر ہے کہ بغاوت کی سزا ''موت'' ہے۔

لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے طبعی حلم اور بُردباری کی بناء پر قتل کے فیصلے میں جلدی نہیں کی، چنانچہ زیاد کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا کہ:-

> حجر اور ان کے اصحاب کے بارے میں جو واقعات تم نے لکھے وہ میں نے سمجھ لئے، تم نے جو شہادتیں بھیجیں، ان سے بھی باخبر ہو گیا، اب میں اس معاملے میں غور کر رہا ہوں، کبھی سوچتا ہوں کہ ان لوگوں کو قتل کروا دینا ہی بہتر ہے اور کبھی خیال آتا ہے کہ قتل کی بہ نسبت معاف کر دینا افضل ہے۔ والسلام

زیاد نے اس کے جواب میں لکھا کہ:-

> حجر اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں آپ کی رائے مجھے معلوم ہو گئی، مجھے تعجب ہے کہ آپ کو اس معاملے میں تردّد کیوں ہے، حالانکہ ان لوگوں کے خلاف ان حضرات نے گواہی دی ہے جو ان لوگوں کو زیادہ جانتے ہیں، لہٰذا اگر آپ کو اس شہر (کوفہ) کی ضرورت ہو تو آپ حجر اور ان کے ساتھیوں کو میرے پاس واپس نہ بھیجیں۔ (۱)

اس کے باوجود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بعض صحابہؓ کے کہنے پر چھ افراد کو چھوڑ دیا اور آٹھ افراد کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ حجر بن عدیؓ کے بارے میں ایک

(۱) الطبری ج:۴ ص:۲۰۳۔

صاحب نے سفارش کی تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا:-

یہ تو ان سب لوگوں کے سردار ہیں، اور اگر میں نے ان کو چھوڑ دیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ یہ پھر شہر میں فساد کریں گے۔(۱)

چنانچہ حضرت معاویہؓ نے انہیں قتل کرنے کا حکم جاری فرمایا۔

حجر بن عدیؓ کی عبادت و زہد کی دُور دُور شہرت تھی، اس لئے جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو علم ہوا کہ حضرت معاویہؓ نے انہیں قتل کرنے کا حکم دیا ہے تو انہوں نے حضرت معاویہؓ کے نام پیغام بھیجا کہ حجر بن عدیؓ کو رہا کردیں، پیغام حضرت معاویہؓ کو اس وقت ملا جب وہ قتل کا حکم صادر فرما چکے تھے، لیکن انہوں نے فوراً ایک قاصد جلادوں کے پاس روانہ کیا کہ ابھی حجر بن عدیؓ کو قتل نہ کریں، لیکن جب یہ قاصد پہنچا تو حجرؓ اور ان کے چھ ساتھی قتل کئے جاچکے تھے۔(۲)

یہ ہے حجر بن عدیؓ کے قتل کا وہ واقعہ جو خود مولانا مودودی کے حوالوں سے مأخوذ ہے،(۳) ہم نے یہ واقعہ انہی کتب سے لیا ہے جن کا مولانا مودودی نے حوالہ دیا ہے اور زیادہ تفصیلات طبری سے نقل کی ہیں جو مولانا کا پسندیدہ مأخذ ہے۔ اگرچہ طبریؒ نے اس واقعے میں تقریباً تمام روایات ابومخنف کے حوالے سے بیان کی ہیں، جس کے بارے میں ہم بتاچکے ہیں کہ نہایت ناقابلِ اعتماد شیعہ راوی ہے، اور اس نے یہ روایت اپنے جن اُستادوں سے لی ہے ان کے بارے میں بھی ہم ''حضرت علی پر سبّ وشتم'' کے عنوان کے تحت بتلاچکے ہیں کہ وہ شیعہ تھا،(۴) لیکن خود ان شیعہ راویوں نے حجر

---

(۱) الطبری ج:۴ ص:۲۰۴۔

(۲) البدایة والنهایة ج:۸ ص:۵۴، و طبقات ابن سعد ج:۶ ص:۲۱۹ و۲۲۰ جزو:۲۲، و ابن خلدون ج:۳ ص:۲۹۔

(۳) طبقات ابنِ سعد کا حوالہ اگرچہ مولانا نے نہیں دیا، لیکن ان کی جتنی باتیں ہم نے بیان کی ہیں وہ سب البدایہ والنہایہ میں بھی موجود ہیں جس کا حوالہ مولانا نے دیا ہے۔

(۴) لہٰذا جیسا کہ ہم آگے وضاحت کے ساتھ بیان کریں گے، ان روایات کا وہ حصہ ناقابلِ اعتماد ہے جن میں بعض صحابہؓ کی طرف حضرت علیؓ کے خلاف سبّ وشتم کو منسوب کیا گیا ہے۔

بن عدیؓ کا واقعہ جس طرح نقل کیا ہے وہ ہم نے بیان کر دیا ہے۔

اب آپ مولانا مودودی صاحب کی عبارت ایک بار پھر پڑھیئے۔ مولانا نے اس واقعے کے اہم ترین اجزاء کو یکسر حذف کر کے جس طرح یہ واقعہ ذکر کیا ہے اس سے یہ تأثر قائم ہوتا ہے کہ:-

۱- حجر بن عدیؓ قطعی طور پر بے گناہ تھے۔

۲- اصل گناہ حضرت مغیرہؓ اور زیاد کا تھا کہ وہ حضرت علیؓ کو برسرِ منبر گالیاں دیا کرتے تھے۔

۳- حجر بن عدیؓ نے اس گناہ پر ان دونوں کو ٹوکا۔

۴- اس ٹوکنے کی پاداش میں زیاد نے انہیں گرفتار کرلیا۔

۵- شہادتیں لینے کا ذکر بھی مولانا نے اس طرح کیا ہے کہ گویا ساری شہادتیں جھوٹی تھیں اور کرائے کے چند گواہ جمع کر لئے گئے تھے۔

۶- اور خواہ مخواہ ان پر بغاوت کا الزام عائد کر کے ان کے خلاف شہادتیں لیں۔

۷- حضرت معاویہؓ نے بے سمجھے بوجھے غصے میں آکر قتل کا حکم دے دیا۔

واقعے کی مذکورہ تفصیلات کو ذہن میں رکھ کر انصاف فرمائیے کہ کیا ان میں سے کوئی ایک بات بھی صحیح ہے؟

پھر واقعے کی اس قطعی طور پر غلط اور خلافِ واقعہ تصویر سے مولانا نے پورے زورِ قلم کے ساتھ اِس کلیے کا استنباط کرلیا ہے کہ اس دور میں زبانیں بند کردی گئی تھیں، ضمیروں پر قفل چڑھا دیئے گئے تھے، اظہارِ رائے کی آزادی کا خاتمہ ہوگیا تھا اور حق گوئی کی پاداش قتل قرار پا گئی تھی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ تو بہت ہی بلند و بالا ہے، واقعے کی تمام تفصیلات دیکھنے کے بعد ہمیں تو کہیں زیاد کے بارے میں بھی یہ نظر نہ آسکا کہ اس نے حجر بن عدیؓ کے معاملے میں اُصولِ شرع کے خلاف کوئی کام کیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھیوں نے کھلم کھلا اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی اور اگر ان کو اس وقت گرفتار نہ کیا جاتا تو نہ جانے کوفہ میں کتنے مسلمانوں کا خون بہہ

جاتا۔ حضرت معاویہؓ نے ایک صاحب کے سوال کے جواب میں بالکل دُرست فرمایا کہ: ”قتله أحب إلي من أن أقتل معه مائة ألف“ (حجر بن عدیؓ کا قتل کرنا مجھے زیادہ پسند تھا بہ نسبت اس کے کہ میں ان کے ساتھ ایک لاکھ آدمیوں کو قتل کروں)۔[1]

آپ نے دیکھ لیا کہ:-

* ۱- حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھی سرے سے حضرت معاویہؓ کی حکومت کے خلاف تھے۔
* ۲- حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے مکمل طور سے مطمئن ہو جانے کے باوجود یہ انہیں بار بار بغاوت پر اُکساتے رہے اور جب وہ بغاوت پر راضی نہ ہوئے تو ان سے بھی ناراضی کا اظہار کیا۔
* ۳- حضرت معاویہؓ کے کسی گورنر سے کبھی حضرت علیؓ کی شان میں کوئی ایسا لفظ استعمال کرنا ثابت نہیں جسے ”گالی“ کہا جا سکے۔
* ۴- اس کے بجائے یہ لوگ حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ پر کھلم کھلا لعن طعن کرتے تھے۔
* ۵- اُمراء کی بات بات پر ان کے خلاف شورش کرنا ان کی عادت بن گئی تھی۔
* ۶- حضرت مغیرہؓ اور زیاد نے انہیں اوّلاً نہایت معقولیت اور شرافت کے ساتھ فہمائش کی کہ ان حرکتوں سے باز آ جائیں۔
* ۷- انہوں نے اس فہمائش کے دوران سکوت اختیار کیا، کوئی شکایت پیش نہیں کی، لیکن واپس آ کر پھر خلافتِ معاویہؓ کا انکار کیا اور ان پر لعنت بھیجنی شروع کی، اور گورنرِ کوفہ حضرت عمرو بن حریثؓ پر پتھر برسائے۔
* ۸- زیاد نے اس موقع پر بھی کوئی سخت کارروائی کرنے کے بجائے حضرت عدی بن حاتم، حضرت جریر بن عبداللہ البجلی اور حضرت خالد بن عرفطہ رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ کو بھیجا کہ انہیں سمجھانے کی کوشش کریں، مگر انہوں نے ان سے رُخ دے کر بات ہی نہ کی۔

---

(۱) البدایة والنهایة ج:۸ ص:۵۴۔

* ۹- اس موقع پر زیاد نے دھمکی دی کہ: ''اگر تم سیدھے نہ ہوئے تو تمہارا علاج اس دوا سے کروں گا جو تمہارے لائق ہے'' اور اس دھمکی کے ساتھ انہیں پھر سمجھایا کہ امیر المؤمنین کے تم پر کیا حقوق ہیں، مگر حجر بن عدیؓ نے اس موقع پر پھر زیاد پر کنکر برسائے اور کہا کہ: ''تجھ پر خدا کی لعنت، تو نے جھوٹ کہا''۔
* ۱۰- انہیں زیاد نے بحیثیت گورنر حکم دیا کہ وہ اس کے پاس آئیں، مگر انہوں نے یہ حکم ماننے سے صاف انکار کر دیا، دُوسری بار آدمی بھیجے گئے، انہوں نے بھی سوائے اَمیر کا پیغام پہنچانے کے انہیں کچھ نہیں کہا، مگر حجرؓ کے ساتھیوں نے انہیں گالیاں دے کر رُخصت کر دیا۔
* ۱۱- تیسری بار کوفہ کے شرفاء اور پولیس سپرنٹنڈنٹ کو بھیجا گیا کہ انہیں بلا کر لائیں، انہوں نے بھی شروع میں سوائے اس کے کچھ نہ کہا کہ: ''امیر کے پاس چلو'' لیکن انہوں نے جواب دیا کہ: ''ہم یہ حکم نہیں مانیں گے'' اس پر پولیس نے زبردستی کی تو یہ لوگ لڑنے کے لئے تیار ہو گئے، لاٹھیوں اور پتھروں سے باقاعدہ لڑائی لڑی اور قابو میں نہ آئے۔
* ۱۲- پھر کندہ پہنچ کر پورے محلے کو بغاوت کا گڑھ بنا دیا اور باقاعدہ جنگ کی تیاریاں ہوئیں اور رزمیہ اَشعار پڑھے گئے، اور جب زیاد نے یہاں اپنے آدمی بھیجے تو ان لوگوں نے سخت جنگ کی اور بالآخر رُوپوش ہو گئے۔
* ۱۳- اس کے بعد جب انہیں گرفتار کیا گیا تو کہنے لگے: ''ہم اپنی بیعت پر قائم ہیں''۔
* ۱۴- چوالیس مقتدر ہستیوں نے ان کے خلاف بغاوت کی شہادت دی، جن میں جلیل القدر صحابہ کرامؓ، فقہاءؒ اور محدثینؒ شامل تھے، اور اس شہادت میں کسی پر جبر کرنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔
* ۱۵- ان تمام واقعات سے باخبر ہوکر اور مذکورہ شہادتیں دیکھ کر حضرت معاویہؓ نے ان کے قتل کا حکم صادر فرمایا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شورش حجر بن عدیؓ اور ان کے اصحاب نے کھڑی کردی تھی، اگر اسی کا نام "حق گوئی" اور "اظہارِ رائے" ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ "بغاوت"، "فتنہ وفساد" اور "شورش" کے الفاظ لغت سے خارج کردینے چاہئیں۔

مولانا مودودی صاحب نے یہ دیکھنے کے لئے کہ حجر بن عدیؓ کا قتل شرعاً جائز تھا یا ناجائز، ان واقعات کی تحقیق کرنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی جو خود کوفہ میں پیش آئے تھے اور جنھیں علامہ طبریؒ نے کم وبیش دس پندرہ صفحات میں بیان کیا ہے۔ اس کے بجائے اس قتل کے ناجائز ہونے پر ایک خراسان کے گورنر ربیع بن زیاد حارثی کے مجمل قول کا حوالہ دیا ہے جو اس وقت کوفہ اور شام سے سینکڑوں میل دُور بیٹھے ہوئے تھے۔ دُوسرے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ایک محرَّف ارشاد کا جو اس وقت مدینہ طیبہ میں تشریف فرما تھیں، تیسرے ان جلادوں کے قول کا جنھوں نے حجر بن عدیؓ کو قتل کیا، اب ان تینوں اقوال کی حقیقت بھی دیکھ لیجئے۔

جہاں تک ربیع بن زیاد حارثی کا تعلق ہے، سو وہ خراسان کے گورنر تھے اور وہیں پر انہیں حجر بن عدیؓ کے قتل کی اطلاع ملی، انہوں نے فرمایا کہ: "خدایا! اگر تیرے علم میں میرے اندر کوئی خیر باقی ہے تو مجھے دُنیا سے اُٹھالے" ہم پیچھے عرض کرچکے ہیں کہ حجر بن عدیؓ کے عابد وزاہد ہونے کی بڑی شہرت تھی، اور قدرتی بات یہ ہے کہ جو شخص بھی پورے حالات سے ناواقف رہ کر صرف یہ سنے گا کہ انہیں قتل کردیا گیا تو وہ لامحالہ اس پر رنج وافسوس کا اظہار کرے گا۔ لیکن یہ رنج وافسوس اس شخص کے خلاف کیسے حجت بن سکتا ہے جس کے سامنے چوالیس قابلِ اعتماد گواہیاں گزر چکی ہوں، اور وہ سب اس بات پر متفق ہوں کہ حجر بن عدیؓ نے بغاوت کا ارتکاب کیا ہے، جہاں تک عبادت وزُہد کا تعلق ہے تو وہ اس بات کی وجہ جواز نہیں ہے کہ اسلامی حکومت کے خلاف بغاوت کا ارتکاب کیا جائے، نظیر کے طور پر (بلا تشبیہ ومثال) خارجیوں کو پیش کیا جاسکتا ہے کہ وہ کچھ کم عابد وزاہد نہ تھے، لیکن کیا اُمت کا کوئی فرد یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ خارجی بہت زیادہ عابد تھے اس لئے انہیں قتل کرنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ناجائز فعل تھا؟

رہ گیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد، سو اس کے الفاظ مؤرّخین نے مختلف طریقے سے نقل کئے ہیں، تاریخِ طبریؒ میں ایک جگہ تو وہی الفاظ مذکور ہیں جن کا ترجمہ مولانا مودودی صاحب نے یہ کیا ہے کہ:-

اے معاویہ! تمہیں حجر کو قتل کرتے ہوئے خدا کا ذرا خوف نہ ہوا۔

لیکن خود طبریؒ ہی نے دُوسرے مقامات پر، نیز دُوسرے بیشتر مؤرّخین نے واقعہ اس طرح ذکر کیا ہے کہ جب حضرت معاویہؓ اسی سال حج کو تشریف لے گئے اور حضرت عائشہؓ سے ملاقات ہوئی تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ:-

معاویہ! حجر کے معاملے میں تمہاری بُردباری کہاں چلی گئی تھی؟

ابنِ جریر طبریؒ، ابنِ اثیر جزریؒ اور ابنِ خلدونؒ نے تو یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ:-

أين كان حلمك عن حجر.(۱)

اور حافظ ابنِ کثیرؒ یہ الفاظ نقل فرماتے ہیں:-

أين ذهب عنك حلمك يا معاوية حين قتلت حجر؟(۲)

ترجمہ:- جب تم نے حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کیا اس وقت تمہاری بُردباری کہاں گئی تھی؟

اِمام ابنِ سعدؒ اور اِمام ابنِ عبدالبرؒ یہ الفاظ نقل کرتے ہیں:-

أين عزب عنك حلم أبي سفيان في حجر وأصحابه؟

ترجمہ:- حجر اور ان کے اصحاب کے معاملے میں تم سے ابوسفیانؓ کی بُردباری کہاں چلی گئی تھی؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو الفاظ استعمال کئے ان میں ''بُردباری'' کا لفظ صاف بتارہا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے نزدیک بھی حضرت معاویہؓ کا یہ فعل ''انصاف'' یا شریعت کے خلاف نہیں تھا، زیادہ سے زیادہ وہ اسے بُردباری کے خلاف سمجھتی تھیں،

---

(۱) الطبری ج:۴ ص:۱۹۱، ابن اثیر ج:۳ ص:۱۹۴، ابن خلدون ج:۳ ص:۲۹۔

(۲) البداية والنهاية ج:۸ ص:۵۳۔

اور اب یہ بھی سن لیجئے کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ذاتی رائے حجرؓ اور ان کے اصحاب کے بارے میں کیا تھی؟ امام ابنِ عبدالبرؒ نقل فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے مذکورہ جملے کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا کہ:-

ألا حبستهم فی السجون وعرضتهم للطاعون.[1]

ترجمہ:- تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ انہیں قیدخانوں میں بند رکھتے اور انہیں طاعون کا نشانہ بننے دیتے۔

یہ تھا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک بُردباری کا زیادہ سے زیادہ تقاضا جو حجرؓ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ روا رکھی جاسکتی تھی۔ اگر حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھی بقول مولانا مودودی صاحب ''حق گوئی'' ہی کے ''مجرم'' تھے تو اس ''حق گوئی'' کی کم سے کم سزا حضرت عائشہؓ کے نزدیک بھی ''قیدخانہ'' ہی تھی۔

بہرکیف! حضرت عائشہؓ کے جواب میں حضرت معاویہؓ نے ''بُردباری'' کا جواب یہ دیا کہ: ''اُمّ المؤمنین! آپ جیسے حضرات مجھ سے دُور ہیں اور میرے پاس کوئی ایسا بُردبار آدمی نہیں رہا جو ایسے مشورے دے سکے''[2] اور جہاں تک قانونی بات تھی، آپؓ نے فرمایا کہ:-

إنما قتله الذین شهدوا علیه.[3]

ترجمہ:- قتل تو انہوں نے کیا جنھوں نے ان کے خلاف گواہی دی۔

اور فرمایا کہ:-

فما أصنع کتب إلی فیهم زیاد یشدد أمرهم ویذکر أنهم سیفتقون علی فتقا لا یرفع.[4]

ترجمہ:- میں کیا کرتا؟ زیاد نے مجھے ان کے بارے میں لکھا تھا کہ ان کا معاملہ بڑا سنگین ہے، اور اگر انہیں چھوڑ دیا گیا تو یہ

---

(۱و۲) الاستیعاب تحت الاصابۃ ج:۱ ص:۳۵۵۔

(۳) البدایۃ والنہایۃ ج:۸ ص:۵۳۔

(۴) الاستیعاب ج:۱ ص:۳۵۶۔

لوگ میری حکومت کے خلاف ایسی رخنہ اندازی کریں گے جسے بھرا نہ جاسکے گا۔

اور آخر میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہاں تک فرمایا کہ:-

غدًا لی ولحجر موقف بین یدی اللہ عزّ وجلّ.[1]

ترجمہ:- کل مجھے اور حجر دونوں کو اللہ عزّ وجل کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔

اور:-

فدعنی وحجرًا حتّٰی نلتقی عند ربنا.

ترجمہ:- لہٰذا میرے اور حجر کے معاملے کو اس وقت تک کے لئے چھوڑ دیجئے جب ہم دونوں اپنے پروردگار سے ملیں۔

رہ گئی یہ بات کہ حجر بن عدیؓ کے قتل کے وقت جو بات پیش کی گئی وہ یہ تھی کہ اگر تم حضرت علیؓ پر لعنت کرو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے، سو یہ بات علامہ طبریؒ نے ابو مخنف کی روایت سے ذکر کی ہے، اور روایۃً و درایۃً قطعی طور پر جھوٹ ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو حجر بن عدیؓ کی عبادت و زُہد کا تو بہت شہرہ ہے، کیا انہیں شریعت کا یہ معمولی مسئلہ معلوم نہیں تھا کہ حضرت علیؓ پر لعنت کرنا ایک گناہ ہے اور اگر کسی شخص کو گناہ کے ارتکاب پر اس طرح مجبور کیا جائے کہ اس کی جان خطرے میں ہو تو اس وقت اس گناہ کا ارتکاب کر کے جان بچانا واجب ہوجاتا ہے، اور عزیمت کا تقاضا ہی اس وقت یہ ہوتا ہے کہ اس گناہ کا ارتکاب کرلیا جائے۔ اور پھر اس روایت سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ گویا حجر بن عدیؓ سے سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ وہ حضرت علیؓ پر (معاذ اللہ) لعنت نہیں کرتے، حالانکہ ہم پیچھے تفصیل سے ثابت کرچکے ہیں کہ نہ حضرت معاویہؓ نے خود کبھی اس فعلِ شنیع کا ارتکاب کیا، نہ اس معاملے میں ان کے کسی ساتھی نے۔ درحقیقت حجر بن عدیؓ کی گرفتاری کا اصل سبب ان کی بغاوت اور شورش انگیزی تھی، اور کیا حضرت معاویہؓ ایسے بچے تھے کہ ایک باغی ان کے سامنے اپنی جان بچانے کے لئے زبان سے حضرت علیؓ کو بُرا بھلا کہہ دے تو وہ مطمئن ہوجائیں

(۱) البدایۃ والنہایۃ ج:۸ ص:۵۳۔

خواہ اس کی ساری عمر حضرت علیؓ کے نام پر جتھے بنانے اور حکومت کے خلاف لوگوں کو برانگیختہ کرنے میں گزری ہو؟ کیا اب حضرت معاویہؓ کے مخالفین (معاذ اللہ) انہیں عقل، تدبر اور سیاسی بصیرت سے بھی بالکل خالی قرار دیں گے؟ ابومخنف جیسے شیعہ راویوں نے حضرت علیؓ کی مذمت اور ان پر سبّ وشتم کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے گویا حضرت معاویہؓ کے نزدیک دُنیا کا سب سے اہم مسئلہ حضرت علیؓ کی مذمت تھی، اور ان کی زندگی کا اہم ترین مشن یہی تھا کہ وہ لوگوں کو حضرت علیؓ کی مذمت پر آمادہ کریں، لیکن کیا حضرت معاویہؓ کی مجموعی زندگی، ان کی سوانح، ان کے فہم و تدبر اور حلم و بُردباری کے بے شمار واقعات میں اس خسیس ذہنیت کا کوئی ادنیٰ سراغ بھی ملتا ہے؟

یہاں ہم پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ ہم نے طبری کے حوالے سے حجر بن عدیؓ کے قتل کے سلسلے میں جتنی روایات پیچھے ذکر کی ہیں ان میں سے بیشتر روایات ابومخنف ہی کی ہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ اس مقام پر ہم اس کی روایت کو قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں؟ لیکن اس اعتراض کا جواب بالکل واضح ہے، اور وہ یہ کہ ابومخنف شیعہ اور حجر بن عدیؓ کا حامی ہے، لہٰذا اُصول کا تقاضا ہے کہ ان روایات کو قبول کیا جائے جو حجر بن عدیؓ کے خلاف جاتی ہیں کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حجر بن عدیؓ کی بغاوت کے واقعات اس قدر ناقابلِ انکار تھے کہ ابومخنف ان کا پُرزور حامی ہونے کے باوجود ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوا۔ اس کے برعکس ابومخنف کی جو روایات حضرت معاویہؓ کی ذات کو مجروح کرتی ہوں، انہیں ہرگز قبول نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ حضرت معاویہؓ سے اس کی دُشمنی بالکل واضح ہے اور ان کے مقدمے کو کمزور کرکے پیش کرنا اس کی عادت میں داخل ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر ایک عیسائی مؤرّخ خود اپنے ہم مذہب لوگوں کی کوئی بُرائی بیان کرے تو آپ اسے سند کے طور پر پیش کرتے ہیں، لیکن اگر وہی مؤرّخ (معاذ اللہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے یا آپؐ کے صحابہ کرامؓ کے خلاف کوئی ایسی بات لکھے جو مسلمانوں کی روایات سے ثابت نہ ہو تو آپ اسے سراسر جھوٹ اور افتراء قرار دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے مطلب

کی باتیں چن کر بددیانتی کا ارتکاب کر رہے ہیں، بلکہ اس طرح آپ تنقیدِ روایات کے اس اُصول پر عمل کرتے ہیں جو سو فیصد معقول، فطری اور دُنیا بھر میں مُسلَّم ہے۔

سب سے آخر میں مولانا مودودی صاحب نے حضرت حسن بصریؒ کی طرف منسوب ایک قول اس طرح ذکر کیا ہے کہ:-

حضرت معاویہؓ کے چار افعال ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کا بھی ارتکاب کرے تو وہ اس کے حق میں مہلک ہو، ایک ان کا اس اُمت پر تلوار سونت لینا اور مشورے کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لینا..... دُوسرے ان کا اپنے بیٹے کو جانشین بنانا ..... تیسرے ان کا زیاد کو اپنے خاندان میں شامل کرنا..... چوتھے ان کا حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دینا۔

(خلافت وملوکیت ص:۶۵، ۶۶)

لیکن مولانا نے حضرت حسن بصریؒ کی طرف منسوب اس مقولے کا آخری جملہ نقل نہیں فرمایا، ہمارا خیال ہے کہ اس جملے سے اس روایت کا سارا بھرم کھل جاتا ہے، طبریؒ اور ابنِ اثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ حسن بصریؒ نے آخر میں یہ بھی کہا کہ:-

ویـلًا له من حجر وأصحاب حجر ويا ويلًا له من حجر وأصحاب حجر.[1]

ترجمہ:- حجر اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے معاویہؓ پر دردناک عذاب ہو، ہاں حجر اور ان کے ساتھیوں کی وجہ سے ان پر دردناک عذاب ہو۔

یہ الفاظ لکھتے وقت ہمارا قلم بھی لرز رہا تھا، مگر ہم نے یہ اس لئے نقل کر دیئے ہیں کہ ان ہی جملوں سے اس روایت کی حقیقت واضح ہوتی ہے، کیا حضرت حسن بصریؒ سے کسی بھی درجے میں یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اس بے دردی اور بے باکی کے ساتھ حضرت معاویہؓ کی شان میں یہ الفاظ استعمال کئے ہوں گے؟ مولانا

---

(۱) ابن اثیر ج:۳ ص:۱۹۳، طبع قدیم، طبری ج:۴ ص:۲۰۸۔

مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر اعتراضات کی خواہ کتنی بھرمار کی ہو لیکن ان پر لعن طعن کرنے کو انہوں نے خود بھی ''ظلم'' اور ''زیادتی'' قرار دیا ہے، کیا حضرت حسن بصریؒ سے اس ظلمِ عظیم کی توقع کوئی ایسا شخص کرسکتا ہے جو ان سے واقف ہو؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت بھی ابومخنف کی ہے، (ملاحظہ ہو: طبری) اور یہ بلاشبہ حضرت حسن بصریؒ پر اس کا بہتان وافتراء ہے جسے کسی حال دُرست تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

یہ حضرت حسن بصریؒ تو وہ ہیں کہ مشاجراتِ صحابہؓ کے بارے میں مشہور اور مستند مفسر علامہ قرطبیؒ نے ان کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ:۔

وقد سئل الحسن البصری عن قتالهم فقال: قتال شهده أصحاب محمد صلی الله علیه وسلم وغبنا، وعلموا وجهلنا، واجتمعوا فاتبعنا، واختلفوا فوقفنا، قال المحاسبی: فنحن نقول کما قال الحسن.[1]

ترجمہ:۔ اور حضرت حسن بصریؒ سے صحابہؓ کی باہمی جنگ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ: یہ ایسی لڑائی تھی جس میں صحابہؓ موجود تھے اور ہم غائب، وہ سب حالات سے واقف تھے، ہم ناواقف ہیں، جس چیز پر ان کا اتفاق ہے، ہم اس میں ان کی اتباع کرتے ہیں، اور جس میں اختلاف ہوگیا، اس میں توقف اور سکوت اختیار کرتے ہیں۔ حضرت محاسبیؒ نے فرمایا کہ: ہم بھی وہی بات کہتے ہیں جو حسن بصریؒ نے کہی۔

غور فرمایئے کہ جو حسن بصریؒ، صحابہؓ کی باہمی لڑائیوں میں کسی ایک کی طرف اجتہادی غلطی منسوب کرنے میں بھی تأمل کرتے ہوں، وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو عذابِ جہنم کی بددُعا دے کر یہ بات آخر کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے چار کام ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک ان کی ہلاکت کے لئے کافی ہے؟ نعوذ باللہ منہ!

---

(۱) القرطبیؒ: الجامع لأحکام القرآن ج:۱۶ ص:۳۲۲۔

# حضرت معاویہؓ کے زمانے میں اظہارِ رائے کی آزادی

حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ اعتراض کہ ان کے دور میں اظہارِ رائے کی آزادی کا خاتمہ ہوگیا تھا، ان پر اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ ہم یہاں چند واقعات مختصراً ذکر کرتے ہیں جن سے اس بات کا اندازہ ہوسکے گا۔

۱۔ حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ اپنے کسی کام سے حضرت معاویہؓ کے پاس تشریف لے گئے، وہ خود فرماتے ہیں کہ جب میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا: ''مسور! آپ ائمہ (اُمراء) پر جو طعن کیا کرتے ہیں اس کا کیا حال ہے؟''

میں نے کہا: ''اس وقت اس بات کو رہنے دیجئے اور جس کام کے لئے ہم آئے ہیں، اس میں ہمارے ساتھ نیک سلوک کیجئے''

مگر حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ: ''نہیں، آپ مجھے اپنے دِل کی ساری باتیں بتائیے'' حضرت مسورؓ فرماتے ہیں کہ اس پر میں جتنے عیب ان پر لگایا کرتا تھا وہ سب بیان کردیئے، ایک نہیں چھوڑا، حضرت معاویہؓ نے سن کر فرمایا: ''گناہوں سے کوئی بَری نہیں، کیا آپ اپنے اندر ایسے گناہ محسوس نہیں کرتے جن کے بارے میں آپ کو یہ خوف ہو کہ اگر اللہ نے انہیں معاف نہ فرمایا تو آپ کو ہلاک کردیں گے؟''

میں نے عرض کیا: ''ہاں! میرے بھی ایسے گناہ ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہ فرمائے تو میں ان کے سبب سے ہلاک ہوجاؤں۔'' حضرت معاویہؓ نے فرمایا: ''پھر کیا وجہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو مجھ سے زیادہ مغفرت کا مستحق سمجھتے ہیں؟ خدا کی قسم! میں عوام کی اصلاح حدودِ شرعیہ کی اقامت اور جہاد فی سبیل اللہ کی جن خدمات میں مشغول ہوں، وہ ان عیوب سے زیادہ ہیں جو آپ نے بیان کئے، اور میں ایک ایسے

دِین کا پیروکار ہوں جس میں خدا حسنات کو قبول فرماتا اور سیئات سے درگزر فرماتا ہے۔"

اس کے بعد حضرت معاویہؓ نے فرمایا:-

واللہ علٰی ذٰلک ما کنت لأخیر بین اللہ وغیرہ إلا اخترت اللہ علٰی غیرہ مما سواہ.

ترجمہ:- اس کے علاوہ خدا کی قسم! جب بھی مجھے اللہ اور غیر اللہ کے درمیان اختیار ملتا ہے، میں اللہ کے سوا اور کسی کو اختیار کرنے والا نہیں ہوں۔

حضرت مسور بن مخرمہؓ فرماتے ہیں کہ: "ان کے ارشادات پر میں غور کرتا رہا تو مجھے پتہ چلا کہ انہوں نے واقعۃً دلائل میں مجھے مغلوب کر دیا۔" راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت مسور رضی اللہ عنہ جب بھی حضرت معاویہؓ کا ذکر کرتے تو ان کے حق میں دُعائے خیر فرماتے۔[1]

۲- حافظ ابنِ کثیرؒ نقل فرماتے ہیں کہ: ایک شخص نے حضرت معاویہؓ کو ان کے منہ پر بہت بُرا بھلا کہا اور ان کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آیا، کسی نے کہا کہ: "آپ اس پر حملہ کیوں نہیں کرتے؟" حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ:-

إنی لأستحیی من اللہ أن یضیق حلمی عن ذنب أحد من رعیتی.[2]

ترجمہ:- مجھے اللہ سے اس بات پر شرم آتی ہے کہ میری بُردباری میری رعایا کے کسی گناہ سے تنگ ہو جائے۔

۳- ابنِ خلدونؒ نقل فرماتے ہیں کہ: ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے حضرت عدیؓ بن حاتم کو چھیڑا اور مذاق میں انہیں حضرت علیؓ کا ساتھ دینے پر توبیخ کی، اس کے جواب میں حضرت عدیؓ نے فرمایا: "خدا کی قسم! جن دِلوں سے ہم نے تمہیں بُرا

---

(۱) یہ واقعہ حافظ ابنِ کثیرؒ نے مصنف عبدالرزاق کے حوالے سے دو سندوں کے ساتھ ذکر فرمایا ہے (البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۴)۔

(۲) البدایہ ج:۸ ص:۱۳۵۔

سمجھا تھا وہ ابھی ہمارے سینوں میں ہیں، اور جن تلواروں سے تمہارا مقابلہ کیا تھا، وہ ابھی ہمارے کاندھوں پر لٹکی ہوئی ہیں، اور اب اگر تم غدر کی طرف ایک بالشت بڑھے تو ہم جنگ کی طرف دو ہاتھ بڑھ جائیں گے، اور یاد رکھنا کہ ہمیں اپنی شہ رگ کٹنے کی آواز اور سینے سے نکلنے والی موت کی سسکیاں زیادہ محبوب ہیں، بہ نسبت اس کے کہ ہم علیؓ کے بارے میں کوئی بُری بات سنیں۔"

حضرت معاویہؓ نے یہ سن کر لوگوں سے فرمایا: "یہ ساری باتیں حق ہیں، انہیں لکھ لو" اس کے بعد وہ دیر تک حضرت عدیؓ سے باتیں کرتے رہے۔[1]

۴- عبداللہ بن عمیر فرماتے ہیں کہ: ایک شخص نے حضرت معاویہؓ کو بہت دیر تک سخت سست کہا، حضرت معاویہؓ خاموش رہے تو لوگوں نے کہا: "کیا آپ اس پر بھی بُردباری کا مظاہرہ فرمائیں گے؟" حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ: "میں لوگوں اور ان کی زبانوں کے درمیان حائل نہیں ہونا چاہتا، اِلّا یہ کہ وہ ہماری حکومت کے درمیان حائل ہونے لگیں"۔[2] یعنی بغاوت پر آمادہ ہو جائیں۔

۵- ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنر زیاد کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ:-

لوگوں کے ساتھ ہمیشہ ایک جیسا طرزِ عمل اختیار کرنا ٹھیک نہیں، نہ اتنی نرمی کرنی چاہئے کہ وہ اِترا جائیں اور نہ اتنی سختی کہ وہ لوگوں کو ہلاکت میں ڈال دے، بلکہ ایسا کرو کہ سختی کے لئے تم کافی ہو جاؤ اور رحمت و اُلفت کے لئے میں، تاکہ اگر کوئی شخص خوف کی حالت میں ہو تو اسے داخل ہونے کے لئے ایک دروازہ مل جائے۔[3]

۶- علامہ ابنِ اثیرؒ نقل فرماتے ہیں کہ: عبدالرحمٰن بن الحکم ایک شاعر تھا،

---

(۱) ابنِ خلدونؒ ج:۳ ص:۷۔

(۲) ابنِ اثیرؒ ج:۴ ص:۵۔

(۳) البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۶۔

شاعروں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اُمراء کی مدح میں قصیدے کہا کرتے ہیں، حضرت معاویہؓ نے ان سے فرمایا:-

مدح سے بچو، اس لئے کہ وہ بے حیاؤں کی غذا ہے۔[(۱)]

۷- طبرانیؒ اور حافظ ابنِ عساکرؒ نقل فرماتے ہیں کہ: ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے، خطبے میں ''فرار من الطاعون'' کی حدیث ذکر فرمائی، اس میں کوئی فروگزاشت ہوگئی تو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خطبے کے بیچ ہی میں کھڑے ہوکر فرمایا:-

تمہاری ماں ہندہ تم سے زیادہ عالم تھی۔

حضرت معاویہؓ نے نماز کے بعد حضرت عبادہؓ کو بلاکر اس طرزِ کلام پر تو زبانی تنبیہ فرمائی مگر جب ان سے تحقیق ہوگئی کہ حدیث اسی طرح ہے جس طرح حضرت عبادہؓ نے بیان فرما رہے تھے، تو عصر کی نماز کے بعد منبر سے خود اعلان فرمایا کہ:-

میں نے تم سے منبر پر ایک حدیث ذکر کی تھی، گھر جاکر پتہ چلا کہ حدیث اسی طرح ہے جس طرح عبادہؓ کہتے ہیں، لہٰذا انہی سے استفادہ کرو، کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ فقیہ ہیں۔[(۲)]

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے عہدِ حکومت کی ایک تصویر یہ ہے جو ان جیسے[(۳)] بے شمار واقعات سے سامنے آتی ہے، مگر مولانا مودودی صاحب ان کے عہدِ حکومت کی منظر کشی اس طرح فرماتے ہیں کہ:-

---

(۱) ابنِ اثیر ج:۴ ص:۵۔

(۲) ابنِ عساکرؒ ج:۷ ص:۲۱۰ و ۲۱۱، ''عبادۃ بن الصامت''۔

(۳) مذکورہ سات واقعات ہم نے بغیر کسی خاص جستجو کے سرسری طور سے لکھ دیئے ہیں، ورنہ اس قسم کے واقعات جو یہ مضمون لکھتے وقت ہماری نظر سے گزرے ہیں، اتنے زیادہ ہیں کہ بلامبالغہ ان سے ایک کتاب تیار ہوسکتی ہے، اسی لئے ابنِ خلدونؒ فرماتے ہیں کہ: ''وأخبارہ فی الحلم کثیرۃ'' (ان کی بُردباری کے واقعات بہت ہیں)۔

ضمیروں پر قفل چڑھا دیئے گئے، زبانیں بند کردی گئیں، اب قاعدہ یہ ہوگیا کہ منہ کھولو تو تعریف کے لئے کھولو، ورنہ چپ رہو، اور اگر تمہارا ضمیر ایسا ہی زوردار ہے کہ تم حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تو قید اور قتل اور کوڑوں کی مار کے لئے تیار ہوجاؤ، چنانچہ جو لوگ بھی اس دور میں حق بولنے اور غلط کاریوں پر ٹوکنے سے باز نہ آئے ان کو بدترین سزائیں دی گئیں تاکہ پوری قوم دہشت زدہ ہوجائے۔ (ص: ۱۶۳، ۱۶۴)

اور اس عمومی منظرکشی کی دلیل کیا ہے؟ صرف ایک حجر بن عدیؓ کا واقعہ جس کی حقیقت پوری تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے آچکی ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی قبر کو نور سے بھردے، ان کے درجات کی بلندی کے لئے اللہ تعالیٰ کیسے کیسے سامان مہیا فرما رہے ہیں؟

## یزید کی ولی عہدی کا مسئلہ

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک مشہور اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے یزید کو اپنا ولی عہد نامزد کیا، چنانچہ جناب مولانا مودودی صاحب نے بھی یہ اعتراض کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ کام خالص اپنے مفاد کے لئے کیا تھا، وہ لکھتے ہیں:-

یزید کی ولی عہدی کے لئے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی، بلکہ ایک بزرگ (حضرت مغیرہ بن شعبہؓ) نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے دُوسرے بزرگ (حضرت معاویہؓ) کے ذاتی مفاد سے اپیل کرکے اس تجویز کو جنم دیا اور دونوں صاحبوں نے اس بات سے قطع نظر کرلیا کہ وہ اس طرح اُمتِ محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں۔ (خلافت و ملوکیت ص: ۱۵۰)

اس کے بعد انہوں نے ابنِ اثیرؒ وغیرہ کی مختلف روایات سے یہ ثابت

کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کے لئے بیعت لینے میں جبر و اکراہ، خوف و طمع اور رِشوت کے ذرائع سے کھلم کھلا کام کیا۔

اس موضوع پر اپنی گفتگو شروع کرنے سے قبل ہم ابتداء ہی میں یہ بات صاف کر دینا چاہتے ہیں کہ یہاں دو مسئلے الگ الگ ہیں:-

۱- حضرت معاویہؓ کا یزید کو ولی عہد بنانا رائے، تدبیر اور نتائج کے اعتبار سے صحیح تھا یا غلط؟

۲- دُوسرے یہ کہ حضرت معاویہؓ نے یہ کام نیک نیتی کے ساتھ جوازِ شرعی کی حدود میں رہ کر کیا تھا یا خالص اپنے ذاتی مفاد کے لئے حدود اللہ کو پامال کر کے؟

جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے اس میں ہمیں مولانا مودودی صاحب سے اختلاف نہیں ہے، جمہور اُمت کے محقق علماء ہمیشہ یہ کہتے آئے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فعل رائے اور تدبیر کے درجے میں نفس الامری طور پر دُرست ثابت نہیں ہوا اور اس کی وجہ سے اُمت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچا، لہٰذا اگر مولانا مودودی صاحب اپنی بحث کو اسی حد تک محدود رکھتے تو ہمیں اس پر گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

البتہ مولانا سے ہمارا اختلاف دُوسرے مسئلے میں ہے، مولانا نے حضرت معاویہؓ کے اس اقدام کو محض رائے اور تدبیر کے اعتبار سے غلط قرار دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ براہِ راست حضرت معاویہؓ کی نیت پر تہمت لگا کر اس بات پر اصرار فرمایا ہے کہ ان کے پیشِ نظر بس اپنا ذاتی مفاد تھا، اور اس ذاتی مفاد پر انہوں نے پوری اُمت کو قربان کر دیا۔

جمہور اُمت کا موقف اس معاملے میں یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو بلحاظ تدبیر و رائے تو غلط کہا جاسکتا ہے لیکن ان کی نیت پر حملہ کرنے اور ان پر مفاد پرستی کا الزام عائد کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، لہٰذا ہماری آئندہ گفتگو کا حاصل یہ نہیں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اقدام واقعے کے اعتبار سے سو فیصد دُرست اور نفس الامر میں بالکل صحیح تھا یا انہوں نے جو کچھ کیا وہ بالکل ٹھیک کیا، بلکہ

ہماری گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ وہ اپنے اس اقدام میں نیک نیت تھے، انہوں نے جو کچھ کیا وہ نیک نیتی کے ساتھ اور شرعی جواز کی حدود میں رہ کر کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یزید کی ولی عہدی اور خلاف کا مسئلہ ہمارے زمانے میں بڑی نازک صورت اختیار کر گیا ہے، اس مسئلے پر بحث و مباحثے کی گرم بازاری نے مسلمانوں میں دو ایسے گروہ پیدا کر دیئے ہیں جو اِفراط و تفریط کی بالکل آخری حدود پر کھڑے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو یزید کو کھلا فاسق و فاجر قرار دے کر حضرت معاویہؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر مفاد پرستی، خود غرضی، رِشوت ستانی اور ظلم و عدوان کے الزامات عائد کر رہا ہے، دُوسری طرف ایک گروہ ہے جو یزید کو فرشتہ قرار دے کر حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جیسے جلیل القدر صحابہ کو ہوسِ اقتدار، جاہ طلبی اور انتشار پسندی کا مجرم بنا رہا ہے، اور جمہور اُمت نے اعتدال کا جو راستہ اختیار کیا تھا، وہ مناظرے کے جوش و خروش میں دونوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔

اس اِفراط و تفریط کی ساری وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے باہمی اختلافات کو موجودہ زمانے کی سیاسی پارٹیوں کے اختلافات پر قیاس کر لیا گیا ہے، اور چونکہ آج کی مفاد پرست دُنیا میں یہ تصوّر مشکل ہی سے آتا ہے کہ دو مخالف سیاسی جماعتیں بیک وقت نیک نیتی کے ساتھ کسی صحیح، جائز اور نیک مقصد کے لئے ایک دُوسرے سے لڑ سکتی ہیں، اس لئے صحابہ کرامؓ کی جماعتوں کے بارے میں بھی یہ تصوّر کرنا مذکورہ گروہوں کو مشکل نظر آتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ وہ سرسری طور پر کسی ایک جماعت کے برحق اور نیک نیت ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں، اور یہ فیصلہ ذہن میں جما کر اس کی تائید و حمایت کے لئے دلائل تلاش کرتے ہیں، اور اس سلسلے میں دُوسرے فریق کے صحیح موقف کو سمجھنے کی کوشش کئے بغیر اس پر الزامات و اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دیتے ہیں۔

ہم دونوں فریقوں کو سرکارِ دو عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرف توجہ دِلاتے ہیں جو جمعہ کے دن ہر خطبے میں دُہرایا جاتا ہے کہ:-

اللہ اللہ فی أصحابی، لا تتخذوھم غرضًا من بعدی۔

ترجمہ:- میرے صحابہ کے معاملے میں خدا سے ڈرو، خدا سے ڈرو، میرے بعد انہیں (اعتراضات) کا نشانہ مت بنانا۔

ہم سیّد الاوّلین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کا واسطہ دے کر یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ صحابہ کرامؓ کی عظمتِ شان کو پیشِ نظر رکھ کر ان کے صحیح موقف کو ٹھنڈے دِل کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کریں، اور دِل سے بدگمانیوں کا غبار دھوکر اس مسئلے پر غور فرمائیں۔

اس دردمندانہ گزارش کے بعد ہم اس مسئلے میں اپنے مطالعے کا حاصل پیش کرتے ہیں۔

یہاں تین چیزیں قابلِ غور ہیں:-

۱- ولی عہد بنانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۲- یزید خلافت کا اہل تھا یا نہیں؟

۳- ان روایات کی کیا اصلیت ہے جن میں یزید کی بیعت کے لے خوف و طمع کے ذرائع سے کام لینے کا ذکر کیا گیا ہے؟

ہم مسئلے کے ان تینوں گوشوں پر مختصر گفتگو کرتے ہیں۔

## ولی عہد بنانے کی شرعی حیثیت

یہاں دو مسئلے قابلِ تحقیق ہیں: ایک یہ کہ کوئی خلیفۂ وقت اپنے بعد کے لئے کسی کو، خاص طور سے اپنے کسی رشتہ دار کو اپنا ولی عہد بنادے تو اس کی یہ وصیت اُمت پر لازم ہوجاتی ہے یا اس کی وفات کے بعد اہلِ حل وعقد کی منظوری کی پابند رہتی ہے؟

جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے، اس بات پر اُمت کا اجماع منعقد ہوچکا ہے کہ خلیفۂ وقت اگر کسی شخص میں نیک نیتی کے ساتھ شرائطِ خلافت پاتا ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کو ولی عہد بنادے، خواہ وہ اس کا باپ، بیٹا یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، البتہ بعض علماء نے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر وہ اس کا باپ یا بیٹا ہو تو اہلِ حل وعقد

کے مشورے کے بغیر ولی عہد بنانا بھی جائز نہیں ہے۔(۱)

رہا دُوسرا مسئلہ تو اس میں علامہ ماوردیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور ابنِ خلدونؒ کے بیانات سے تو بڑے توسعات معلوم ہوتے ہیں، ان کا رُجحان اس طرف ہے کہ اگر کوئی خلیفہ کسی ایسے شخص کو ولی عہد بنادے جس میں خلافت کی اہلیت ہو تو اس کی وصیت ساری اُمت پر لازم ہوجاتی ہے، اور اس کا نفاذ اہلِ حل وعقد کی مرضی پر موقوف نہیں ہوتا، لیکن علمائے محققین کی رائے یہی ہے کہ ولی عہد بنانے کی حیثیت ایک تجویز کی سی ہوتی ہے، اور جب تک اُمت کے اربابِ حل وعقد اسے منظور نہ کرلیں، یہ تجویز اُمت پر واجب العمل نہیں ہوتی، خواہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ کی گئی ہو، بلکہ اُمت کے اربابِ حل وعقد کو حق ہوتا ہے کہ وہ چاہیں تو باہمی مشورے سے اس تجویز کو قبول کریں اور چاہیں تو رَدّ کردیں، اسلامی سیاست کے مشہور عالم اور مصنف قاضی ابویعلیٰ الفراء الحنبلیؒ (متوفی ۴۵۸ھ) تحریر فرماتے ہیں:-

> خلیفہ کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے بعد کے لئے کسی شخص کو ولی عہد بنائے اور اس معاملے میں اہلِ حل وعقد کی موجودگی کوئی ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو ولی عہد بنایا، اور حضرت عمرؓ نے چھ صحابہ کرامؓ کو یہ فریضہ سپرد کیا، اور سپرد کرتے وقت کسی نے بھی اہلِ حل وعقد کی موجودگی کو ضروری نہیں سمجھا۔ اس کی عقلی وجہ یہ ہے کہ کسی کو ولی عہد بنانا اس کو خلیفہ بنانا نہیں ہے، ورنہ ایک ہی زمانے میں دو خلفاء کا اجتماع لازم آجائے گا جو جائز نہیں ہے، اور جب یہ خلافت کا عقد نہیں ہے تو اہلِ حل وعقد کی موجودگی بھی ضروری نہیں، ہاں! ولی عہد

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ج:۱ ص:۵، مطبع صدیقی، بریلی ۱۳۸۶ھ، والأحکام السلطانیۃ للماوردی ص:۸، المطبعۃ المحمودیۃ، مصر، الأحکام السلطانیۃ لأبی یعلیٰ الفراء ص:۹، مصطفی البابی، مصر ۱۳۵۶ھ، مقدمۃ ابن خلدون ص:۳۷۶ و ۳۷۷، دار الکتاب اللبنانی، بیروت ۱۳۵۶ھ۔

بنانے والے کی وفات کے بعد ان کی موجودگی ضروری ہے۔

چند سطروں کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

خلیفہ کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو ولی عہد بنائے جو اس کے ساتھ باپ یا بیٹے کا رشتہ رکھتا ہو، بشرطیکہ وہ خلافت کی شرائط کا حامل ہو، اس لئے کہ خلافت محض ولی عہد بنانے سے منعقد نہیں ہوجاتی بلکہ مسلمانوں کے قبول کرنے سے منعقد ہوتی ہے، اور اس وقت ہر تہمت دُور ہوجاتی ہے۔[۱]

محقق علماء کے نزدیک صحیح بات یہی ہے کہ اگر خلیفۂ وقت تنہا اپنی مرضی سے کسی کو ولی عہد بنادے تو اس کے لئے یہ تو جائز ہے، لیکن اس کا یہ فیصلہ ایک تجویز کی حیثیت رکھتا ہے جسے اُمت کے اہلِ حل وعقد اس کی وفات کے بعد قبول بھی کرسکتے ہیں اور ردّ بھی۔ دلائل کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے، مختصر یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو ولی عہد تو بلاشبہ بنایا تھا، لیکن بنانے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی اہلِ شوریٰ سے استصواب فرمایا اور جب دیکھا کہ تمام لوگ ان پر متفق ہیں تب اپنے فیصلے کا اعلان فرمایا۔[۲] نیز ان کی وفات کے بعد بھی اُمت ان پر متفق ہوگئی۔

اس تفصیل سے دو باتیں بہرحال واضح ہوجاتی ہیں:۔

۱۔ اگر کوئی خلیفۂ وقت نیک نیتی کے ساتھ اپنے بیٹے کو خلافت کا اہل سمجھتا ہے تو وہ اسے اپنا ولی عہد مقرّر کرسکتا ہے، یہ بات علماء کے ان دونوں گروہوں کے نزدیک متفق علیہ ہے جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔

---

(۱) ابو یعلٰی الفراء: الأحکام السلطانیة ص:۹، مصطفی البابی الحلبی، مصر ۱۳۵۶ھ، عبارت یہ ہے: "ویجوز أن یعهد إلٰی من ینتسب إالیه بأبوّة أو بنوة إذا کان المعهود لهٗ علٰی صفات الأئمة لأن الإمامة لا تنعقد للمعهود إلیه بنفس العهد وإنما تنعقد بعهد المسلمین والتهمة تنتفی عنده"۔

(۲) ملاحظہ ہو: الطبری ج:۲ ص:۶۱۸، والإمامة والسیاسة لابن قتیبة ص:۱۹ و۲۰، مصطفی البابی، مصر ۱۳۵۶ھ۔

۲۔ علمائے محققین کے نزدیک بیٹے کو ولی عہد بنانے کے لئے اربابِ حل و عقد سے مشورہ کرنا اور ان کا منظور کرنا ضروری ہے، اس کے بغیر اس کی خلافت منعقد نہیں ہوتی، اور یہی قول صحیح و مختار ہے، البتہ ایک جماعت اس بات کی بھی قائل رہی ہے کہ خلیفۂ وقت تنہا اپنی مرضی سے اپنے بیٹے کو ولی عہد بنا سکتا ہے، اس سلسلے میں اہلِ حل و عقد کی منظوری کی بھی ضرورت نہیں ہے، اور اس کی وصیت تمام اُمت پر لازم ہو جاتی ہے۔

اب یزید کی ولی عہدی کے مسئلے پر غور فرمائیے، مندرجہ بالا اَحکام کی روشنی میں یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اگر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دیانت داری سے اپنے بیٹے یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے تو اسے ولی عہد بنا دینا شرعی اعتبار سے بالکل جائز تھا۔ اگر وہ یہ کام پوری اُمت کے مشورے سے کرتے تب تو باتفاق ان کا یہ فیصلہ ہر فرد کے لئے واجب الاتباع ہوتا، اور اگر تنہا اپنی رائے سے کرتے تو ان کے فعل کی حد تک تو یہ فیصلہ باتفاق جائز تھا اور علماء کے ایک گروہ کے نزدیک اُمت کے لئے واجب العمل بھی تھا، لیکن علماء کے راجح قول کے مطابق اس سے اہلِ حل و عقد کی منظوری کے بغیر یزید کی خلافت منعقد نہیں ہو سکتی تھی۔

اب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کو خلافت کا اہل سمجھ کر ولی عہد بنایا تھا یا محض اپنا بیٹا ہونے کی وجہ سے؟

## کیا حضرت معاویہؓ یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے؟

واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پوری دیانت داری اور نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھتے تھے کہ یزید خلافت کا اہل ہے۔ متعدّد تواریخ میں منقول ہے کہ حضرت عثمانؓ کے صاحبزادے حضرت سعید بن عثمانؓ نے آکر حضرت معاویہؓ سے شکایت کی کہ: ”آپ نے یزید کو ولی عہد بنا دیا ہے، حالانکہ میرا باپ اس کے باپ سے، میری ماں اس کی ماں سے اور خود میں اس سے افضل ہوں۔“ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ: ”خدا کی قسم! تمہارے والد مجھ سے بہتر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے

زیادہ قریب تھے، تمہاری ماں بھی یزید کی ماں سے افضل ہے، لیکن جہاں تک یزید کا تعلق ہے، اگر سارا غوطہ تم جیسے آدمیوں سے بھر جائے تو بھی یزید تم سے بہتر اور زیادہ محبوب ہوگا۔" حضرت معاویہؓ کے یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ وہ کسی ذاتی برتری کے تصوّر یا رشتے کی بناء پر یزید کو افضل نہیں سمجھ رہے تھے بلکہ ان کی دیانت دارانہ رائے یہی تھی۔ اس کے علاوہ متعدّد تواریخ میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک خطبے میں یہ دُعا فرمائی کہ:-

اللّٰهم إن كنت تعلم أنى وليته لأنه فيما أراه أهل لذلك فأتمم له ما وليته وإن كنت وليته لأنى أحبه فلا تتم له ما وليته.[1]

ترجمہ:- اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے اسے (یزید کو) اس لئے ولی عہد بنالیا ہے کہ وہ میری رائے میں اس کا اہل ہے تو اس ولایت کو اس کے لئے پورا فرمادے، اور اگر میں نے اس لئے اس کو ولی عہد بنایا ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے تو اس ولایت کو پورا نہ فرما۔

اور حافظ شمس الدین ذہبیؒ اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے عطیہ بن قیس کے حوالے سے اس دُعا کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں:-

اللّٰهم إن كنت عهدت ليزيد لما رأيت من فضله فبلغه ما أملت وأعنه وإن كنت أنما حملنى حب الوالد لولده وأنه ليس لما صنعت به أهلًا فاقبضه قبل أن يبلغ ذٰلك.[2]

ترجمہ:- اے اللہ! اگر میں نے یزید کو اس کی فضیلت دیکھ کر ولی عہد بنایا ہے تو اسے اس مقام تک پہنچادے جس کی میں نے اس

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۸۰۔

(۲) الذہبیؒ: تاریخ الاسلام وطبقات المشاهير والاعلام ج:۲ ص:۲۶۷، مکتبۃ القدسی، القاہرۃ ۱۳۶۸ھ، و السیوطیؒ: تاریخ الخلفاء ص:۱۵۷، اصح المطابع کراچی ۱۳۷۸ھ۔

کے لئے اُمید کی ہے، اور اس کی مدد فرما۔ اور اگر مجھے اس کام پر
صرف اس محبت نے آمادہ کیا ہے جو باپ کو بیٹے سے ہوتی ہے تو
اس کے مقامِ خلافت تک پہنچنے سے پہلے اس کی رُوح قبض کر لے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جس باپ کے دِل میں چور ہو، کیا وہ جمعہ کے دن مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر قبولیت کی گھڑی میں اپنے بیٹے کے لئے ایسی دُعا کر سکتا ہے؟ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس پُرخلوص دُعا کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ انہوں نے یزید کو نا اہل سمجھنے کے باوجود محض بیٹا ہونے کی وجہ سے خلافت کے لئے نامزد کیا تھا تو یہ اتنا بڑا تحکم ہے جس کے لئے بڑے دِل گردے کی ضرورت ہے۔ کسی شخص کی نیت پر حملہ کرنا زندگی میں بھی شریعت نے جائز قرار نہیں دیا، چہ جائیکہ اس کی وفات کے ساڑھے تیرہ سو برس بعد اس ظلم کا ارتکاب کیا جائے۔

یزید کی جو مکروہ تصویر عموماً ذہنوں میں بسی ہوئی ہے، اس کی بنیادی وجہ کربلا کا المناک حادثہ ہے، ایک مسلمان کے لئے واقعۃً یہ تصوّر کرنا مشکل ہے کہ جس شخص پر کسی نہ کسی درجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب نواسے کے قتل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اسے صالح اور خلافت کا اہل قرار دیا جائے۔ لیکن اگر حقیقتِ حال کی واقعی تحقیق مقصود ہو تو اس معاملے میں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ جس وقت یزید کو ولی عہد بنایا جا رہا تھا، اس وقت حادثۂ کربلا واقع نہیں ہوا تھا اور کوئی شخص یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یزید کی حکومت میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیا جائے گا۔ اس وقت یزید کی شہرت جھوٹوں کو بھی اس حیثیت سے نہیں تھی جس حیثیت سے آج ہے۔ اس وقت تو وہ ایک صحابی اور ایک خلیفۂ وقت کا صاحبزادہ تھا۔ اس کے ظاہری حالات، صوم وصلوٰۃ کی پابندی، اس کی دُنیوی نجابت اور اس کی انتظامی صلاحیت کی بناء پر یہ رائے قائم کرنے کی پوری گنجائش تھی کہ وہ خلافت کا اہل ہے، اور صرف یہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے نہیں تھی، بلکہ بہت سے دُوسرے جلیل القدر صحابہؓ اور تابعینؒ بھی یہ رائے رکھتے تھے۔ دُوسری صدی ہجری کے مشہور مورّخ علامہ بلاذریؒ، مورّخ بدائنی کے حوالے سے اِمام المفسّرین

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ نقل کرتے ہیں:-

قال عامر بن مسعود الجمحي: أنا بمكة إذ مر بنا بريد ينعى معاوية فنهضنا إلى ابن عباس وهو بمكة وعنده جماعة وقد وضعت المائدة ولم يؤت بالطعام، فقلنا له: يا ابن عباس! جاء البريد بموت معاوية، فوجم طويلًا ثم قال: اللّٰهم أوسع لمعاوية، أما والله! ما كان مثل من قبله ولا يأتي بعده مثله وإن ابنه يزيد لمن صالحي أهله، فألزموا مجالسكم وأعطوا طاعتكم وبيعتكم.(۱)

ترجمہ:- عامر بن مسعود جمحی کہتے ہیں کہ: جب ایک قاصد حضرت معاویہؓ کی وفات کی خبر لے کر آیا تو ہم مکہ مکرّمہ میں تھے، ہم اُٹھ کر حضرت ابنِ عباسؓ کے پاس چلے گئے، وہ بھی مکہ ہی میں تھے، ان کے پاس کچھ لوگ بیٹھے تھے اور دسترخوان بچھ چکا تھا مگر ابھی کھانا نہیں آیا تھا، ہم نے ان سے کہا کہ: اے ابنِ عباس! قاصد حضرت معاویہؓ کی موت کی خبر لے کر آیا ہے، اس پر وہ کافی دیر خاموش بیٹھے رہے، پھر انہوں نے کہا کہ: یا اللہ! حضرت معاویہؓ کے لئے اپنی رحمت کو وسیع فرمادے، خدا کی قسم! وہ اپنوں سے پہلوں کی طرح نہیں تھے، اور ان کے بعد ان جیسا نہیں آئے گا، اور بلاشبہ ان کا بیٹا یزید ان کے صالح اہلِ خانہ میں سے ہے، لہٰذا تم اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہو اور اپنی طاعت اور بیعت اسے دے دو۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت محمد بن حنفیہؒ کے بارے میں حافظ ابنِ کثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ فتنۂ حرہ کے موقع پر عبداللہ بن مطیع اور ان کے ساتھی حضرت محمد بن حنفیہؒ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ: ”یزید شراب پیتا ہے اور

(۱) البلاذریؒ: أنساب الأشراف ص:۳ و۴، قسم:۲، یروشلم ۱۹۴۰ء۔

نماز چھوڑتا ہے اور کتاب اللہ کے اَحکام سے تجاوز کرتا ہے'' اس کے جواب میں حضرت محمد بن حنفیہؒ نے فرمایا:-

قد حضرته وأقمت عنده فرأيته مواظبًا على الصلاة متحريا للخير يسأل عن الفقه ملازمًا للسُّنّة.

ترجمہ:- میں اس کے پاس گیا ہوں اور ٹھہرا ہوں، میں نے اس کو نماز کا پابند اور خیر کا طالب پایا، وہ فقہ کے مسائل پوچھتا ہے اور سنت کا پابند ہے۔

انہوں نے کہا کہ: ''یزید نے آپ کے سامنے تصنّعاً ایسا کیا ہوگا'' حضرت محمد بن حنفیہؒ نے فرمایا کہ: ''اسے مجھ سے کون سا خوف یا کون سی اُمید تھی؟ اور کیا اس نے تمہیں خود بتایا ہے تو تم بھی اس کے شریک ہوگے، اور اگر اس نے تمہیں نہیں بتایا تو تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ بغیر علم کے شہادت دو۔'' انہوں نے کہا کہ: ''اگرچہ ہم نے دیکھا نہیں لیکن ہم اس خبر کو سچ سمجھتے ہیں'' حضرت محمد بن حنفیہؒ نے فرمایا: ''اللہ نے شہادت دینے والوں کے لئے ایسی بات کہنے کو جائز قرار نہیں دیا، قرآن کا ارشاد ہے: إلّا من شهد بالحق فهم يعلمون ۔ لہٰذا مجھے تمہارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے'' انہوں نے کہا: ''شاید آپ یہ بات پسند نہیں کرتے کہ اس معاملے (یزید کے خلاف بغاوت) کی سرداری آپ کے سوا کسی اور کو ملے، لہٰذا ہم آپ ہی کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں'' حضرت محمدؒ نے فرمایا کہ: ''میں قتال کو نہ تابع ہوکر حلال سمجھتا ہوں نہ قائد بن کر''۔ [1]

ان روایات سے یہ بات واضح ہے کہ یزید کے ظاہری حالات ایسے تھے کہ ان کی موجودگی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جیسے صحابی اس کے صالح اور اہلِ خلافت ہونے کی رائے رکھ سکتے تھے۔ دُوسری طرف اگر اس ماحول کو پیشِ نظر رکھا جائے، جس میں یہ خلافت منعقد ہو رہی تھی تو بلاشبہ یہ رائے قائم کرنے کی بھی پوری

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۲۳۳۔

گنجائش تھی کہ وہ موجودہ حالات میں خلافت کا اہل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جس ماحول میں حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم وغیرہ جیسے جلیل القدر صحابہ، صلحائے اُمت اور مدبّرین موجود ہوں، اس ماحول میں یزید کو خلافت کے لئے نااہل یا غیر موزوں سمجھنا کچھ بعید نہیں ہے، زمانہ صحابہ کرامؓ اور کبار تابعینؒ کا تھا، اُمت میں خیر و صلاح کا دور دورہ تھا، ایسے حالات میں خلافت کے لئے عدالت و تقویٰ کے جس معیارِ بلند کی ضرورت تھی، ظاہر ہے کہ یزید اس پر پورا نہیں اُترتا تھا، اسی لئے بعض صحابہ کرامؓ نے اس نامزدگی کی کھل کر مخالفت کی۔

تیسرے صحابہ کرامؓ کا ایک گروہ وہ تھا جو حضرت حسینؓ اور حضرت ابنِ عباسؓ وغیرہ جیسے صحابہؓ کے مقابلے میں یزید کو خلافت کے لئے بہتر تو نہیں سمجھتا تھا، لیکن اس خیال سے اس کی خلافت کو گوارا کر رہا تھا کہ اُمت میں افتراق و انتشار برپا نہ ہو، مثلاً حمید بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ: میں یزید کی ولی عہدی کے وقت حضرت بشیرؓ کے پاس گیا جو صحابہ میں سے تھے، تو انہوں نے فرمایا:-

یقولون إنما یزید لیس بخیر أمة محمد صلی اللہ علیه وسلم وأنا أقول ذٰلک، ولٰکن لأن یجمع اللہ أُمّة محمد أحب إلیّ من أن تفترق.[1]

ترجمہ:- لوگ کہتے ہیں کہ یزید اُمتِ محمدؐ میں سب سے بہتر نہیں ہے، اور میں بھی یہی کہتا ہوں، لیکن اُمتِ محمدؐ کا جمع ہو جانا مجھے افتراق کی بہ نسبت زیادہ پسند ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یزید کے بارے میں صحابہ کرامؓ کا یہ اختلاف بھی درحقیقت رائے اور اجتہاد کا اختلاف تھا، اور اس معاملے میں کسی کو بھی مطعون نہیں کیا جاسکتا،

---

(۱) الذہبیؒ: تاریخ الاسلام ج:۲ ص:۲۶۷ و ۲۶۸۔

حضرت معاویہؓ یزید کو، محض اپنا بیٹا ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اسے خلافت کا اہل سمجھنے کی وجہ سے، ولی عہد بنانا چاہتے تھے اور صحابہ کرامؓ کی ایک بڑی جماعت دیانت داری کے ساتھ ان کی ہم نوا تھی اور وہ پانچ صحابہ کرامؓ جنھوں نے اس کی مخالفت کی تھی، وہ کسی ذاتی خصومت یا حرصِ اقتدار کی بناء پر مخالفت نہیں کر رہے تھے، بلکہ وہ دیانت داری سے یہ سمجھتے تھے کہ یزید خلافت کا اہل نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں، مذکورہ بالا بحث سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ اور معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی رائے واقعے کے لحاظ سے سو فیصد دُرست تھی اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ نفس الامر میں ٹھیک کیا، بلکہ مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی رائے کسی ذاتی مفاد پر نہیں بلکہ دیانت داری پر مبنی تھی، اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ امانت کے ساتھ اور شرعی جواز کی حدود میں رہ کر کیا۔ ورنہ جہاں تک رائے کا تعلق ہے، جمہور اُمت کا کہنا یہ ہے کہ اس معاملے میں رائے انہی حضراتِ صحابہؓ کی صحیح تھی جو یزید کو ولی عہد بنانے کے مخالف تھے، جس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں:۔

۱۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے تو بے شک اپنے بیٹے کو نیک نیتی کے ساتھ خلافت کا اہل سمجھ کر ولی عہد بنایا تھا، لیکن ان کا عمل ایک ایسی نظیر بن گیا جس سے بعد کے لوگوں نے نہایت ناجائز فائدہ اُٹھایا، انہوں نے اس کی آڑ لے کر خلافت کے مطلوبہ نظام شوریٰ کو درہم برہم کر ڈالا، اور مسلمانوں کی خلافت بھی شاہی خانوادے میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

۲۔ بلاشبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد میں یزید کا فسق و فجور کسی قابلِ اعتماد روایت سے ثابت نہیں، اس لئے اس کو خلافت کا اہل تو سمجھا جا سکتا تھا، لیکن اُمت میں ایسے حضرات کی کمی نہیں تھی جو نہ صرف دیانت و تقویٰ بلکہ ملکی انتظام اور سیاسی بصیرت کے اعتبار سے بھی یزید کے مقابلے میں بہ درجہا بلند مقام رکھتے تھے، اگر خلافت کی ذمہ داری ان کو سونپی جاتی تو بلاشبہ وہ اس سے کہیں بہتر طریقے پر اہل ثابت ہوتے۔

یہ دُرست ہے کہ افضل کی موجودگی میں غیر افضل کو خلیفہ بنانا شرعاً جائز ہے،[1] (بشرطیکہ اس میں شرائطِ خلافت موجود ہوں) لیکن افضل یہی ہے کہ خلیفہ ایسے شخص کو بنایا جائے جو تمام اُمت میں اس منصب کا سب سے زیادہ لائق ہو۔

۳- نیک نیتی کے ساتھ بیٹے کو ولی عہد بنانا بھی شرعاً جائز تو ہے، لیکن ایک طرف موضعِ تہمت ہونے کی وجہ سے اس سے بچنا ہی بہتر ہے، اور شدید ضرورت کے بغیر ایسا کرنا اپنے آپ کو ایک سخت آزمائش میں ڈالنا ہے، اسی لئے تمام خلفائے راشدینؓ نے اس سے پرہیز کیا۔ خاص طور سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے تو لوگوں کے کہنے کے باوجود اپنے قابل اور لائق فرزندوں کو ولی عہد بنانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔[2]

یزید اور اس کی ولی عہدی کے سلسلے میں ہم نے اُوپر جو کچھ کہا ہے، جمہور اُمت کے معتدل اور محقق علماء کا یہی مسلک ہے، قاضی ابوبکر بن عربی مالکیؒ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس فعل کو جائز قرار دینے کے ساتھ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں:-

إن معاوية ترك الأفضل فى أن يجعلها شورىٰ، وألا يخص بها أحدا من قرابته فكيف ولدًا، وأن يقتدى بما أشار به عبدالله بن الزبير فى الترك أو الفعل.[3]

ترجمہ:- بلاشبہ افضل یہ تھا کہ حضرت معاویہؓ خلافت کے معاملے کو شوریٰ کے سپرد کر دیتے اور اپنے کسی رشتہ دار، اور خاص طور سے بیٹے کے لئے اس کو مخصوص نہ کرتے، اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے ان کو جو مشورہ دیا تھا، ولی عہد بنانے یا نہ بنانے میں اسی پر عمل کرتے، لیکن انہوں نے اس افضل کام کو چھوڑ دیا۔

---

(۱) الماوردیؒ: الأحكام السلطانية ص:٦، المطبعة المحمودية، مصر، وأبو يعلىٰ الفراءؒ: الأحكام السلطانية ص:٧، مصطفى البابى ۱۳۵۶ھ، وابن العربیؒ: العواصم من القواصم ص:۲۱۱، السَّلفيّة ۱۳۷۱ھ، وابن الهمامؒ: المسايرة ص:۱۳۶ و ۱۳۷، دارالعلوم دیوبند ۱۳۷۷ھ۔

(۲) الطبرى ج:۳ ص:۲۹۲، و ج:۴ ص:۱۱۲ و ۱۱۳، مطبعة الاستقامة، القاهرة ۱۳۵۸ھ۔

(۳) العواصم من القواصم ص:۲۲۲۔

اور حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:-

كان معاوية لما صالح الحسن عهد للحسن بالأمر من بعده فلما مات الحسن قوى أمر يزيد عند معاوية، ورأى أنه لذٰلك أهلًا وذاك من شدة محبة الوالد لولده ولما كان يتوسم فيه من النجابة الدنيوية وسيما أولاد الملوك ومعرفتهم بالحروب وترتيب الملك والقيام بأبهته وكان ظن أن لا يقوم أحد من أبناء الصحابة فى هٰذا المعنى، ولهٰذا قال لعبدالله بن عمر فيما خاطبه به إنى خفت أن أذر الرعية من بعدى كالغنم المطيرة ليس لها راع.(۱)

ترجمہ:- جب حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ سے صلح کی تھی تو انہی کو اپنا ولی عہد بھی بنایا تھا، لیکن جب ان کی وفات ہوگئی تو یزید کی طرف حضرت معاویہؓ کا رُجحان قوی ہوگیا، ان کی رائے یہ تھی کہ وہ خلافت کا اہل ہے، اور یہ رائے باپ بیٹے کی شدید محبت کی وجہ سے تھی، نیز اس لئے تھی کہ وہ یزید میں دُنیوی نجابت اور شاہزادوں کی سی خصوصیت، فنونِ جنگ سے واقفیت، انتظامِ سلطنت اور اس کی ذمہ داری پورا کرنے کی صلاحیت دیکھتے تھے اور ان کا گمان یہ تھا کہ صحابہ کرامؓ کے صاحبزادوں میں سے کوئی اس اعتبار سے بہتر انتظام نہ کرسکے گا، اسی لئے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ: مجھے خوف ہے کہ میں عوام کو بکریوں کے منتشر گلے کی طرح چھوڑ کر نہ چلا جاؤں جس کا کوئی چرواہا نہ ہو۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۸۰۔

اور علامہ ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

یزید کے بارے میں لوگوں کے دو فریق ہیں، اور کچھ لوگ بیچ کی رائے رکھتے ہیں، بعض لوگوں کا اعتقاد تو یہ ہے کہ وہ صحابہ یا خلفائے راشدین یا انبیاء میں تھا، یہ اعتقاد بالکل باطل ہے، اور کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ وہ اور اس کا اصل مقصد اپنے کافر رشتہ داروں کا بدلہ لینا تھا، یہ دونوں قول باطل ہیں، ہر عقل مند انسان ان اقوال کو باطل سمجھے گا۔

اس لئے کہ یہ شخص (یزید) مسلمان بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ اور شاہی طرز کے خلفاء میں سے ایک خلیفہ تھا، نہ وہ ایسا تھا (جیسے پہلے گروہ نے کہا) اور نہ ویسا (جیسا دُوسرے گروہ نے کہا)۔[۱]

اور علامہ ابنِ خلدونؒ لکھتے ہیں:-

حضرت معاویہؓ کے دِل میں دُوسروں کو چھوڑ کر اپنے بیٹے کو ولی عہد بنانے کا جو داعیہ پیدا ہوا، اس کی وجہ اُمت کے اتحاد و اتفاق کی مصلحت تھی، بنو اُمیہ کے اہلِ حل وعقد اس پر متفق ہوگئے تھے کیونکہ وہ اس وقت اپنے علاوہ کسی اور پر راضی نہ ہوتے، اور اس وقت قریش کی سربرآوردہ جماعت وہی تھی اور اہلِ ملت کی اکثریت ان ہی میں سے تھی، اس لئے حضرت معاویہؓ نے اس کو

---

(۱) ابن تیمیةؒ: منهاج السنة ج:۲ ص:۲۴۶ و ۲۴۷، بولاق، مصر ۱۳۲۱ھ۔ عبارت یہ ہے:

"الناس فی یزید طرفان ووسط، قوم یعتقدون أنه من الصحابة أو من الخلفاء الراشدين المهدين أو من الأنبياء، وهٰذا كله باطل، وقوم يعتقدون أنه كافر منافق فى الباطن، وأنه كان له قصد فى أخذ ثأر كفار أقاربه من أهل المدينة وبنى هاشم ... وكلا القولين باطل يعلم بطلانه كل عاقل، فان الرجل ملك من ملوك المسلمين وخليفة من الخلفاء الملوك لا هٰذا ولا هٰذا"۔

ترجیح دی اور افضل سے غیر افضل کی طرف رُجوع کیا .... حضرت معاویہؓ کی عدالت اور صحابیت اس کے سوا کچھ اور گمان کرنے سے مانع ہے۔(۱)

اصل میں جمہور اُمت کا طرزِ عمل صحابہ کرامؓ کے بارے میں ہمیشہ سے یہ رہا ہے، کہ اگر ان کے کسی فعل کی کوئی ایسی توجیہ ہوسکتی ہو جو صحابیت کے مقامِ بلند اور ان کی مجموعی سیرت کے شایانِ شان ہو تو ان کے فعل کو اسی توجیہ پر محمول کیا جاتا ہے، مولانا مودودی صاحب بھی اُصولی طور پر اس طریقِ کار کو دُرست قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

تمام بزرگانِ دِین کے معاملے میں عموماً اور صحابہ کرامؓ کے معاملے میں خصوصاً میرا طرزِ عمل یہ ہے کہ جہاں تک معقول تأویل سے یا کسی معتبر روایت کی مدد سے ان کے کسی قول یا عمل کی صحیح تعبیر ممکن ہو، اسی کو اختیار کیا جائے اور اس کو غلط قرار دینے کی جسارت اس وقت تک نہ کی جائے جب تک کہ اس کے سوا چارہ نہ رہے۔ (خلافت وملوکیت ص:۳۰۸)

سوال یہ ہے کہ کیا مذکورہ بالا بحث کے بعد یہ بات ثابت نہیں ہوجاتی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس اقدام کی ''معقول تأویل'' ممکن ہے، اور بقول مولانا مودودی صاحب ''لیپ پوت'' یا ''بھونڈی وکالت'' کے بغیر ان کے اس عمل کو نیک نیتی پر محمول کیا جاسکتا ہے، اور جب صورتِ حال یہ ہے تو خود مولانا کے بیان کردہ اُصول کی روشنی میں انہیں ''بدنیت'' اور ''مفاد پرست'' قرار دینا کیونکر دُرست ہوسکتا ہے؟

---

(۱) ابن خلدونؒ: مقدمہ ص:۳۷۷ باب:۳ فصل:۳۰، بیروت ۱۹۵۶ء۔

# خلافتِ یزید کے بارے میں صحابہؓ کے مختلف نظریات

## حضرت مغیرہ بن شعبہؓ

یزید کو ولی عہد بنانے کی ابتدائی تحریک حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی طرف سے ہوئی تھی، جناب مولانا مودودی صاحب نے اس تحریک کو بھی حضرت مغیرہؓ کے ذاتی مفاد پر مبنی قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

> اس تجویز کی ابتداء حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی طرف سے ہوئی، حضرت معاویہؓ انہیں کوفہ کی گورنری سے معزول کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، انہیں اس کی خبر مل گئی، فوراً کوفہ سے دمشق پہنچے اور یزید سے مل کر کہا کہ ''صحابہ اکابر اور قریش کے بڑے لوگ دُنیا سے رُخصت ہو چکے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امیر المؤمنین تمہارے لئے بیعت لے لینے میں تأمل کیوں کر رہے ہیں؟'' یزید نے اس بات کا ذکر اپنے والد ماجد سے کیا، انہوں نے حضرت مغیرہؓ کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا بات ہے جو تم نے یزید سے کہی؟ حضرت مغیرہؓ نے جواب دیا: ''امیر المؤمنین! آپ دیکھ چکے ہیں کہ قتلِ عثمان کے بعد کیسے کیسے خون خرابے ہوئے، اب بہتر یہی ہے کہ آپ یزید کو اپنی زندگی ہی میں ولی عہد مقرّر کر کے بیعت لے لیں تاکہ اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو اختلاف نہ ہو'' حضرت معاویہؓ نے پوچھا: ''اس کام کو پورا کرنے کی ذمہ داری کون لے گا؟''
>
> انہوں نے کہا: ''اہلِ کوفہ کو میں سنبھالوں گا اور اہلِ بصرہ کو زیادؔ'' یہ بات کر کے حضرت مغیرہؓ کوفہ آئے اور تیس آدمیوں کو تیس ہزار

درہم دے کر اس بات پر راضی کیا.... الخ۔ (ص:۱۴۸ و ۱۴۹)

مولانا نے یہ قصہ کامل ابنِ اثیرؒ سے نقل کیا ہے اور ساتھ البدایہ اور ابنِ خلدون کا حوالہ دے کر یہ کہا ہے کہ ان میں بھی اس واقعے کے بعض حصوں کا ذکر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ البدایہ اور ابنِ خلدون میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی بناء پر حضرت مغیرہؓ کی اس تجویز کو ذاتی مفاد پر مبنی قرار دیا جائے۔ ہم یہاں ابنِ خلدون کی عبارت نقل کر دیتے ہیں جو انہوں نے طبری کے حوالے سے لی ہے اور البدایہ والنہایہ میں بھی واقعہ کم و بیش اسی طرح نقل کیا گیا ہے:-

حضرت مغیرہؓ حضرت معاویہؓ کے پاس آئے اور ان سے اپنے ضعف کی شکایت کر کے (گورنری سے) استعفاء دے دیا، حضرت معاویہؓ نے اسے منظور کر لیا اور حضرت سعید بن العاص کو ان کی جگہ گورنر بنانے کا ارادہ کیا، مغیرہؓ کے ساتھیوں نے ان سے کہا کہ: معاویہؓ آپ سے ناراض ہو گئے ہیں، انہوں نے کہا: ''ذرا ٹھہرو'' پھر وہ یزید کے پاس پہنچ گئے اور اس کے سامنے بیعت کا معاملہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اکابر صحابہ اور قریش کے بڑے لوگ رُخصت ہو چکے ہیں.... الخ۔[1]

طبریؒ، حافظ ابنِ کثیرؒ اور ابنِ خلدونؒ کے بیانات سے یہ بات واضح ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت مغیرہؓ کو اَز خود معزول نہیں کیا تھا، بلکہ خود حضرت مغیرہؓ نے اپنے ضعف کی بناء پر استعفاء پیش کیا تھا۔ تاریخ کے اوّلین مآخذ میں تو واقعہ صرف اتنا ہی لکھا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت مغیرہؓ کو گورنری کا اتنا زیادہ شوق تھا کہ وہ اس کے لئے اُمتِ محمدیہ کے مفاد کو قربان کر سکتے تھے تو انہوں نے خود آ کر

---

(۱) ابنِ خلدون ج:۳ ص:۳۳، بیروت ۱۹۵۷ء، عبارت یہ ہے: ''ذكر الطبري بسنده قال: قدم المغيرة على معاوية فشكا إليه الضعف فاستعفاه فأعفاه وأراد أن يولي سعيد بن العاص وقال أصحاب المغيرة: إن معاوية قلاك، فقال لهم: رويدًا، ونهض إلى يزيد وعرض له بالبيعة وقال: ذهب أعيان الصحابة وكبراء قريش .... الخ''۔

استعفاء کیوں پیش کیا؟ اس سوال کا ایک جواب تو وہ ہے جو علامہ ابنِ اثیرؒ اور مولانا مودودی صاحب نے دیا ہے، وہ یہ ہے کہ درحقیقت یہ استعفاء بھی اپنی قیمت بڑھانے کی ایک چال تھی، انہیں پہلے یہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ حضرت معاویہؓ کسی وجہ سے ان کو معزول کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا انہوں نے یزید کی ولی عہدی کو آڑ بنا کر حضرت معاویہؓ کی خوشنودی حاصل کرنی چاہی، مگر یہ سمجھا کہ اگر بحالاتِ موجودہ یہ رائے پیش کروں گا تو حضرت معاویہؓ سمجھ جائیں گے کہ یہ تجویز محض گورنری بچانے کے لئے پیش کی جارہی ہے، اس لئے انہوں نے پہلے مصنوعی طور پر استعفاء پیش کردیا تاکہ لوگوں پر اور خود حضرت معاویہؓ پر واضح ہوجائے کہ میں ان کا سچا خیرخواہ ہوں اور پھر وہ زبردستی مجھے گورنر بنادیں گے۔

اور دُوسرا جواب اس طرح دیا جاسکتا ہے کہ حضرت مغیرہؓ نے واقعۃً خلوص کے ساتھ اپنے ضعف کی بناء پر استعفاء پیش کیا تھا، لیکن جب حضرت معاویہؓ نے کچھ کہے بغیر استعفاء منظور کر کے دُوسرے کو گورنر بنانے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے ان سے کہا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تمہارے استعفاء دینے سے امیرالمؤمنین ناراض ہوگئے ہیں (جیسا کہ پُرانے ماتحت کے اچانک استعفاء دے دینے سے عموماً افسرِ بالا کو گرانی ہوا کرتی ہے)، اس پر حضرت مغیرہؓ نے حضرت معاویہؓ پر یہ واضح کرنا چاہا کہ میں نے کسی رنجش یا ملت کے اُمور سے عدم دِلچسپی کی بناء پر استعفاء نہیں دیا، بلکہ ضعف کی بناء پر استعفاء دیا ہے، ورنہ جہاں تک اُمت کے اجتماعی اُمور کا تعلق ہے ان سے میری دِلچسپی اب بھی برقرار ہے، جس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ میں حضرت معاویہؓ کے بعد یزید کو ولی عہد بنانا چاہتا ہوں، جو میری نظر میں خلافت کا اہل ہے اور اس کی ولی عہدی میرے خیال میں اُمت کو افتراق سے بچاسکتی ہے۔ اور اگر اس مقصد کے لئے مجھے دوبارہ گورنری کی ضرورت پیش آئی تو میں یہ خدمت دوبارہ انجام دینے کے لئے تیار ہوں۔

اس واقعے کی جو عبارت طبریؒ، حافظ ابنِ کثیرؒ اور ابنِ خلدونؒ نے نقل کی ہے، اس میں واقعے کی ان دونوں توجیہات کی یکساں گنجائش ہے، یہ عبارتیں نہ پہلے مفہوم میں صریح ہیں، نہ دُوسرے مفہوم میں، بلکہ پہلے مفہوم پر بھی کچھ عقلی اعتراضات

وارِد ہو سکتے ہیں اور دُوسرے مفہوم پر بھی، اور دونوں ہی صورتوں میں واقعے کے مبہم خلاء کو قیاسات سے پُر کرنا پڑتا ہے۔

اب یہ فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں کہ وہ علامہ ابنِ اثیرؒ اور مولانا مودودی صاحب کو غلطی سے مبرّا ثابت کرنے کے لئے پہلے مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں، جو حضرت مغیرہؓ کے ساتھ بدگمانی ہی بدگمانی پر مبنی ہے، یا حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی جلالتِ شان اور صحابیت کے مقامِ بلند کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دُوسرے مفہوم کو اختیار کرتے ہیں جو ہر طرح ان کے شایانِ شان ہے۔ خود ہمارا ضمیر تو یہ کہتا ہے کہ جس صحابی کی ساری زندگی اسلام کی خدمت میں گزری ہو، جو غزوۂ حدیبیہ کے ان خوش نصیب مجاہدین میں شامل ہو جن سے خوش ہونے کا اعلان خود اللہ نے کردیا ہے،(۱) جس نے اپنی آنکھ غزوۂ یرموک کے مقدس معرکے میں اللہ کے لئے قربان کردی ہو،(۲) جس نے جنگِ قادسیہ کے موقع پر پوری اُمتِ مسلمہ کا نمائندہ بن کر اپنی قوّتِ ایمانی سے کسریٰ کے ایوان میں زلزلہ ڈال دیا ہو،(۳) جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سو چھتیس احادیث روایت کی ہوں،(۴) اور جو اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ اقتدار کی حالت میں گزار کر جاہ و منصب سے سیر ہو چکا ہو، وہ محض اپنے اقتدار کی مدّت کو کچھ اور بڑھانے کے لئے جھوٹ، فریب، مکر، رِشوت، ضمیر فروشی اور اُمتِ محمدیہ سے غداری جیسے سنگین اور گھناؤنے جرائم کا ارتکاب نہیں کرسکتا، اس لئے اس تاریخی قصے کی وہ تعبیر بالکل غلط ہے جو علامہ ابنِ اثیر اور مولانا مودودی صاحب نے اختیار کی ہے۔

اس واقعے کی اصل حقیقت اور اس کی تعبیر و تشریح کے دونوں رُخ ہم نے آپ کے سامنے پیش کردیئے ہیں، اب ہم خود مولانا مودودی صاحب ہی کے الفاظ نقل کئے دیتے ہیں جو حضرت علیؓ کے بارے میں انہوں نے لکھے ہیں:-

---

(۱) تهذيب التهذيب ج:۱۰ ص:۲۶۲، و ابن سعد ج:۶ ص:۲۰ جزو:۲۱۔

(۲) ابن سعد ج:۶ ص:۲۰ جزو:۲۱۔

(۳) البداية والنهاية ج:۷ ص:۳۹۔

(۴) النوویؒ: تهذيب الأسماء واللغات ج:۱ ص:۱۰۹ جزو:۲، ادارة الطباعة المنيرية، مصر۔

کسی کا جی چاہے کہ اس قصے کو باور کرے تو ہم اسے روک نہیں سکتے، تاریخ کے صفحات تو بہرحال اس سے آلودہ ہی ہیں، مگر ساتھ ہی پھر یہ ماننا پڑے گا کہ خاکم بدہن رسالت کا دعویٰ محض ڈھونگ تھا، قرآن شاعرانہ الفاظی کے سوا کچھ نہ تھا اور تقدس کی ساری داستانیں خالص ریاکاری کی داستانیں تھیں۔

اور.....:-

ہم خواہ مخواہ کسی کے ساتھ بحث و مناظرے میں نہیں اُلجھنا چاہتے، ہم نے یہ دونوں تصویریں پیش کردی ہیں، اب ہر صاحبِ عقل کو خود سوچنا چاہئے کہ ان میں کون سی تصویر مبلغِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اہلِ بیت و اصحابِ کبار کی سیرتوں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے، اگر پہلی تصویر پر کسی کا دِل ریجھتا ہے تو ریجھے، مگر اس کے ساتھ اُمیدواری و دعوے داری کا مسئلہ ہی نہیں پورے دِین و ایمان کا مسئلہ حل طلب ہوجائے گا۔(۱)

# یزید کی بیعت کے سلسلے میں ''بدعنوانیاں''

مولانا مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کی بیعت کے سلسلے میں خوف وطمع کے ذرائع سے کام لیا، اس لئے مختصراً ان روایات کے بارے میں بھی چند مختصر باتیں ذہن نشین کرلیجئے جن سے مولانا نے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ تاریخ میں جو روایات اس سلسلے میں ملتی ہیں وہ تین قسم کی ہیں: بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے بیعتِ یزید پر جبر و اکراہ کیا۔ دُوسری وہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس معاملے میں مکر و فریب سے کام لیا۔ تیسری وہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس مقصد کے لئے لوگوں کو رِشوت دی۔

---

(۱) رسائل و مسائل ج:۱ ص:۷۰، ۷۶۔

جہاں تک جبر و اکراہ کا تعلق ہے، یہ صرف کامل ابنِ اثیرؒ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے جو مولانا مودودی صاحب نے نقل کی ہے۔ یعنی یہ کہ حضرت معاویہؓ نے بیعتِ یزید کے مخالف صحابہؓ سے کہا کہ: "اگر تم میں سے کسی نے میری بات کے جواب میں ایک لفظ بھی کہا تو دُوسری بات اس کی زبان سے نکلنے کی نوبت نہ آئے گی، تلوار اس کے سر پر پہلے پڑ چکی ہوگی" لیکن یہ روایت صرف کامل ابنِ اثیرؒ کی ہے، جو انہوں نے حسبِ عادت بغیر سند کے ذکر کی ہے۔ طبری میں بھی جو ابنِ اثیرؒ کا سب سے بڑا مأخذ ہے، اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اس کے برعکس مشہور مؤرّخ احمد الیعقوبی حضرت معاویہؓ کے اسی سفر کا ذکر کرتے ہوئے صاف لکھتے ہیں:-

وحج معاوية تلك السنة فتألف القوم ولم يكرههم علي البيعة.(۱)

ترجمہ:- اور حضرت معاویہؓ نے اس سال حج کیا تو لوگوں کی دِلداری کی اور (یزید کی) بیعت پر انہیں مجبور نہیں کیا۔

واضح رہے کہ یعقوبی وہ مؤرّخ ہیں جن کا شیعہ ہونا بہت مشہور ہے، اس کے باوجود وہ حضرت معاویہؓ سے بیعتِ یزید کے سلسلے میں جبر و اکراہ کی صراحۃً تردید کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ کون سی معقول وجہ ہے جس کی بناء پر ابنِ اثیرؒ کی روایت کو قبول کیا جائے اور یعقوبی کی اس روایت کو چھوڑ دیا جائے؟

رہ گئی یہ بات کہ حضرت معاویہؓ نے اس معاملے میں (معاذ اللہ) مکر و فریب سے کام لیا ہو، یہ بات طبریؒ نے اس طرح نقل کی ہے کہ حضرت معاویہؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اور دُوسرے ان صحابہؓ سے الگ الگ ملے جو یزید کی ولی عہدی کے مخالف تھے، اور ان میں سے ہر ایک سے یہ کہا کہ: "یزید کے مخالفین کے لیڈر آپ ہیں، آپ نے بیعت کرلی تو سب کرلیں گے" لیکن اس روایت کا راوی کون ہے؟

طبریؒ فرماتے ہیں:-

---

(۱) تاریخ الیعقوبی ج:۲ ص:۲۲۹، دار صادر، بیروت ۱۳۷۹ھ۔

رجل بنخلة.(۱)

ترجمہ:- مقامِ نخلہ کا ایک شخص۔

کچھ پتہ نہیں کہ یہ شخص کون ہے؟ کافر ہے یا مسلمان؟ یا سبائی اور منافق؟ سچا ہے یا جھوٹا؟ آخر اس جیسی روایات کی بنیاد پر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر کیسے اتنا بڑا الزام کردیا جائے؟

آخری اعتراض یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے رِشوتیں دے دے کر لوگوں کو اس بیعت پر آمادہ کیا۔ چنانچہ مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں:-

> حضرت مغیرہؓ کوفہ آئے اور دس آدمیوں کو تیس ہزار درہم دے کر اس بات پر راضی کیا کہ ایک وفد کی صورت میں حضرت معاویہؓ کے پاس جائیں اور یزید کی ولی عہدی کے لئے ان سے کہیں، یہ وفد حضرت مغیرہؓ کے بیٹے موسیٰ بن مغیرہ کی سرکردگی میں دمشق گیا اور اس نے اپنا کام پورا کردیا۔ بعد میں حضرت معاویہؓ نے موسیٰ کو الگ بلاکر پوچھا: "تمہارے باپ نے ان لوگوں سے کتنے میں ان کا دِین خریدا ہے؟" انہوں نے کہا: "تیس ہزار درہم میں" حضرت معاویہؓ نے کہا: "تب تو ان کا دِین ان کی نگاہ میں بہت ہلکا ہے"۔

رِشوت کی یہ روایتیں بھی صرف کامل ابنِ اثیر میں بغیر کسی سند اور حوالے کے نقل کی گئی ہیں۔ ابنِ جریر طبریؒ جو علامہ ابنِ اثیرؒ کا سب سے بڑا مأخذ ہے، اس میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں، اور حافظ ابنِ کثیرؒ جو ان کے بعد آئے ہیں، اور بقول مولانا مودودی صاحب: "وہ اتنے متدین ہیں کہ تاریخ نگاری میں واقعات کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے"(۲) وہ بھی اس تیس ہزار درہم کے قصے کی طرف کوئی اشارہ تک نہیں دیتے۔ اگر ایسی غیر مستند اور بے حوالہ روایتوں کی بنیاد پر ایک صحابی کو رِشوت دینے کا

---

(۱) الطبری ج:۴ ص:۲۲۵۔

(۲) خلافت وملوکیت ص:۳۱۵۔

ملزم قرار دیا جاسکتا ہے تو پھر ایک حضرت معاویہؓ ہی کا نہیں تمام صحابہ کرامؓ بلکہ انبیاء علیہم السلام تک کا کردار داغدار دِکھایا جاسکتا ہے۔ اور پھر ملوکیت کی جو تصویر مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کے عہد کے بارے میں دِکھائی ہے، کوئی اور ''محقق'' اس کی ابتداء اس سے پہلے بھی خلافتِ راشدہ کے عہد سے کرسکتا ہے۔ اسی کامل ابنِ اثیرؒ میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے سپہ سالار کی خوبصورت بیوی سے نکاح کرنے کے لئے اسے پے در پے کئی خطرناک محاذوں پر صرف اس لئے بھیجا کہ وہ قتل ہوجائے، اور جب وہ مارا گیا تو اس کی بیوی کو اپنے حرم میں داخل کرلیا۔[1] اور اسی میں کئی مقامات پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تصویر اس طرح پیش کی گئی ہے جیسے (معاذ اللہ) ان کی ساری عمر عہدۂ خلافت کی آرزو میں بے تاب ہوئے گزری تھی۔[2] اس پہلو کو ہم آگے قدرے تفصیل کے ساتھ واضح کریں گے کہ ان تاریخی روایات کی حیثیت کیا ہے؟ اور علمی مباحث میں ان سے کس طرح استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

## حضرت حسینؓ کا موقف

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یزید کی ولی عہدی نیک نیتی کے ساتھ عمل میں آئی تھی اور وہ کھلا فاسق و فاجر نہیں تھا تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس کے خلاف خروج کیوں کیا؟ یہ سوال اگرچہ ہمارے موضوع زیرِ بحث سے براہِ راست تعلق نہیں رکھتا، لیکن چونکہ اس معاملے میں ایک دُوسرے گروہ نے دُوسری انتہاء پر پہنچ کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر اعتراضات والزامات کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے،[3] اس لئے یہاں تفصیل میں جائے بغیر نہایت اختصار کے ساتھ حضرت حسینؓ کا وہ موقف بھی پیش کردیتے ہیں جو ہم نے سمجھا ہے۔

---

(۱) کامل ابنِ اثیر ج:۱ ص:۷۷۔

(۲) مثال کے طور پر دیکھئے: ج:۳ ص:۲۷۔

(۳) جناب محمود احمد عباسی: خلافتِ معاویہ و یزید اور تحقیقِ مزید۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، علماء کا راجح قول یہ ہے کہ ولی عہد بنانے کی حیثیت ایک تجویز کی سی ہوتی ہے اور خلیفہ کی وفات کے بعد اُمت کے اربابِ حل وعقد کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ چاہیں تو ولی عہد ہی کو خلیفہ بنائیں اور چاہیں تو باہمی مشورے سے کسی اور کو خلیفہ مقرّر کردیں۔ لہٰذا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد یزید کی خلافت اس وقت تک منعقد نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ اُمت کے اربابِ حل وعقد اسے منظور نہ کرلیں۔

حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بذاتِ خود شروع ہی سے یزید کو خلافت کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور جیسا کہ پیچھے عرض کیا جاچکا ہے، یہ ان کی دیانت دارانہ رائے تھی۔ جب حضرت معاویہؓ کی وفات ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ حجاز کے اکابر اور اہلِ حل وعقد نے، جن میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ شامل تھے، ابھی تک یزید کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا، ادھر عراق سے ان کے پاس خطوط کا انبار لگ گیا، جس سے واضح ہوتا تھا کہ اہلِ عراق بھی یزید کی خلافت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، وہاں کے لوگ مسلسل انہیں یہ لکھ رہے تھے کہ ہمارا کوئی اِمام نہیں ہے اور ہم نے ابھی تک کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔[1] ان حالات میں ان کا موقف یہ تھا کہ صرف اہلِ شام کی بیعت پوری اُمت پر لازم نہیں ہوسکتی، لہٰذا اس کی خلافت ابھی منعقد ہی نہیں ہوئی، اس کے باوجود وہ پورے عالمِ اسلام پر بزور متصرف ہونا چاہ رہا ہے، تو اس کی حیثیت ایک ایسے سلطان متغلّب کی سی ہے جو غلبہ پانا چاہتا ہے مگر ابھی پا نہیں سکا۔ ایسی حالت میں اس کے غلبے کو روکنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے اور اسی لئے انہوں نے پہلے حالات کی تحقیق کے لئے حضرت مسلم بن عقیلؓ کو روانہ کیا تا کہ صحیح صورتِ حال معلوم ہوسکے۔ لہٰذا کوفہ کی طرف ان کا کوچ فقہی نقطۂ نظر سے بغاوت کے لئے نہیں تھا بلکہ ایک متغلّب کے غلبے کو روکنے کے لئے تھا۔ اگر ان کی نظر میں صورتِ حال یہ ہوتی کہ یزید پورے عالمِ اسلام پر بزور قابض ہوچکا ہے اور اس کا تسلط مکمل ہوگیا ہے، تب بھی

---

(۱) الطبری ج:۴ ص:۲۶۲، والبدایة ج:۸ ص:۱۵۱و۱۵۲، والیعقوبی ج:۲ ص:۲۴۲، والأُمّة والسیاسة۔

وہ بہ حالتِ مجبوری اَحکامِ شریعت کے مطابق یزید کو سلطانِ متغلّب تسلیم کر کے خاموش ہو جاتے، لیکن ان کی نظر میں صورتِ حال یہ تھی کہ یزید کا تسلط ابھی مکمل نہیں ہوا، اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس کے اقتدار کو ابھی روکا جاسکتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جب کوفہ کے قریب پہنچنے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ کوفہ کے لوگوں نے غداری کی ہے اور یزید کا تسلط وہاں پر مکمل ہو گیا ہے تو انہوں نے وہ تین مشہور تجاویز پیش کیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ:-

إما أن أضع يدي في يد زيد.[1]

ترجمہ:- یا پھر میں اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دے دُوں گا۔

اس کا صاف مطلب ہی یہ ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب یہ معلوم ہو گیا کہ یزید کا تسلط پوری طرح قائم ہو چکا ہے تو سلطانِ متغلّب کی حیثیت سے وہ اس کے ہاتھ پر بیعت کے لئے رضامند ہو گئے تھے، لیکن عبیداللہ بن زیاد نے شمر بن ذی الجوشن کے مشورے پر عمل کر کے ان کی کسی بات کو نہ مانا اور اس بات پر اصرار کیا کہ وہ غیر مشروط طور پر عبیداللہ بن زیاد کے پاس حاضری دیں۔ ظاہر ہے کہ عبیداللہ بن زیاد کی اس نامعقول بات کو ماننا حضرت حسینؓ پر لازم نہیں تھا، اور وہ اس میں اپنی جان کا خطرہ سمجھتے تھے، اس لئے بالآخر انہیں مقابلہ کرنا پڑا اور کربلا کا المیہ پیش آکر رہا۔

جہاں تک یزید کا تعلق ہے، یہ بالکل دُرست ہے کہ کسی بھی معتبر روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کیا یا انہیں شہید کرنے کا حکم دیا، بلکہ بعض روایات سے یہ ثابت ہے کہ اس نے آپؓ کی شہادت پر افسوس کا اظہار کیا اور عبیداللہ بن زیاد کو اپنی مجلس میں بُرا بھلا کہا،[2] لیکن اس کی یہ غلطی

---

(۱) الطبری ج:۴ ص:۳۱۳، البداية والنهاية ج:۸ ص:۱۷۵، وغیرہ میں بھی اس تجویز کا ذکر ہے، ایک راوی کا کہنا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے یہ تجویز پیش نہیں کی، لیکن اس کے مقابلے میں وہ روایات زیادہ ہیں جن میں اس تجویز کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۲) البداية والنهاية ج:۸ ص:۲۰۲ و ۲۰۳۔

نا قابلِ انکار ہے کہ اس نے عبیداللہ بن زیاد کو اس سنگین جرم پر کوئی سزا نہیں دی۔ لہٰذا مولانا مودودی صاحب نے یہ بات بالکل صحیح لکھی ہے کہ:-

> ہم یہی روایت صحیح مان لیتے ہیں کہ وہ حضرت حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کے سر دیکھ کر آبدیدہ ہوگیا اور اس نے کہا کہ: ''میں حسینؓ کے قتل کے بغیر بھی تم لوگوں کی اطاعت سے راضی تھا، اللہ کی لعنت ہو ابنِ زیاد پر، خدا کی قسم! اگر میں وہاں ہوتا تو حسینؓ کو معاف کردیتا'' اور یہ کہ: ''خدا کی قسم اے حسین! میں تمہارے مقابلے میں ہوتا تو تمہیں قتل نہ کرتا'' پھر بھی یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے کہ اس ظلمِ عظیم پر اس نے اپنے سر پھرے گورنر کو کیا سزا دی؟ حافظ ابنِ کثیرؒ کہتے ہیں کہ اس نے ابنِ زیاد کو نہ کوئی سزا دی، نہ اسے معزول کیا، نہ اسے ملامت ہی کا کوئی خط لکھا۔

## چند اُصولی مباحث

اس مقالے میں ہمیں ''خلافت وملوکیت'' کی جن جزئیات پر گفتگو کرنی تھی وہ پوری ہوگئیں، اب ہم وعدے کے مطابق چند اُصولی مسائل پر مختصر بحث کریں گے۔

### عدالتِ صحابہؓ کا مسئلہ

مولانا مودودی صاحب کی کتاب ''خلافت وملوکیت'' کو جس وجہ سے سب سے زیادہ تنقید کا نشانہ بننا پڑا ہے اور جس وجہ سے سنجیدہ علمی حلقوں نے بھی اس کی تردید کرنا ضروری سمجھا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر اس کتاب کے ان مندرجات کو دُرست مان لیا جائے جو خاص طور سے حضرت معاویہؓ سے متعلق ہیں، تو اس سے عدالتِ صحابہؓ کا وہ بنیادی عقیدہ مجروح ہوتا ہے جو اہلِ سنت کا اجماعی عقیدہ ہے اور جسے مولانا مودودی صاحب بھی اُصولی طور پر دُرست مانتے ہیں۔ مولانا نے اپنی کتاب کے ضمیمے میں یہ سوال اُٹھا کر تقریباً پانچ صفحات میں اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی

ہے۔ ہم نے ان کی اس بحث کو بار بار بنظرِ غائر پڑھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے اصل زیرِ بحث سوال بالکل حل نہیں ہوتا۔ مولانا نے "الصحابة کلھم عدول" (تمام صحابہؓ عادل ہیں) کو اُصولی طور پر اپنا عقیدہ قرار دے کر یہ لکھا ہے کہ اس عقیدے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ صحابہؓ سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ روایتِ حدیث میں انہوں نے پوری دیانت اور ذمہ داری سے کام لیا ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:-

> یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی شخص سے کوئی کام عدالت کے منافی سرزد ہونے کا یہ نتیجہ ہوسکتا ہے کہ صفتِ عدالت اس سے بالکلیہ منتفی ہوجائے اور ہم سرے سے اس کے عادل ہونے ہی کی نفی کردیں اور وہ روایتِ حدیث کے معاملے میں ناقابلِ اعتماد ٹھہرے؟ میرا جواب یہ ہے کہ کسی شخص کے ایک دو یا چند معاملات میں عدالت کے منافی کام کرگزرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی عدالت کی کلی نفی ہوجائے اور وہ عادل کے بجائے فاسق قرار پائے درآنحالیکہ اس کی زندگی میں مجموعی طور پر عدالت پائی جاتی ہو۔

لیکن اس گفتگو میں مولانا نے اس بحث کو صاف نہیں فرمایا، عقلی طور پر عدالتِ صحابہؓ کے تین مفہوم ہوسکتے ہیں:-

۱- صحابہ کرامؓ معصوم اور غلطیوں سے بالکل پاک ہیں۔

۲- صحابہ کرامؓ اپنی عملی زندگی میں (معاذ اللہ) فاسق ہوسکتے ہیں، لیکن روایتِ حدیث کے معاملے میں وہ بالکل عادل ہیں۔

۳- صحابہ کرامؓ نہ تو معصوم تھے اور نہ فاسق، یہ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کسی سے بعض مرتبہ بتقاضائے بشریت "دو ایک یا چند" غلطیاں سرزد ہوگئی ہوں، لیکن تنبہ کے بعد انہوں نے توبہ کرلی اور اللہ نے انہیں معاف فرمادیا، اس لئے وہ ان غلطیوں کی بناء پر فاسق نہیں ہوئے۔ چنانچہ یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی صحابی نے گناہوں کو اپنی

''پالیسی'' بنالیا ہو جس کی وجہ سے اسے فاسق قرار دیا جاسکے۔

اصل سوال یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب ان میں سے کون سے مفہوم کو دُرست سمجھتے ہیں؟ پہلے مفہوم کو تو انہوں نے صراحۃً غلط کہا ہے، اور جمہور اہلِ سنت بھی اسے غلط کہتے ہیں۔ اب آخری دو مفہوم رہ جاتے ہیں، مولانا نے یہ بات صاف نہیں کی کہ ان میں سے کون سا مفہوم وہ دُرست سمجھتے ہیں؟ اگر ان کی مراد دُوسرا مفہوم ہے یعنی یہ کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین صرف روایتِ حدیث کی حد تک عادل ہیں، ورنہ اپنی عملی زندگی میں وہ (معاذ اللہ) فاسق و فاجر بھی ہوسکتے ہیں تو یہ بات ناقابلِ بیان حد تک غلط اور خطرناک ہے۔ اس لئے کہ اگر کسی صحابی کو فاسق و فاجر مان لیا جائے تو آخر روایتِ حدیث کے معاملے میں اسے فرشتہ تسلیم کرنے کی کیا وجہ ہے؟ جو شخص اپنے ذاتی مفاد کے لئے جھوٹ، فریب، رِشوت، خیانت اور غداری کا مرتکب ہوسکتا ہے، وہ اپنے مفاد کے لئے جھوٹی حدیث کیوں نہیں گھڑسکتا؟ روایتِ حدیث کے معاملے میں آپ اس کے اعتماد کو یہ کہہ کر کیسے بحال کرسکتے ہیں کہ:۔

> کبھی کسی فریق نے کوئی حدیث اپنے مطلب کے لئے اپنی طرف سے گھڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کی، نہ کسی صحیح حدیث کو اس بناء پر جھٹلایا کہ وہ اس کے مفاد کے خلاف پڑتی ہے۔

اسی لئے تمام محدثین اس اُصول کو مانتے آئے ہیں کہ جو شخص فاسق و فاجر ہو، اس کی روایت صحیح نہیں ہوتی، ورنہ اگر روایات کو مسترد کرنے کے لئے یہ شرط لگادی جائے کہ راوی کا ہر ہر روایت میں جھوٹ بولنا ثابت ہو، تو شاید کوئی بھی روایت موضوع ثابت نہیں ہوسکے گی اور حدیث کے تمام راوی معتبر اور مستند ہوجائیں گے، خواہ وہ عملی زندگی میں کتنے ہی فاسق و فاجر ہوں۔

اور اگر مولانا مودودی صاحب عدالتِ صحابہؓ کو تیسرے مفہوم میں دُرست سمجھتے ہیں، جیسا کہ ان کی اُوپر نقل کی ہوئی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے، سو یہ مفہوم جمہور اہلِ سنت کے نزدیک دُرست ہے، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر

انہوں نے جو اعتراضات اپنی کتاب میں کئے ہیں اگر ان کو دُرست مان لیا جائے تو عدالت کا یہ مفہوم ان پر صادق نہیں آسکتا۔ مولانا مودودی صاحب کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے :-

۱- اپنے بیٹے کے لئے خوف وطمع کے ذرائع سے بیعت لی۔ (ص:۱۴۸)

۲- اس غرض کے لئے رِشوتیں دیں۔ (ص:۱۴۹،۱۵۰)

۳- مخالفین کو قتل کی دھمکیاں دے کر مجبور کیا۔ (ص:۱۵۳)

۴- حجر بن عدیؓ جیسے ''زاہد و عابد صحابیؓ'' اور ان کے ساتھیوں کو محض ان کی حق گوئی کی وجہ سے قتل کیا۔ (ص:۱۶۴،۱۶۵)

۵- مسلمان کو کافر کا وارث قرار دینے کی بدعت جاری کی۔ (ص:۱۷۳)

۶- دیت کے اَحکام میں بدعت جاری کر کے آدھی دیت خود اپنے ذاتی استعمال کے لئے لینی شروع کر دی۔ (ص:۱۷۴)

۷- حضرت علیؓ پر خود برسرِ منبر سبّ وشتم کرنے کی بدعت جاری کی۔ (ص:۱۷۴)

۸- مالِ غنیمت کی تقسیم میں خیانت کر کے سونا چاندی اپنے استعمال میں لانے کا حکم دے دیا۔ (ص:۱۷۴)

۹- اپنے والد ماجد کی زناکاری پر (جھوٹی) شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد ان ہی کا ولد الحرام ہے، پھر اسی بنیاد پر اسے اپنا بھائی قرار دے دیا۔ (ص:۱۷۵)

۱۰- اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دے دیا۔ (ص:۱۷۵)

۱۱- ان کے گورنروں نے (ان کی عملی رضامندی سے) مسلمان عورتوں کو کنیز بنایا اور یہ ساری کارروائیاں گویا اس بات کا عملاً اعلان تھیں کہ اب گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھوٹ ہے، اور سیاسی معاملات میں شریعت کی کسی حد کے وہ پابند نہیں ہیں۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر یہ ''چارج شیٹ'' دُرست ثابت ہو جائے تو اس

کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (معاذ اللہ) فاسق قرار پاتے ہیں یا نہیں؟ اگر فاسق قرار پاتے ہیں تو عدالت کا یہ تیسرا مفہوم جسے آپ دُرست مان کر آئے ہیں، ان پر کیسے صادق آسکتا ہے؟ اور اگر وہ ان ''مکروہ بدعتوں'' اور ''قرآن وسنت کے اَحکام کی صریح خلاف ورزیوں'' کے باوجود فاسق نہیں ہیں تو آخر کیوں؟ جو شخص رِشوت، جھوٹ، مکر و فریب قتلِ نفس، اجرائے بدعت، غلول (مالِ غنیمت میں خیانت)، جھوٹی گواہی، جھوٹی نسبت، اعانتِ ظلم اور دیاثت (مسلمان عورتوں کی آبرو ریزی پر عملاً راضی رہنا) جیسے سنگین اور گھناؤنے جرائم کا مجرم ہو اسے آخر کس بناء پر فسق کے الزام سے بَری کیا جاسکتا ہے؟ ان تمام جرائم کا الزام اس کے سر تھوپنے کے بعد بات کو یہ کہہ کر کیسے جھٹلایا جاسکتا ہے کہ:-

> کسی شخص کے ایک دو یا چند معاملات میں عدالت کے منافی کام کر گزرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کی عدالت کی کلی نفی ہو جائے اور وہ عادل کے بجائے فاسق قرار پائے۔ (ص:۳۰۴)

کیا ان جرائم کو ''ایک دو یا چند'' گناہ ''کر گزرنے'' سے تعبیر کرنا، اس ''لیپ پوت'' کی تعریف میں نہیں آتا جس سے مولانا مودودی صاحب بچنا چاہتے ہیں؟ جبکہ ان گناہوں میں سے ہر گناہِ کبیرہ ہے، اس پر عذاب جہنم کی شدید وعیدیں وارِد ہوئی ہیں، اور خود مولانا مودودی صاحب کے کہنے کے مطابق یہ گناہ اتفاقی طور سے سرزد نہیں ہو گئے تھے، بلکہ باقاعدہ ''پالیسی'' بنالیا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے جو کچھ حضرت معاویہؓ کے بارے میں لکھا ہے، اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو انہیں ''فسق'' کے الزام سے بَری قرار دینے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں، پھر تو لازماً یہ کہنا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) وہ فاسق تھے، اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں ''الصحابة کلهم عدول'' کا عقیدہ سلامت نہیں رہ سکتا، اور پھر اس ایک عقیدے پر کیا موقوف ہے، اسلام کے سارے عقائد اور سارے اَحکام ہی خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔

## تاریخی روایات کا مسئلہ

مولانا مودودی صاحب نے اپنی کتاب کے ضمیمے میں اس پہلو پر بھی بحث کی ہے کہ جن تاریخی کتابوں کے حوالے سے انہوں نے روایات نقل کی ہیں، وہ قابلِ اعتماد ہیں یا نہیں؟ انہوں نے حدیث اور تاریخ کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جرح و تعدیل کے معروف طریقے دراصل اَحکامی احادیث کے لئے مقرّر کئے گئے ہیں، اور تاریخی روایات کی اس معیار پر تحقیق شروع کی گئی تو تاریخِ اسلام کا کم از کم $\frac{9}{10}$ حصہ ناقابلِ قبول ہوجائے گا۔

یہاں ہمیں دو گزارشیں کرنی ہیں:-

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ بات کہتے وقت مولانا نے مسئلے کی صحیح نوعیت کو محسوس نہیں فرمایا، یہ مسئلہ جو اس وقت زیرِ بحث ہے، محض تاریخ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ عقائد و کلام کا مسئلہ ہے، مشاجراتِ صحابہؓ میں کون حق پر تھا؟ کس سے کس قسم کی غلطی سرزد ہوئی؟ اور اس غلطی کا اثر عدالتِ صحابہؓ کے عقیدے پر کیا پڑتا ہے؟ یہ تمام مسائل عقائد کے مسائل ہیں، ساری اُمت ان مسائل کو عقائد کا جزو مانتی آئی ہے، علمِ عقائد و کلام کی کوئی کتاب ان سے خالی نہیں ہے، اور ان ہی مسائل کی بنیاد پر اسلام میں بہت سے فرقے پیدا ہوگئے ہیں۔ اور جب مولانا مودودی صاحب خود یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ اَحکامِ شریعت کا استنباط ان مجروح تاریخی روایات سے نہیں ہوسکتا تو عقائد کا معاملہ بہرحال بلند ہے، علماء کی تصریح کے مطابق ''صحیح'' بلکہ ''حسن'' خبرِ واحد سے بھی اَحکام کا استنباط ہوسکتا ہے، لیکن عقائد کے استنباط کے لئے نری خبرِ واحد بھی کافی نہیں ہوتی، ایسی صورت میں اس مسئلے کا فیصلہ ان مجروح تاریخی روایات کی بنیاد پر کیونکر کیا جاسکتا ہے؟ کیا کسی صحابیٔ رسول پر گناہِ کبیرہ کا الزام عائد کرنا اتنی ہی معمولی بات ہے کہ اس کے کہنے والے کے بارے میں یہ تحقیق کرنے کی اجازت بھی نہ دی جائے کہ وہ کون تھا؟ اس کے عقائد کیسے تھے؟ اور وہ جھوٹا تھا یا سچا تھا؟

یہ بات صرف عقیدت اور محبت کی بنیاد پر نہیں کہی جارہی، بلکہ یہ عقل کا

فطری تقاضا ہے کہ جس شخص کی زندگی میں مجموعی طور سے خیر غالب ہو، اس پر کسی گناہِ کبیرہ کا الزام اس وقت تک دُرست تسلیم نہیں کیا جائے جب تک وہ مضبوط اور قوی دلائل سے صحیح ثابت نہ ہو چکا ہو۔ صحابہ کرامؓ کا معاملہ تو بہت بلند ہے، ہم تو دیکھتے ہیں کہ تمام معقولیت پسند لوگ عام مسلمانوں کے بارے میں اسی طرزِ فکر کو ضروری سمجھتے ہیں، آسانی کے لئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

مولانا مودودی صاحب سے بہت سے مسائل میں اختلاف کے باوجود ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ اتنے باکردار ضرور ہیں کہ اپنا ضمیر بیچ کر ملک و ملت کی غداری پر آمادہ نہیں ہوسکتے۔ اب اگر کوئی شخص آکر یہ اطلاع دے کہ وہ (خدا نہ کردہ) ضمیرفروشی اور ملت کی غداری کے مرتکب ہوئے ہیں، تو کیا اس خبر کی مکمل تحقیق کئے بغیر اس کی تصدیق کرلینا کسی معقولیت پسند انسان کا کام ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں! ہر حقیقت پسند انسان اس خبر کی تصدیق کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ یہ خبر دینے والا کون ہے؟ اس نے کس سے یہ بات سنی ہے؟ بلاواسطہ سنی ہے یا بیچ میں کوئی واسطہ ہے؟ یہ واسطے کس حد تک قابلِ اعتماد ہیں؟ اور ان میں کوئی شخص ایسا تو نہیں جو مولانا سے عناد رکھتا ہو؟ اگر تحقیق کے بعد یہ ثابت ہو کہ یہ خبر دینے والے ناقابلِ اعتماد ہیں، یا ان میں سے کوئی ایک شخص افواہ طراز ہے، یا ان کا معاند ہے تو کیا پھر بھی اس خبر کو بنیاد بنا کر مولانا پر یہ تہمت لگانا قرینِ انصاف ہوگا؟ اور اگر یہ خبر کسی مستند اخبار میں چھپ جائے تو کیا اس کے بعد اس کے راویوں کی تحقیق ممنوع قرار پائے گی؟ اور جو شخص اس مطبوعہ خبر کی تردید کے لئے اس کے راویوں کے حالات کی چھان بین کرے کیا اسے یہ کہہ کر روکا جاسکے گا کہ اس اخبار کا ایڈیٹر ثقہ آدمی ہے، لہٰذا اس کی چھاپی ہوئی ہر خبر قابلِ تسلیم ہے؟ اور اگر کوئی شخص رپورٹروں کو ناقابلِ اعتماد قرار دے کر اس خبر کو جھٹلائے تو کیا اسے یہ طعنہ دیا جاسکے گا کہ اگر ان غیر معتبر رپورٹروں کی یہ بات تسلیم نہیں کرتے تو اخبار کی کوئی خبر تسلیم کرنے کا تمہیں حق نہیں ہے کیونکہ اخبار کی تمام خبریں انہی رپورٹروں کی دی ہوئی ہیں؟

اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے، اور ظاہر ہے کہ نفی ہی میں ہے، تو

پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت معاویہ اور دُوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ تحقیق ممنوع قرار پا جاتی ہے، اور جو شخص ان پر گناہِ کبیرہ کا الزام عائد کرنے والے راویوں کی تحقیق کے لئے اسماء الرجال کی کتابیں کھولنا چاہتا ہے وہ مولانا مودودی صاحب کے نزدیک گردن زدنی ہوتا ہے؟

مولانا مودودی صاحب نے اس فرق پر بہت زور دیا ہے جو حدیث اور تاریخ کے معیارِ استناد میں ان کے نزدیک ملحوظ رہنا چاہئے۔ ان کا کہنا ہے کہ واقدی، سیف بن عمر، کلبی اور ابو مخنف جیسے راوی ''اَحکامی احادیث'' میں تو واقعی ناقابلِ اعتماد ہیں، مگر تاریخی واقعات میں ان کے بیانات قابلِ قبول ہیں۔ مولانا نے فرمایا ہے کہ اگر تاریخ کے معاملے میں بھی انہیں ناقابلِ اعتماد قرار دے دیا گیا تو ہماری تاریخ کا کم از کم $\frac{9}{10}$ حصہ بالکل غیر معتبر قرار پا جائے گا۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، تاریخی واقعات میں ان راویوں کے قابلِ اعتماد ہونے کے معنی یہ نہیں کہ ان کے بیان کئے ہوئے وہ واقعات بھی بے چوں و چرا تسلیم کر لئے جائیں جن کی زد عقائد یا اَحکام پر پڑتی ہے۔ کسی بات کے محض ''تاریخی'' ہونے کا فیصلہ صرف اس بات سے نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی تاریخ کی کتاب میں لکھی ہوئی ہے بلکہ اگر تاریخی کتابوں میں عقائد و اَحکام سے متعلق کوئی چیز آئے گی تو اسے جانچنے کے لئے لازماً وہی اُصول استعمال کرنے پڑیں گے جو عقائد و اَحکام کے استنباط کے لئے مقرّر ہیں۔

واقعہ یہ ہے بعض راویوں کے بارے میں علماء نے جو یہ کہا ہے کہ ''ان کی روایتیں اَحکام کے معاملے میں مردود اور سیر و تواریخ میں مقبول ہیں'' اس سے مراد سیر و تواریخ کے وہ واقعات ہیں جن سے عقائد و اَحکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا، کون سا غزوہ کون سے سن میں ہوا؟ اس میں کتنے افراد شریک تھے؟ اس کی قیادت کس نے کی؟ اس میں کس کو فتح اور کس کو شکست ہوئی؟ ظاہر ہے کہ یہ اور اس جیسے دُوسرے واقعات ایسے ہیں کہ ان سے عقائد و اَحکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چنانچہ ان معاملات میں

ضعیف راویوں کی روایات کو بھی گوارا کرلیا گیا ہے،[1] لیکن مشاجراتِ صحابہؓ اور صحابہؓ کی عدالت کے وہ مسائل جو خالص عقائد سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی بنیاد پر اسلام میں کئی کئی فرقے پیدا ہوگئے ہیں، ان میں ان راویوں کی روایات ہرگز قبول نہیں کی جاسکتیں، مذکورہ بالا مسائل کا فیصلہ قرآن وسنت اور اجماع کے مضبوط دلائل ہی سے ہوسکتا ہے۔

اس کی صاف اور سادہ سی مثال یہ ہے کہ آپ روزانہ اخبار میں بے شمار خبریں پڑھتے ہیں اور ان کے رپورٹروں کی تحقیق کو ضروری نہیں سمجھتے، لیکن جن خبروں سے کسی معروف شخصیت پر کوئی سنگین الزام لگتا ہو یا ان سے کوئی شرعی مسئلہ متأثر ہوتا ہو انہیں تسلیم کرنے سے پہلے ہر معقول آدمی اس خبر کی تحقیق کرتا ہے، اور اگر معلوم ہو کہ رپورٹر ناقابلِ اعتماد تھے تو اس خبر کی تصدیق نہیں کرتا۔ آج فلاں جگہ بس اُلٹ گئی، فلاں شہر میں زلزلہ آگیا، فلاں مقام پر فلاں سیاسی جماعت کا اجلاس منعقد ہوا، فلاں فلاں لیڈر نے ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا، اگر یہ خبریں کسی ذمہ دار اخبار میں شائع ہوئی ہوں تو آپ انہیں تسلیم کرلیتے ہیں خواہ آپ کو یہ یقین ہو کہ اس خبر کا رپورٹر کوئی دہریہ ہے، لیکن اگر یہی دہریہ رپورٹر یہ خبر دے کہ فلاں مشہور عالمِ دین نے چوری کرلی ہے یا فلاں مشہور سیاسی لیڈر نے کسی غیرملکی سفارت خانے سے جاسوسی کی رقم حاصل کی ہے، تو آپ محض اخبار کی خبر پر اعتماد کرنے کے بجائے لازماً اس خبر کی پوری تحقیق کرتے ہیں اور جب تک مضبوط دلائل سے خبر دُرست ثابت نہ ہوجائے، آپ اس عالمِ دین کو چور یا سیاسی لیڈر کو ضمیر فروش قرار نہیں دے سکتے۔

اگر کوئی شخص رپورٹروں کو ناقابلِ اعتماد اور جھوٹا ثابت کرکے ایسی خبروں کی تردید کرے تو کیا اس سے یہ کہا جاسکے گا کہ یا تو اخبار کا $\frac{9}{10}$ حصہ جو انہی رپورٹروں

---

(۱) ''گوارا کرنے'' کا مفہوم یہاں بھی یہ نہیں ہے کہ ان روایتوں کا مطالعہ کرتے وقت نقد ونظر کے تمام اُصولوں پر بالکل ہی تالا ڈال دیا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ صرف ان راویوں کے ضعف کی بنیاد پر ان روایتوں کو رَدّ نہیں کردیں گے۔ چنانچہ اگر کچھ دُوسرے دلائل ان کے خلاف مل جائیں تو ان روایات کو بھی تسلیم کرنے پر اصرار نہیں کیا جائے گا۔

نے مرتب کیا ہے، رَدّ کردو، یا ان خبروں کو بھی بے چوں و چرا دُرست مانو؟ اگر یہ کہنا دُرست نہیں ہے اور کوئی معقول انسان اس اعتراض کو دُرست نہیں کہہ سکتا، تو بیچاری تاریخِ اسلام ہی اتنی لاوارث کیوں ہے کہ اس کی تحقیق وتنقید کا ہر دروازہ بند ہوگیا ہے اور اب کوئی شخص اس مقصد کے لئے اسماء الرجال کی کتابیں نہیں کھول سکتا؟

یہی وہ بات ہے جسے اہل السنۃ والجماعۃ کے علماء شروع سے کہتے چلے آئے ہیں کہ ان ضعیف تاریخی روایات کے ذریعے صحابہ کرامؓ پر کسی گناہ کا الزام عائد نہیں کیا جاسکتا، مثال کے طور پر علامہ احمد بن حجر الہیثمیؒ اپنی مشہور کتاب "الصواعق المحرقة" میں لکھتے ہیں:-

> والواجب أيضًا علٰى كل من سمع شيئًا من ذٰلک أن يتثبت فيه ولا ينسبه إلٰى أحد منهم بمجرد روية في كتاب أو سماعه من شخص بل لا بد أن يبحث عنه حتّٰى يصح عنده نسبته إلٰى أحدهم فحينئذ الواجب أن يلتمس لهم أحسن التأويلات.[1]

ترجمہ:- اور جو شخص (صحابہ کرامؓ کی لغزشوں سے متعلق) کچھ سنے تو اس پر واجب ہے کہ اس معاملے میں تحقیق سے کام لے اور صرف کسی کتاب میں دیکھ لینے یا کسی شخص سے سن لینے کی بناء پر اس غلطی کو ان میں سے کسی کی طرف منسوب نہ کرے، بلکہ یہ ناگزیر ہے کہ اس کی پوری تحقیق کرے، یہاں تک کہ اس کی نسبت ان کی طرف صحیح ثابت ہوجائے، اس مرحلے پر یہ واجب ہے کہ ان کے لئے تأویلات تلاش کرے۔

اور اپنی ایک دُوسری کتاب تطہیر الجنان میں رقم طراز ہیں:-

---

(۱) الهيثميؒ: الصواعق المحرقة في الردّ علٰى أهل البدع والزندقة ص:۱۲۹، مصطفى البابي، مصر ۱۳۲۴ھ اس حوالے کے لئے ہم محترم جناب مولانا محمد یوسف صاحب خطیب جامع اہلِ حدیث مصطفیٰ آباد لاہور کے شکر گزار ہیں۔

لا يجوز لأحد أن يذكر شيئًا مما وقع بينهم يستدل به علٰى بعض نقص من وقع له ذٰلك والطعن في ولايته الصحيحة أو ليغري العوام علٰى سبهم وثلبهم ونحو ذٰلك من المفاسد، ولم يقع ذٰلك إلا للمبتدعة وبعض جهلة النقلة الذين ينقلون كلما رأوه ويتركونه علٰى ظاهره غير طاعنين في سنده ولا مشيرين لتأويله وهٰذا شديد التحريم لما فيه من الفساد العظيم وهو إغراء للعامة ومن في حكمهم علٰى تنقيص أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم الذين لم يقم الدين إلا بنقلهم إلينا كتاب الله وما سمعوه وشاهدوه من نبيه من سنته الغراء والواضحة البيضاء.(۱)

ترجمہ:- صحابہ کرامؓ کے درمیان جو واقعات ہوئے ہیں، کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ انہیں ذکر کر کے ان کے نقص پر استدلال کرے اور اس کے ذریعہ کسی صحابی کی ولایتِ صحیحہ پر معترض ہو، یا عوام کو انہیں بُرا بھلا کہنے پر اُکسائے۔ یہ کام صرف اہلِ بدعت کا ہے اور بعض ان جاہل ناقلوں کا جو ہر اس چیز کو نقل کر دیتے ہیں جو انہوں نے کہیں دیکھ لی ہو اور اس سے اس کا ظاہری مفہوم مراد لیتے ہیں، نہ اس روایت کی سند پر کوئی طعن کرتے ہیں اور نہ اس کی تأویل کی طرف اشارہ کرتے ہیں، یہ بات سخت حرام و ناجائز ہے کیونکہ اس سے فسادِ عظیم رُونما ہوسکتا ہے، اور یہ عام لوگوں کو صحابہؓ کے خلاف اُکسانے کے مترادف ہے، حالانکہ ہم تک دِین کے پہنچنے کا واسطہ یہی صحابہؓ ہیں جنھوں نے قرآن وسنت کو ہم تک نقل کیا ہے۔

---

(۱) تطهير الجنان واللسان بهامش الصواعق المحرقة ص:۶۵۔

اور علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور کتاب "العقیدۃ الواسطیۃ" میں اہلِ سنت کے امتیازی عقائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

إن هٰذه الآثار المروية في مساويهم منها ما هو كذب ومنها ما قد زيد فيه ونقص وغير وجهه، والصحيح منه هم فيه معذورون، إما مجتهدون مصيبون وإما مجتهدون مخطئون، وهم مع ذٰلك لا يعتقدون أن كل واحد من الصحابة معصوم من كبائر الإثم وصغائره بل يجوز عليهم الذنوب في الجملة، ولهم من الفضائل والسوابق ما يوجب مغفرته ما يصدر منهم إن صدر.(۱)

ترجمہ:- (اہلِ سنت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ) جن روایات سے صحابہ کرامؓ کی بُرائیاں معلوم ہوتی ہیں ان میں سے کچھ تو جھوٹ ہی جھوٹ ہیں اور کچھ ایسی ہیں کہ اس میں کمی بیشی کردی گئی ہے اور ان کا اصل مفہوم بدل دیا گیا ہے، اور ان میں سے جو روایتیں صحیح ہیں، ان میں صحابہؓ معذور ہیں، یا تو مجتہدِ برحق ہیں یا اجتہادی غلطی کے مرتکب، لیکن اس کے باوجود اہلِ سنت کا عقیدہ یہ بھی نہیں ہے کہ صحابہؓ کا ہر ہر فرد چھوٹے بڑے تمام گناہوں سے معصوم تھا، بلکہ فی الجملہ ان سے گناہ صادر ہوسکتے ہیں، مگر ان کی فضیلتیں اتنی ہیں کہ اگر کوئی گناہ صادر ہوا بھی ہو تو یہ فضائل ان کی مغفرت کا موجب ہیں۔

اہلِ سنت کی لکھی ہوئی عقائد وکلام کی تمام کتابیں پڑھ جائیے، وہ اوّل سے آخر تک اس معاملے میں یک زبان نظر آئیں گی کہ صحابہ کرامؓ سے کسی گناہ کا صدور خالصۃً عقائد کا مسئلہ ہے اور اس کا اثبات ضعیف، مجروح، منقطع یا بلاسند تاریخی روایتوں سے نہیں ہوسکتا، خاص طور سے مشاجراتِ صحابہؓ کے معاملے میں اس اُصول کی

(۱) الروضة الندية شرح العقيدة الواسطية لزيد بن عبدالعزيز ص:۴۴۹، مطابع الرياض ۱۳۷۷ھ

بڑی شدّت کے ساتھ پابندی کی ضرورت ہے کیونکہ بقول علامہ ابنِ تیمیہؒ حضرت عثمانؓ کے شہادت کے بعد سبائی پروپیگنڈے کے اثر سے صحابہ کرامؓ پر بے بنیاد تہمت طرازیوں کا سلسلہ بہت وسیع ہوگیا تھا اور اس پروپیگنڈے کے اثرات سے مشاجرات کے زمانے کی تاریخ بھی محفوظ نہیں رہ سکی، یہی وجہ ہے کہ تمام اہلِ سنت نے حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے اختلاف کو اجتہادی اختلاف اور حضرت معاویہؓ کی غلطی کو اجتہادی غلطی قرار دیا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ جن روایات کی بنیاد پر آج مولانا مودودی صاحب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو "حقیقی غلطی" اور سیاسی اغراض کے لئے قرآن و سنت کی صریح خلاف ورزی کا مجرم قرار دے رہے ہیں، وہ روایات آج چودھویں صدی میں کوئی نئی دریافت نہیں ہوگئی ہیں، بلکہ یہ تیرہ صدیوں سے مسلمانوں کی تواریخ میں نقل ہوتی چلی آرہی ہیں، اس کے باوجود اہلِ سنت کے کسی ایک فرد نے بھی ان کی بناء پر حضرت معاویہؓ پر یہ الزام نہیں لگایا بلکہ عقائد کی جس کتاب کو اُٹھا کر دیکھئے اس میں یہی لکھا ہوا ملے گا کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ سے اجتہادی غلطی ہوئی تھی۔[1] سوال یہ ہے کہ کیا عقائد کے یہ علماء و ائمہ سب کے سب تاریخی روایتوں

---

(۱) دیکھئے: شرح الفقه الأكبر ص:۸۲، والنبراس على شرح العقائد ص:۵۴۹، امرتسر، والصواق المحرقة ص:۱۲۹، مصطفى البابى، مصر ۱۳۲۴ھ، و شرح العقيدة الواسطية ص:۴۴۹ تا ۴۵۱، الرياض ۱۳۷۷ھ، والعواصم من القواصم ص:۶۸، المكتبة السَّلفية، قاهرة ۱۳۷۱ھ، ومکتوبات مجدد الف ثانی، دفتر اوّل، بریلی ۱۳۸۶ھ، ولوامع الأنوار البهية للسفارينى ج:۲ ص:۳۸۶، دار الاصفهانی، جدة ۱۳۸۰ھ، والمسامرة بشرح المسايرة ص:۱۳۲، دارالعلوم دیوبند ۱۳۷۷ھ، ومرقاة المفاتيح ج:۵ ص:۱۴۸، الميمنية، مصر ۱۳۹۰ھ۔ یہ چند حوالے سرسری طور سے لکھ دیئے ہیں، ورنہ اہلِ سنت کا کوئی عالم ہماری نظر میں نہیں ہے جس نے حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو اجتہادی غلطی سے زیادہ کچھ کہا ہو۔ یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ جن لوگوں نے حضرت معاویہؓ کے لئے "باغی" یا "امامِ جائر" کا لفظ استعمال کیا ہے ان کی مراد بھی خود ان کی تصریح کے مطابق صرف یہی ہے کہ وہ حضرت حسنؓ کی صلح سے قبل نفس الامر کے اعتبار سے برسرِ حق نہ تھے، ورنہ چونکہ ان کی یہ "بغاوت" تأویل کے ساتھ تھی اس لئے وہ مجتہد مخطی تھے، ملاحظہ فرمائیے: فتح القدير ج:۵ ص:۴۶۱، وازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء ج:۱ ص:۷، و تطهير الجنان بهامش الصواعق ص:۴۰۔

سے بے خبر تھے؟ یا انہیں ان روایتوں کا علم تو تھا مگر اتنی فہم نہیں تھی کہ وہ اجتہادی غلطی اور حقیقی غلطی میں تمیز کر سکتے؟ یا انہیں روایات کا علم بھی تھا اور وہ ان کا مطلب بھی سمجھتے تھے مگر عقائد کی کتابیں مرتب کرتے وقت انہوں نے خیانت سے کام لیا اور اصلی واقعات کو چھپا کر محض جذباتی جوشِ عقیدت پر عقائد کی تعمیر کھڑی کر دی؟ اگر کوئی شخص ان میں سے کوئی بات اہلِ سنت کے تمام علماء، تمام ائمہ اور تمام متکلمین کے بارے میں کہہ سکتا ہے تو صاف صاف کہے اور واضح الفاظ میں اعلان کرے کہ وہ اہلِ سنت کے عقائد کا پابند نہیں ہے، لیکن اگر ان حضرات کے بارے میں ان میں سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی تو ان کے اس طرزِ عمل کا اس کے سوا مطلب کیا ہے کہ انہوں نے ان مجروح تاریخی روایات کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا اور ان کو اس لائق قرار نہیں دیا کہ ان کی بناء پر صحابہؓ میں سے کسی کو گناہ کا ملزم قرار دیا جائے، یہاں تک کہ حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے جنھوں نے خود اس قسم کی روایات اپنی تاریخ میں نقل کی ہیں، وہ جنگِ صفّین کے بیان کے بعد لکھتے ہیں:-

> وهذا هو مذهب أهل السُّنّة والجماعة أن عليًّا هو المصيب وإن كان معاوية مجتهدًا، وهو مأجور إن شاء الله.(۱)
>
> ترجمہ:- یہی اہلِ سنت والجماعت کا مسلک ہے کہ حضرت علیؓ حق پر تھے، اگرچہ حضرت معاویہؓ بھی مجتہد ہونے کی وجہ سے اِن شاء اللہ ماجور ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ان روشن دلائل کی موجودگی میں کوئی انصاف پسند انسان مولانا مودودی صاحب کے اس موقف کو دُرست تسلیم نہیں کر سکتا کہ صحابہ کرامؓ پر نفسانیت پرستی اور ارتکابِ کبائر کا الزام عائد کرنے والی روایات کو ان کے ضعیف اور مجروح ہونے کے باوجود قبول کر لیا جائے، اور اس سلسلے میں ہر قسم کی جرح و تنقید کو ممنوع قرار دے دیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اس معاملے میں مولانا مودودی صاحب کا یہ عجیب و غریب طرزِ عمل اختیار کر لیا جائے تو کسی صحابی کی آبرو محفوظ نہیں رہ

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۲۷۹۔

سکتی اور کل کوئی نیا محقق اسی قسم کی روایات کے بل پر خود حضراتِ شیخینؓ پر بڑی آسانی سے دست درازی کر کے ان کے عہدِ خلافت ہی میں ملوکیت کے جراثیم دِکھلا سکتا ہے۔

آج سے سالہا سال پہلے خود مولانا مودودی صاحب یہ لکھ چکے ہیں کہ اگر اس قسم کی روایات کو مان لیا جائے تو اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تیار کئے ہوئے معاشرے کی کیا تصویر سامنے آتی ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:-

> اگر آپ اس تاریخ کو باور کرتے ہیں تو پھر آپ کو محمد رسول اللہ مبلغِ قرآن، داعئ اسلام، مزکئ نفوس، کی شخصیت پر اور ان کی تعلیم و تربیت کے تمام اثرات پر خطِ نسخ کھینچ دینا پڑے گا اور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس پاکیزہ ترین انسان کی ۲۳ سالہ تبلیغ و ہدایت سے جو جماعت تیار ہوئی تھی، اور اس کی قیادت میں جس جماعت نے بدر و اُحد اور احزاب و حنین کے معرکے سر کر کے اسلام کا جھنڈا دُنیا میں بلند کیا تھا، اس کے اخلاق، اس کے خیالات، اس کے مقاصد، اس کے ارادے، اس کی خواہشات اور اس کے طور طریق عام دُنیا پرستوں سے ذرّہ برابر مختلف نہ تھے۔ (۱)

(۱) رسائل و مسائل ج:۱ ص:۲۷، اسلامک پبلی کیشنز لاہور ۱۹۵۱ء۔

# حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت کی صحیح حیثیت

آخر میں ہم اس سوال کا مختصر جواب دینا چاہتے ہیں کہ اگر حضرت معاویہؓ پر عائد کردہ یہ الزامات غلط ہیں تو پھر ان کے عہدِ حکومت کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ ٹھیک اسی معیار اور مرتبے کے خلیفہ تھے جو معیار اور مرتبہ خلفائے راشدینؓ کو حاصل تھا یا نہیں؟ اگر تھے تو انہیں خلیفۂ راشد کیوں قرار نہیں دیا گیا؟ اور اگر نہیں تھے تو ان میں اور خلفائے راشدینؓ میں فرق کیا تھا؟

یہ سوال ایک معقول سوال ہے، ہمارے نزدیک، اور صرف ہمارے نزدیک ہی نہیں، جمہور اہلِ سنت کے نزدیک بلاشبہ ان کی خلافت اور خلفائے راشدینؓ کی خلافت دونوں ایک معیار کی نہیں تھی، بلکہ دونوں میں فرق تھا، لیکن اس فرق کی جو تشریح مولانا مودودی صاحب نے فرمائی ہے، وہ نہ معقول ہے، نہ مستند طریقے سے ثابت ہے اور نہ اہلِ سنت کے عقائد سے میل کھاتی ہے۔ مولانا مودودی صاحب نے حالات کے اس تغیر کی جو تشریح کی ہے، اس سے ذہن میں نقشہ کچھ اس طرح بنتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد یک بیک حالات بالکل پلٹ گئے، خلافتِ راشدہ تمام مثالی خوبیوں کا مجموعہ تھی، مگر حضرت معاویہؓ کے خلافت سنبھالتے ہی اس میں ملوکیت کی تمام خرابیاں پیدا ہوگئیں، تقویٰ کے فوراً بعد فسق حکمراں ہوگیا، اور جو معاشرہ خلافتِ راشدہ کے عہد میں تاریخ کا پاکیزہ ترین معاشرہ تھا، اسی معاشرے میں حضرت معاویہؓ کے عہد میں نفسانیت کی تمام پستیاں جمع ہوگئیں۔ ۴۰ھ تک خلافت کی طرف سے علانیہ قانون شکنی کا تصوّر نہ ہوسکتا تھا، اور ۴۱ھ میں قانون شکنی ''بدعت'' اور ''تحریفِ دین'' کی حد تک پہنچ گئی، ۴۰ھ میں رشوت ستانی

کا خیال کسی کو نہ آتا تھا، ۴۱ھ میں اسے شیرِ مادر سمجھ لیا گیا، ۴۰ھ تک کافروں کو بھی سبّ وشتم نہ کیا جاتا تھا، اور یہاں جلیل القدر صحابہ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ ہونے لگی، پہلے مالِ غنیمت میں خورد بُرد کا شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اور ایک ہی دو سال میں اب باقاعدہ اس خیانت کے لئے اَحکام جاری ہونے لگے، پہلے کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ اپنے اقتدار کے سہارے لوگوں پر ظلم وستم کرسکے، اور اب یہ ظلم وستم خود مرکز کی پالیسی قرار پاگئی، پہلے عوام کی غیرت اور حکام کی خداترسی کا عالم یہ تھا کہ معمولی سے معمولی آدمی خلیفہ کا گریبان تھام سکتا تھا اور اب ایک ہی سال کے فرق سے لوگوں کی بے غیرتی اور حاکم کے جبر وتشدّد کا یہ حال ہوگیا کہ ضمیروں پر قفل چڑھ گئے اور کوڑے حق گوئی کا انعام بن گئے۔ غرضیکہ ۴۰ھ کے ختم ہوتے ہی شخصی مفادات پر مبنی سیاست کا وہ بازار گرم ہوگیا جو آج بیسویں صدی میں ہمیں نظر آتا ہے۔

یہ صورتِ حال نہ صرف یہ کہ حالات کی اس تدریج کے خلاف ہے جو عموماً تاریخ میں کارفرما ہوا کرتی ہے، بلکہ اگر اس صورتِ حال کو تسلیم کرلیا جائے تو "ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم" کے ارشادِ نبوی کا کوئی مطلب نہیں رہتا۔

لہٰذا خلافتِ راشدہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت میں فرق تو بے شک تھا، لیکن وہ تقویٰ اور فسق کا فرق نہ تھا، بلکہ اس فرق کی بہترین تشریح وہ ہے جو مشہور صحابی حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمائی ہے۔

حضرت عدی بن حاتمؓ حضرت علیؓ کے سرگرم حامیوں میں سے تھے، صفّین وغیرہ کی جنگوں میں انہوں نے کھل کر حضرت علیؓ کا ساتھ دیا اور حضرت معاویہؓ کے زمانے میں بھی وہ اپنے اس موقف پر مضبوطی سے قائم رہے، ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے ان سے پوچھا کہ: "ہمارے عہدِ حکومت کے بارے میں تمہارا خیال ہے، وہ کیسا ہے؟" حضرت عدیؓ نے فرمایا کہ: "اگر سچ کہیں تو تمہارا خوف ہے اور جھوٹ کہیں تو اللہ کا" حضرت معاویہؓ نے فرمایا: "میں تمہیں قسم دیتا ہوں، سچ سچ بیان کرو۔"

اس پر حضرت عدیؓ نے ارشاد فرمایا:-

عدل زمانکم ھٰذا جور زمان قد مضٰی، وجور زمانکم ھٰذا عدل زمان ما یأتی.(۱)

ترجمہ:- تمہارے زمانے کا انصاف پہلے زمانے کا ظلم تھا، اور تمہارے زمانے کا ظلم آئندہ زمانے کا انصاف ہوگا۔

حضرت عدیؓ کے اس جامع جملے کا مطلب ہی یہ ہے کہ حضرات خلفائے راشدینؓ احتیاط وتقویٰ اور احساسِ ذمہ داری کے جس معیارِ بلند پر فائز تھے، بعد میں وہ معیار باقی نہیں رہا۔ خلفائے راشدینؓ عزیمت پر عامل تھے اور حضرت معاویہؓ نے رُخصتوں میں توسع سے کام لیا، وہ حضرات اپنی عمومی زندگی میں تقویٰ اور احتیاط پر عمل کرتے تھے اور حضرت معاویہؓ مباحات کی حد تک خلافِ احتیاط باتوں کو بھی گوارا کرلیتے تھے، مثلاً خلفائے راشدینؓ نے عزیمت اور احتیاط پر عمل کرتے ہوئے اپنے بیٹوں کو ولی عہد نہیں بنایا، باوجودیکہ ان کے صاحبزادوں میں خلافت کی شرائط پائی جاتی تھیں، اس کے برخلاف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رُخصت پر عمل کرتے ہوئے بیٹے کو ولی عہد بنادیا۔ خلفائے راشدینؓ نے عزیمت اور احتیاط کے تحت اپنا طرزِ معیشت نہایت فقیرانہ بنایا ہوا تھا مگر حضرت معاویہؓ نے رُخصت و اِباحت پر عمل کیا اور ان کے مقابلے میں نسبتاً فراخیٔ عیش اختیار فرمائی۔(۲) خلفائے راشدینؓ کے احساسِ ذمہ داری کا عالم یہ تھا کہ وہ عوام کے ایک ایک فرد کی خبر گیری اس کے گھر جاجاکر کیا کرتے تھے، اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں ایسی کوئی بات مروی نہیں ہے، خلفائے راشدینؓ کی اِصابتِ رائے اور صحتِ اجتہاد کا عالم یہ تھا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اِتباع کے ساتھ ان کے اِتباع کا حکم فرمایا، لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں جمہور اُمت کا عقیدہ یہ ہے کہ

---

(۱) الیعقوبی ج:۲ ص:۲۳۳، دار صادر بیروت ۱۳۷۹ھ۔

(۲) مگر یہ فراخیٔ عیش بھی آج کل کے حکمرانوں کی سی عیش کوشی نہ تھی، یونس بن میسرہؒ کہتے ہیں کہ: میں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو دمشق کے بازاروں میں اس حالت میں چلتے دیکھا ہے کہ انہوں نے پیوند لگی ہوئی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ (البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۴)

ان سے متعدّد اجتہادی غلطیاں سرزد ہوئیں۔

اسی قسم کی چیزیں تھیں جن کے بارے میں حضرت عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:-

تمہارے زمانے کا انصاف پہلے زمانے کا ظلم تھا۔

عقائد کے علماء و ائمہ نے بھی خلفائے راشدینؓ اور حضرت معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں یہی فرق بیان فرمایا ہے، علامہ عبدالعزیز فرہاری رحمۃ اللہ علیہ جو علمِ عقائد کے مشہور محقق عالم ہیں، تحریر فرماتے ہیں:-

قلت لأهل الخير مراتب بعضها فوق بعض و كل مرتبة منها يكون محل قدح بالنسبة إلى التى فوقها .... ولذا قيل حسنات الأبرار سيئات المقربين وفسر بعض الكبراء قوله عليه السلام: إنى لأستغفر الله فى اليوم أكثر من سبعين مرة، بأنه كان دائم الترقى و كلما كان يترقى إلى مرتبة استغفر عن المرتبة التى قبلها وإذا تقرر ذلك فنقول كان الخلفاء الراشدون لم يتوسعوا فى المباحات و كان سيرتهم سيرة النبى صلى الله عليه وسلم فى الصبر على ضيق العيش والجهد .... وأما معاوية فهو إن لم يرتكب منكرًا لكنه توسع فى المباحات ولم يكن فى درجة الخلفاء الراشدين فى أداء حقوق الخلافة لكن عدم المساواة بهم لا يوجب قدحا فيه.[1]

ترجمہ:- اہلِ خیر کے مختلف مراتب ہوتے ہیں، جن میں سے بعض دُوسرے بعض سے بلند ہوتے ہیں، اور ان میں سے ہر مرتبہ اپنے سے بلند مرتبے کے اعتبار سے قابلِ اعتراض ہوتا ہے .....اسی لئے مقولہ مشہور ہے کہ: "نیک لوگوں کی حسنات مقرب

(۱) النبراس علیٰ شرح العقائد ص:۵۱۰، مطبع روز بازار، امرتسر ۱۳۱۸ھ۔

لوگوں کی بُرائیاں ہوتی ہیں" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
جو یہ ارشاد مروی ہے کہ: "میں دن میں ستر سے زیادہ دفعہ اللہ
سے مغفرت طلب کرتا ہوں" اس کی تشریح بعض اکابر نے اس
طرح فرمائی ہے کہ آپؐ کے درجات میں ہر آن ترقی ہوتی رہتی
تھی، اور آپؐ جب بھی ترقی کا کوئی اگلا درجہ حاصل کرتے تو
پچھلے درجے سے اِستغفار فرماتے تھے، جب یہ بات طے ہوگئی تو
ہم یہ کہتے ہیں کہ خلفائے راشدینؓ نے مباحات میں توسع سے
کام نہیں لیا تھا اور تنگیٔ عیش پر صبر اور جدوجہد کے معاملے میں ان
کی سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھی ..... رہے
حضرت معاویہؓ سو انہوں نے اگرچہ کسی منکر (کھلے گناہ) کا
ارتکاب تو نہیں کیا لیکن انہوں نے مباحات میں توسع اختیار کیا،
اور حقوقِ خلافت کی ادائیگی میں وہ خلفائے راشدینؓ کے درجے
میں نہیں تھے، لیکن ان کی برابری نہ کرسکنا ان کے لئے کسی قدح
کا موجب نہیں ہے۔

غرضیکہ اگر اکابر صحابہ کرامؓ کو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں کچھ خرابیاں نظر آتی تھیں تو وہ خلفائے راشدینؓ کی نسبت سے تھیں، ظاہر ہے کہ جو حضرات ابوبکر وعمر اور عثمان وعلی رضی اللہ عنہم کا اندازِ حکومت دیکھ چکے تھے، انہیں حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں خامیاں نظر آئیں تو کچھ بعید نہیں ہے، لیکن اس سے اس بات کا کوئی جواز نہیں نکلتا کہ ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد کوئی شخص بعض صحابہ کرامؓ کے اس تأثر کو بنیاد بنا کر حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں آج کی گندی سیاست کے تمام مظاہرے تلاش کرنے شروع کردے اور تحقیق کے بغیر ان پر جھوٹ، خیانت، رِشوت، اخلاقی پستی، ظلم و جور، بے حمیتی اور سیاسی بازی گری کے وہ تمام الزامات عائد کر ڈالے جو آج سیاست دانوں میں نظر آتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کی نسبت سے ان کے عہدِ حکومت میں فرق

ضرور تھا، لیکن یہ فرق فسق و معصیت اور ظلم و جور کی حد تک نہیں پہنچا تھا، ان کی حکومت، حکومتِ عادلہ ہی تھی، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی ارشاد فرماتے ہیں:-

**ما رأيت أحدًا بعد عثمان أقضٰى بحق من صاحب هٰذا الباب يعني معاوية.**(۱)

ترجمہ:- میں نے عثمانؓ کے بعد کوئی شخص اس صاحبِ مکان یعنی معاویہؓ سے زیادہ حق کا فیصلہ کرنے والا نہیں دیکھا۔

اِمام ابوبکر اثرمؒ نے اپنی سند سے ابوہریرہ المکتب کا قول نقل کیا ہے کہ ہم مشہور محدث اِمام اعمشؒ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عدل وانصاف کا ذکر چل نکلا تو اِمام اعمشؒ نے فرمایا کہ: "(تم عمر بن عبدالعزیز کے انصاف پر حیران ہو) اگر معاویہؓ کا عہدِ حکومت پالیتے تو تمہارا کیا حال ہوتا؟" لوگوں نے پوچھا: "کیا ان کے حلم کے اعتبار سے؟" اِمام اعمشؒ نے جواب دیا: "نہیں، خدا کی قسم! ان کے عدل و انصاف کے اعتبار سے۔"(۲) اور حضرت قتادہؒ، حضرت مجاہدؒ اور حضرت ابواسحاق سبیعیؒ جیسے جلیل القدر تابعین اپنے زمانے کے لوگوں سے خطاب کرکے فرماتے ہیں کہ: "اگر تم حضرت معاویہؓ کا عہد پالیتے تو یہ کہنے پر مجبور ہوتے کہ یہ مہدی (ہدایت یافتہ) ہیں۔"(۳) اور کیوں نہ ہو؟ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہؓ کے حق میں یہ دُعا فرمائی تھی کہ:-

**اللّٰهم اجعله هاديًا مهديًا واهد به.**(۴)

ترجمہ:- اے اللہ! ان کو ہادی اور ہدایت یافتہ بنا اور ان کے ذریعے لوگوں کو ہدایت دے۔

یہاں یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۳۔

(۲و۳) منہاج السنۃ ج:۳ ص:۱۸۵، بولاق، مصر ۱۳۲۲ھ۔

(۴) تبویب مسند احمد (الفتح الربانی) ج:۲۲ ص:۳۵۶۔

''میرے بعد خلافت تیس سال تک رہے گی اور اس کے بعد کاٹ کھانے والی ملوکیت آجائے گی'' یہ تیس سال حضرت حسنؓ کے عہدِ خلافت پر ختم ہوجاتے ہیں اور اس کے بعد حضرت معاویہؓ کا عہدِ حکومت شروع ہوتا ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں بعض علماء نے اس حدیث کی سند پر تنقید کر کے اسے غیر صحیح قرار دیا ہے، چنانچہ قاضی ابوبکر ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ: ''ھٰذا حدیث لا یصح'' (یہ حدیث صحیح نہیں ہے)۔[۱]

اور بعض دُوسرے علماء نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث مجمل ہے اور اس میں تیس سال کے بعد ایک عمومی حکم بیان فرمایا گیا ہے، ہر ہر فرد کی تفصیلات بیان نہیں کی گئیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عہدِ حکومت اس سے باتفاق مستثنیٰ ہے، علامہ ابنِ حجر ہیتمیؒ فرماتے ہیں کہ ایک دُوسری حدیث میں اس کی تفصیل آئی ہے اور اس سے حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت کی صحیح حیثیت واضح ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

أوّل ھٰذا الأمر نبوۃ ورحمۃ ثم یکون خلافۃ ورحمۃ ثم یکون ملکًا ورحمۃ ثم یکون إمارۃ ورحمۃ ثم یتکادمون علیھا تکادم الحمیر.

علامہ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں کہ: ''رجالہ ثقات''[۲] (اس کے تمام راوی ثقہ ہیں)، اس حدیث میں واضح کردیا گیا ہے کہ خلافتِ راشدہ ختم ہونے کے بعد جو حکومت آئے گی وہ بھی ''ملوکیت ورحمت'' ہوگی، علامہ ابنِ حجر ہیتمیؒ اس کی مزید تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

بلاشبہ حضرت معاویہؓ کے عہدِ خلافت میں بہت سے ایسے اُمور واقع ہوئے جو خلفائے راشدینؓ کے عہد میں مانوس نہیں تھے اور

---

(۱) العواصم من القواصم ص:۲۰۱۔

(۲) تطہیر الجنان علیٰ ھامش الصواعق المحرقۃ ص:۳۱۔

ان ہی اُمور پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ان کی خلافت کو ''ملک عاض'' (کاٹنے والی ملوکیت) سے تعبیر کیا گیا، اگرچہ حضرت معاویہؓ اپنے اجتہاد کی وجہ سے مأجور ہی ہیں، اس لئے کہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ مجتہد اگر حق پر ہو تو اسے دو اَجر ملتے ہیں اور اگر غلطی پر ہو تو اسے ایک اَجر ملتا ہے، اور حضرت معاویہؓ بلاشبہ مجتہد تھے لہٰذا اگر ان سے اجتہاد میں غلطی ہوئی تب بھی انہیں ثواب ملا، اور یہ بات ان کے حق میں قابلِ اعتراض نہیں ہے، لیکن ان کی حکومت کو جو ان اجتہادی غلطیوں پر مشتمل تھی ''عاض'' ہی کہا گیا ..... (پھر معجم طبرانی کی مذکورہ روایت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں) ..... خلافت کے بعد جس ملوکیت کا ذکر ''طبرانی'' کی حدیث میں کیا گیا ہے، اس سے مراد حضرت معاویہؓ کی حکومت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ''رحمت'' قرار دیا ہے، لہٰذا ان کی حکومت میں ایک اعتبار سے ملکِ عضوض کی شان ہے اور ایک اعتبار سے رحمت کی، لیکن خارجی واقعات کے اعتبار سے یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں رحمت کی شان زیادہ ظاہر ہے اور ان کے بعد والے لوگوں میں ملکِ عضوض کی۔[1]

اپنی ایک اور کتاب میں علامہ ابنِ حجر ہیتمیؒ رقم طراز ہیں:-

حضرت سفینہؓ سے جو مروی ہے کہ حضرت معاویہؓ پہلے بادشاہ ہیں، اس سے یہ وہم نہ کیا جائے کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت صحیح نہ تھی، اس لئے کہ ان کی مراد یہ ہے کہ اگرچہ ان کی خلافت صحیح تھی لیکن اس پر ملوکیت کی مشابہت غالب آگئی تھی، اس لئے کہ وہ بہت سے معاملات میں خلفائے راشدینؓ کے طریقوں سے

---

(۱) تطهير الجنان على هامش الصواعق المحرقة ص:۳۱۔

نکل گئی تھی۔ لہٰذا خلافت کی بات اس لئے صحیح ہے کہ حضرت حسنؓ کی دست برداری اور اہلِ حل وعقد کے اتفاق کے بعد حضرت معاویہؓ کی خلافت حق اور صحیح تھی اور ملوکیت کی بات اس لئے دُرست ہے کہ ان کے عہدِ حکومت میں کچھ ایسے اُمور واقع ہوئے جن کا منشاء غلط اجتہاد تھا، جس کی بنیاد پر مجتہد تو گناہگار تو نہیں ہوتا لیکن اس کا رُتبہ ان لوگوں سے بہرحال گھٹ جاتا ہے جن کے اجتہادات صحیح اور واقعے کے مطابق ہوں اور یہ حضرات خلفائے راشدین اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم تھے، لہٰذا جو شخص حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت پر ملوکیت کے لفظ کا اطلاق کرتا ہے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ان کی حکومت میں مذکورہ اجتہادات واقع ہوئے اور جو شخص اسے خلافت قرار دیتا ہے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ حضرت حسنؓ کی دست برداری اور اہلِ حل وعقد کے اتفاق کے بعد وہ خلیفہ برحق اور واجب الاطاعت تھے اور اطاعت کے لحاظ سے لوگوں پر ان کے وہی حقوق تھے جو ان سے پہلے خلفائے راشدینؓ کو حاصل تھے۔ لیکن یہ بات ان کے بعد آنے والے لوگوں کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی اس لئے کہ وہ اجتہاد کے اہل نہیں تھے بلکہ ان میں سے بعض تو کھلے عاصی اور فاسق تھے اور انہیں کسی بھی اعتبار سے خلفاء میں شمار نہیں کیا جاسکتا، بلکہ وہ ملوک کی فہرست ہی میں آتے ہیں۔ [1]

اس پوری بحث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ اور خلفائے راشدینؓ کے عہدِ حکومت میں فرق تو بے شک تھا، حضرت معاویہؓ کی حکومت اس معیار کی نہیں تھی جو خلفائے راشدینؓ کو حاصل تھا، لیکن جمہور اُمت کے نزدیک یہ فرق اتنا بڑا نہیں تھا کہ ایک طرف تقویٰ ہو اور دُوسری طرف فسق وفجور یا ایک طرف عدل ہو

(۱) الصواعق المحرقة ص: ۱۳۱، میمنیة، مصر ۱۳۲۴ھ۔

اور دُوسری طرف ظلم و جور، بلکہ یہ فرق عزیمت و رُخصت کا، تقویٰ اور مباحات کا، احتیاط اور توسع کا اور اصابتِ رائے اور قصورِ اجتہاد کا فرق تھا۔ جن لوگوں نے اس فرق کا لحاظ کیا، انہوں نے ان کی حکومت کو ''ملوکیت'' کا نام دے دیا، اور جن لوگوں نے یہ دیکھا کہ یہ فرق فسق و فجور کی حد تک نہیں پہنچا تھا، انہوں نے اسے ''خلافت'' ہی قرار دیا، علامہ ابنِ تیمیہؒ نے بالکل صحیح فرمایا کہ:-

فلم یکن من ملوک المسلمین ملک خیر من معاویة ولا کان الناس فی زمان ملک من الملوک خیرًا منهم فی زمن معاویة إذا نسب أیامه إلیٰ أیام من بعده وأما إذا نسبت إلیٰ أیام أبی بکر وعمر ظهر التفاضل.[1]

ترجمہ:- مسلمان بادشاہوں میں سے کوئی حضرت معاویہؓ سے بہتر نہیں ہوا۔ اور اگر ان کے زمانے کا مقابلہ بعد کے زمانوں سے کیا جائے تو عوام کسی بادشاہ کے زمانے میں اتنے بہتر نہیں رہے جتنے حضرت معاویہؓ کے زمانے میں، ہاں! اگر ان کے زمانے کا مقابلہ ابوبکرؓ و عمرؓ سے کیا جائے تو فضیلت کا فرق ظاہر ہو جائے گا۔

یہ فرق جو عقائد و کلام کے ان بزرگوں نے بیان فرمایا ہے، تاریخی تدریج کے مطابق بھی ہے، اہلِ سنت کے عقائد کو بھی اس سے ٹھیس نہیں لگتی، تاریخ سے ثابت بھی ہے اور صحابہ کرامؓ کے شایانِ شان بھی۔ اس کے برخلاف مولانا مودودی صاحب نے جو فرق بیان فرمایا ہے وہ کسی بھی اعتبار سے قابلِ قبول نہیں ہے۔

خلافتِ راشدہ اور ملوکیت کے درمیان کیا فرق ہے؟ اور کیا کسی ایسی حکومتِ عادلہ کا وجود ممکن ہے جو خلافتِ راشدہ تو نہ ہو لیکن اسے شریعتِ اسلام کے دائرے سے باہر بھی نہ کہا جا سکے؟ اس موضوع پر شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور کتاب ''منصبِ اِمامت'' میں تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے، اس بحث سے مختلف حکومتوں کے مدارج بھی معلوم ہو جاتے ہیں، ان کا شرعی حکم بھی واضح ہو جاتا ہے اور

---

(۱) منہاج السنۃ ج:۳ ص:۱۸۵۔

یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حکومت کی صحیح حیثیت کیا تھی؟ اور اس میں اور خلافتِ راشدہ میں کیا فرق تھا؟ یہ بحث ہم حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے الفاظ میں بعینہٖ نقل کرتے ہیں:-

> جس وقت ایسا شخص (یعنی خلیفۂ راشد) منصبِ خلافت کو پہنچتا ہے تو ابوابِ سیاست میں محض خدا کے بندوں کی اصلاح اور نیابتِ رسول اللہ کے حقوق کی ادائیگی میں مشغول رہتا ہے، اپنے نفع کے حصول کی آرزو اس کے دِل میں نہیں گزرتی اور نہ کسی کے ضرر کا غبار اس کے دامن تک پہنچتا ہے، اور اطاعتِ ربانی میں ہوائے نفس کی مشارکت کو شرک جانتا ہے اور کسی مقصد کا حصول سوائے رضائے حق کے اپنے دِل کی خالص منزل کے لئے جنسِ کثافت خیال کرتا ہے، اسے بندگانِ خدا کی تربیت کے سوا نہ کچھ ظاہر میں مطلوب ہے اور نہ باطن میں مرغوب ہے، جو بات قوانینِ سیاستِ ایمانی سے انحراف کا باعث اور آئینِ سیاستِ سلطانی کی طرف میلان کا سبب ہوگی، اس سے ہرگز وقوع پذیر نہ ہوگی ..... لیکن اِمامِ حکمی بہت سے مقتضیاتِ نفسانیہ سے بالکل پاک نہیں رہ سکتا اور نہ ہی علائق ماسوی اللہ سے بَری ہوسکتا ہے، اسی بناء پر مال و منال اور جاہ و جلال کے حصول اور اخوان و اقران پر فوقیت، امصار و بلدان پر تسلط کی آرزو اور دوستوں اور قرابت داروں کی پاسداری، مخالفین و اعداء کی بدخواہی اور لذّاتِ جسمانیہ اور مرغوباتِ نفسانیہ کے حصول کا خیال اس کے دِل میں جاگزین ہوتا ہے، بلکہ اُمورِ مذکورہ کو طلب کرتا اور سیاست کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بناتا ہے اور طریقِ حکومت کو حکمتِ عملی کے ذریعہ اپنی دِلی آرزو تک پہنچاتا ہے، پس یہی سیاستِ سلطانی ہے ..... اور یہی مذکورہ لذّاتِ جسمانیہ کا

حصول جس وقت سیاستِ ایمانی سے مخلوط ہوجاتا ہے، اسی وقت خلافتِ راشدہ مخفی اور سیاستِ سلطانی برملا ہوجاتی ہے اور لذاتِ نفسانیہ کی طلب بحسب اختلافِ اشخاص متفاوت ہوتی ہے، یہ ہوٰی و ہوس بعض اشخاص پر اس قدر غالب ہوجاتی ہے کہ انہیں دین و ایمان کے دائرے سے خارج کردیتی ہے، اور بعض پر اس قدر کہ فسق و فجور کی حد تک پہنچادیتی ہے، اور بعض کو یہاں تک نقصان دیتی ہے کہ بوالہوسانِ آرام طلب کی لڑی میں منسلک کردیتی ہے۔

اس ہوٰی و ہوس کا اختلاط بھی سیاستِ ایمانی کے ساتھ چار مراتب پر خیال کرنا چاہیئے:-

اوّل:- باوجود ظواہرِ شریعت کی پاسداری کے طالبِ لذاتِ نفسانی ہوتا ہے، یعنی ظاہرِ شریعت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا اور نہ ہی فسق و فجور اور جور و تعدی کی راہ لیتا ہے، لیکن اپنے نفس کی راحت رسانی میں اس قدر کوشاں رہتا ہے کہ ظاہراً شریعت اسے مباحات سے شمار کرے، ہم اسے سلطنتِ عادلہ کہتے ہیں۔

دُوسرا:- نفسانی لذات کی طلب اور جسمانی راحت کی خواہش اس قدر غلبہ کرتی ہے کہ کبھی کبھی لذات کے حصول میں دائرۂ شرع سے باہر ہوجاتا ہے اور ظالمانِ بے باک اور فاسقانِ سفاک کی راہ تک جاپہنچتا ہے اور پھر اس پر پشیمان نہیں ہوتا اور نہ اس سے توبہ کرتا ہے، اسے سلطنتِ جابرہ کہا جائے گا۔

تیسرا:- نفس کی پیروی اس قدر غالب آجاتی ہے کہ زمانے بھر کا فاسق و عیاش ہوجاتا ہے، جبر و تکبر کی داد دیتا، ظلم و تعدی کی بنیاد ڈالتا اور عیش کے فکر میں ہمت صَرف کرتا ہے اور مراتبِ تفرج کو کمال تک پہنچاتا اور فسق و فجور، تعدی و جور کے طریقوں کو ملت و

> سنت کے شواہد کے مقابلے میں فراہم کرتا ہے اور اسے اپنے ہنر وکمال سے سمجھتا ہے، ہم اسے سلطنتِ ضالہ کہتے ہیں۔
>
> چہارم:- اپنے ساختہ و پرداختہ قوانین کو شرعِ متین پر ترجیح دے اور سنت وملت کے طریقے کی اہانت کرے، اور ردّ وقدح اور اعتراض واستہزاء کے ساتھ اس سے پیش آئے، اور آپنے آئین کے محاسن ومنافع شمار کرتا رہے اور شریعت کو عوام فریب باتوں کی مانند محض ہرزہ گردی اور بیہودہ سرائی میں سے سمجھے اور ملک العلام کے اَحکام اور سنتِ سیّد الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مزخرفات احمق فریب و ناداں پسند سے قرار دے اور اِلحاد و زندقہ کی بنیاد رکھے، اسے ہم سلطنتِ کفر کہیں گے۔[1]

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے ''سلطنتِ عادلہ'' کی بھی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں، ایک ''سلطنتِ کاملہ'' اور دُوسرے ''سلطنتِ ناقصہ'' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو سلطانِ عادل اللہ کے خوف سے ظاہر شریعت کی پاسداری کرے وہ سلطانِ کامل ہے، اور جو مخلوق کے خوف سے کرے وہ سلطانِ ناقص، اس کے بعد شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:-

> سلطانِ کامل حکمی خلیفہ راشد ہے، یعنی اگرچہ خلافتِ راشدہ تک نہیں پہنچا، لیکن خلافتِ راشدہ کے عمدہ آثار بعض ظواہرِ شریعت کی خدمت صدق و اِخلاص سے اس سے صادر ہوں، پس اگر کسی وقت سلطانِ کامل تختِ سلطنت پر متمکن ہو اور اس وقت اِمامِ حق کا بھی وجود ہو جو خلافت کی لیاقت رکھتا ہے تو مناسب یہ ہے کہ اِمامِ حق منصبِ اِمامت پر قناعت کرے اور اپنی کوشش ہدایت و ارشاد کی طرف مبذول کرے اور سلطان کے ساتھ اُمورِ سیاست میں دست وگریباں نہ ہو اور رعایا اور لشکر کو جنگ وجدال کے بپا

---

(۱) منصبِ اِمامت، مترجمہ: حکیم محمد حسین علوی، ص: ۹۷ تا ۹۹، گیلانی پریس، لاہور ۱۹۴۹ء۔

کرنے میں بے سر و سامان نہ کرے، اگرچہ خلافتِ راشدہ کا منصبِ اعلیٰ اس کے ہاتھ سے جارہا ہے، لیکن عباد اللہ کی خیرخواہی کے مدِ نظر اس اَمر کو گوارا کرلے اور راضی بقضا ہورہے اور تمام مسلمانوں پر اس کو تصدق کردے، جیسا کہ اِمام حسن رضی اللہ عنہ نے سلطانِ شام (امیر معاویہؓ) سے یہی طریقہ اختیار کیا اور مخالفت کا دروازہ نہ کھولا، اسی مصالحت کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف کی اور فرمایا:-

إن ابنی هٰذا سیّد لعل اللہ أن یصلح بہٖ بین فئتین عظیمتین من المسلمین.

(میرا یہ بیٹا سیّد ہے، ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں اس کے باعث اللہ تعالیٰ صلح کرادے۔)

اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ سلطانِ کامل پر اُمت کا اجماع کرنا خدا اور رسولؐ کے منشاء کے مطابق ہے اور اس کی اطاعت درگاہِ خداوندی میں مقبول ہے۔

نکتہ دوم

سلطانِ کامل سلاطین اور خلفائے راشدین کے درمیان ایک برزخ کی طرح ہے، اگر لوگ دیگر سلاطین کو دیکھیں تو اس سلطانِ کامل کو خلیفہ راشد تصوّر کریں، اور اگر خلفائے راشدین کا حال معلوم کریں تو اسے سلطانِ کامل سمجھیں، چنانچہ سلطانِ شام (حضرت معاویہؓ) نے فرمایا:-

لست فیکم مثل أبی بکر وعمر ولٰکن سترون أمراء من بعدی.

(میں تم میں ابوبکرؓ وعمرؓ جیسا حکمران تو نہیں ہوں، لیکن میرے بعد عنقریب امیر دیکھو گے۔)

بناء بریں اس کی سلطنت کا زمانہ نبوّت اور خلافتِ راشدہ کے

ساتھ مشابہت رکھتا ہے، پس اس وجہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ کے زمانے کی ابتداء سے اس سلطنتِ کاملہ کا زمانہ گزر جانے تک ترقیٔ اسلام کا زمانہ ہے۔[1]

ہمارے نزدیک خلافت اور ملوکیت کے باہمی فرق، ان کے مختلف مدارج، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ حکومت کی اس سے بہتر تشریح و توجیہ نہیں ہوسکتی۔

## ایک ضروری بات

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی گفتگو کرتے وقت دو باتیں ضرور یاد رکھنی چاہئیں، ایک تو یہ کہ ان کے خلاف ان کے زمانے ہی میں پروپیگنڈا بہت زیادہ کیا گیا، خود حضرت معاویہؓ سے پوچھا گیا کہ آپ کو بڑھاپا بہت جلد آگیا، اس کی کیا وجہ ہے؟

تو آپ نے جواب دیا کہ:-

کیف لا ولا أزال أریٰ رجلًا من العرب قائمًا علیٰ رأسي یلقح لي کلامًا یلزمني جوابه، فإن أصبت لم أُحمد وإن أخطأت سارت بها البرود.[2]

ترجمہ:- کیوں نہ ہو؟ ہر وقت عرب کا کوئی شخص میرے سر پر کھڑا رہتا ہے جو ایسی باتیں گھڑتا ہے جن کا جواب دینا لازم ہوجاتا ہے، اگر میں کوئی صحیح کام کروں تو کوئی تعریف نہیں کرتا، اور اگر مجھ سے غلطی ہوجائے تو اسے اُونٹنیاں (ساری دُنیا میں) لے اُڑتی ہیں۔

---

(۱) منصبِ اِمامت: ترجمہ مأخوذ از حکیم محمد حسن علوی اُردو ترجمہ منصبِ اِمامت، گیلانی پریس، لاہور ۱۹۴۹ء۔

(۲) البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۴۰۔

لہٰذا ان کے بارے میں تحقیقِ روایات کی ضرورت اوروں سے زیادہ ہے۔

دُوسری بات یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو پروپیگنڈا کیا گیا ہے اسے بلاتحقیق دُرست مان لیا جائے تو صرف حضرت معاویہؓ ہی کی ذات مجروح نہیں ہوتی، بلکہ دُوسرے صحابہؓ پر طعن و تشنیع کا بھی دروازہ کھل جاتا ہے، چنانچہ تجربہ ہے کہ جو لوگ حضرت معاویہؓ پر الزام عائد کرنے میں جری ہوجاتے ہیں، ان کی زبان دُوسرے صحابہؓ کے خلاف اور زیادہ دراز ہوجاتی ہے، حضرت ربیع بن نافع رحمہ اللہ نے کتنی سچی بات کہی تھی کہ:-

معاویة ستر لأصحاب محمد صلى الله عليه وسلم فإذا كشف الرجل الستر اجترأ علىٰ ما ورائه.[1]

ترجمہ:- معاویہؓ اَصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک پردہ ہیں، جب کوئی شخص اس پردے کو کھول دے گا تو اس کے پیچھے کے لوگوں پر اس کی جرأتیں بڑھ جائیں گی۔

اور اسی لئے جب حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے پوچھا گیا کہ حضرت معاویہؓ افضل ہیں یا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ؟ تو حضرت ابنِ مبارکؒ نے فرمایا:-

تراب في أنف معاوية أفضل من عمر بن عبدالعزيز.[2]

ترجمہ:- معاویہؓ کی ناک کی مٹی بھی عمر بن عبدالعزیزؒ سے بہتر ہے۔

اور اسی لئے حضرت ابراہیم بن میسرہؒ کہتے ہیں کہ: ”میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کسی شخص کو مارا ہو، البتہ ایک ایسے شخص کو کوڑوں سے مارا جس نے حضرت معاویہؓ کو بُرا بھلا کہا تھا“۔[3]

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

---

(۱) الخطیب: تاریخ بغداد ج:۱ ص:۲۰۹۔

(۲و۳) البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۹۔

حصہ دوم

# حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور خلافت وملوکیت

## (”ترجمان القرآن لاہور“ کے تبصرے کا جواب)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں احقر کے سابقہ مقالے پر ماہنامہ ”ترجمان القرآن لاہور“ میں ایک مفصل تنقید شائع ہوئی تھی جو تیرہ ماہ تک جاری رہی، اس کے جواب میں احقر کا جو مضمون ماہنامہ ”البلاغ“ ذی الحجہ ۱۳۹۱ھ کے شمارے میں شائع ہوا وہ اس حصے میں پیشِ خدمت ہے۔

محمد تقی عثمانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡض اَنۡتَ تَحۡكُمُ بَيۡنَ عِبَادِکَ فِيۡمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ.

پچھلے سال ہم نے جناب مولانا سیّد ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی کتاب ''خلافت وملوکیت'' کے ایک حصے پر تبصرہ شائع کیا تھا، جو آٹھ قسطوں میں مکمل ہوا۔ ہم نے اپنے مقالے کے شروع ہی میں یہ بات واضح کردی تھی کہ ان موضوعات پر بحث ومناظرے کو ہم پسند نہیں کرتے، لیکن چونکہ ہماری شامتِ اعمال سے یہ بحث ہمارے ملک میں چھڑ گئی، اِفراط وتفریط کے نظریوں نے ذہنوں کو بُری طرح اُلجھادیا، اور اس سلسلے میں ہم پر بھی سوالات کی بوچھاڑ شروع ہوئی، اس لئے ہم نے چاہا کہ خالص علمی انداز میں جمہور اہلِ سنت کا معتدل موقف دلائل کے ساتھ بیان کردیا جائے تاکہ جو حضرات مسئلے کی علمی حقیقت سمجھنا چاہیں، وہ ذہنی طور پر مطمئن ہوسکیں۔

اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ ہمارے اس مقصد میں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی، ملک وبیرونِ ملک سے ہمارے پاس خطوط اور پیغامات کا تانتا بندھا رہا، بیسیوں غیر جانبدار حضرات نے بتایا کہ اس مقالے نے ان کے دِلوں کو مطمئن کیا اور شکوک وشبہات کے بہت سے کانٹے نکال دیئے۔ اس بات پر ہم اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔

''داد'' کے ساتھ ''بیداد'' بھی مصنف کا ہمیشہ سے مقدّر رہی ہے، چنانچہ جن حضرات کو یہ مقالہ کسی وجہ سے پسند نہ آیا، انہوں نے بھی اسے اپنی نرم گرم ہر طرح کی تنقید سے نوازا۔ بات تنقید سے آگے سبّ وشتام تک بھی پہنچی، اور انتہاء یہ کہ بعض جوشیلے حضرات نے ہمیں ''سوشلسٹ'' تک قرار دیا، اور نہ جانے کیسے کیسے القابات دیئے گئے۔

اس مقالے سے ہمارا مقصد صرف جمہور اہلِ سنت کے موقف کا مدلل اظہار تھا، اس موضوع پر بحث و مناظرے کی فضا پیدا کرنا ہرگز مقصود نہ تھا۔ ہمارے پاس مقالے کی تائید اور تردید میں خطوط اور مضامین کا ایک انبار لگ گیا تھا، لیکن ہم نے اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود ہر ایک کو انفرادی جواب دینا گوارا کیا، اور ان میں سے کوئی ایک خط بھی شائع نہیں کیا، تاکہ یہ مسئلہ صرف اپنی علمی حدود میں رہے اور اس نازک دور میں محاذِ جنگ نہ بن سکے۔

لیکن ابھی ہمارے مقالے کی صرف دو قسطیں ہی شائع ہوئی تھیں کہ مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے ماہنامہ رسالے ''ترجمان القرآن'' میں جناب ملک غلام علی صاحب نے اس پر قسط وار مفصل تبصرہ شروع کردیا، جو مسلسل تیرہ مہینے جاری رہنے کے بعد چند ماہ پہلے ختم ہوا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کرچکے ہیں، ہمارا مقصد صرف اپنے موقف کا مدلل اظہار تھا، اس لئے ہمارا ارادہ اس موضوع پر مزید کچھ لکھنے کا نہیں تھا، ہماری دُوسری زیادہ اہم مصروفیات بھی اس کی اجازت نہیں دیتی تھیں، لیکن احباب کا شدید اصرار ہے کہ ملک صاحب کے مضمون پر تبصرہ ضرور کیا جائے، ادھر ملک صاحب کے پورے مضمون کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس پر تبصرہ کرنے کے لئے زیادہ وقت صَرف نہیں ہوگا، اس لئے بادلِ ناخواستہ اس موضوع پر دوبارہ قلم اُٹھا رہا ہوں، اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کردینا چاہتا ہوں کہ یہ اس موضوع پر ''البلاغ'' کی آخری تحریر ہوگی، اگر کوئی صاحب اس سے مطمئن ہوں تو اسے قبول فرمائیں، اور اگر مطمئن نہ ہوں تو ظاہر ہے کہ نظریات کے معاملے میں جبر نہیں کیا جاسکتا۔

لیکن شروع میں یہ دردمندانہ اِلتجا میں پھر کروں گا کہ اس نازک معاملے میں ذاتی جذبات اور جماعتی تعصّبات کو درمیان سے ہٹاکر پوری تحقیقی غیرجانبداری سے کام لیا جائے، اور جو کچھ عرض کیا جارہا ہے اسے خالص اِفہام و تفہیم کے ماحول میں ٹھنڈے دِل و دِماغ کے ساتھ پڑھا جائے۔ خدا شاہد ہے کہ ان گزارشات سے کسی کی تنقیص و توہین مقصود نہیں، نہ اس کے پیچھے بات کی پچ بھرنے کا جذبہ کارفرما ہے، جو

حضرات ''البلاغ'' کو پابندی سے پڑھتے رہے ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ ہم نے اپنی کسی غلطی کے اعتراف میں کبھی تأمل نہیں کیا، بلکہ جہاں اپنی بات نیچی کرنے میں دِین کا کوئی فائدہ محسوس کیا ہے، وہاں اپنا جائز حق بھی چھوڑ دیا۔

ہمارے پہلے مقالے کے پیچھے جذبہ صرف یہ کارفرما تھا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دِین کی پوری عمارت کی بنیاد ہیں، اس بنیاد کی ایک اِینٹ بھی اگر اپنی جگہ سے ہلائی جائے تو پورا قصرِ ایمان متزلزل ہوسکتا ہے، للہذا ان حضرات کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں انہیں دُور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس تحریر کا منشاء بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔

## مجموعی تأثرات

میں جناب ملک غلام علی صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اتنی تفصیل اور بسط کے ساتھ میرے مقالے پر تبصرہ فرمایا، کسی مسلمان کی کوئی بات اگر غلط محسوس ہو تو جذبۂ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اسے اس پر متنبہ کرنے کی کوشش کی جائے، لیکن اس سلسلے میں چند باتیں عرض کرنی ہیں:-

۱- تنقید کا مُسلّمہ اُصول یہ ہے کہ جس شخص پر تنقید کی جارہی ہو، پہلے اسے اپنی بات پوری کرنے کا موقع دینا چاہئے، اس لئے کہ کسی کی بات کو انصاف کے ساتھ صحیح یا غلط اسی وقت کہا جاسکتا ہے جب وہ اپنی بات مکمل کرچکا ہو، اسی اُصول کے مطابق میں نے ملک صاحب کے مضمون پر اس وقت تک قلم نہیں اُٹھایا جب تک ان کی تیرہ قسطیں پوری نہیں ہوگئیں، لیکن ملک صاحب نے تنقید کے اس اُصول کا مطلق خیال نہیں فرمایا، ابھی میرے مضمون کی آٹھ قسطوں میں سے صرف دو ہی قسطیں منظرِ عام پر آئی تھیں کہ انہوں نے جواب دہی شروع کردی، اس کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنی ابتدائی اقساط میں مجھ پر بہت سے وہ اعتراضات کئے ہیں جن کا مفصل جواب میرے آئندہ مضامین میں آگیا ہے، اور اس کے بعد انہوں نے اس جواب سے کوئی تعرض نہیں فرمایا، نیز اگر وہ میرے مکمل مضامین پڑھ کر تنقید لکھتے تو شاید اس قسم کے

الزامات عائد کرنے کی نوبت نہ آتی، کہ میرا میلان کسی بھی درجے میں ناصبیت کی طرف ہے یا خود ان کے الفاظ میں انکارِ حدیث کی طرح میں ''انکارِ تاریخِ اسلام'' کے کسی نئے مسلک کے بناء ڈال رہا ہوں۔

اس طرزِ عمل کا ایک نقصان خود ملک صاحب نے ذاتی طور پر یہ اُٹھایا ہے کہ جو مقالہ میں نے ڈیڑھ مہینے میں لکھ دیا تھا، اس پر تنقید کے لئے موصوف کو پورے تیرہ مہینے صَرف کرنے پڑے، اور تیرہ مہینے بھی وہ جن میں ملک کے اندر اسلام اور سوشلزم کا معرکہ اپنے شباب پر پہنچا ہوا تھا۔

۲- علمی تنقید میں بہتر تو یہ ہوتا ہے کہ مخالف کی بات خود اسی کے الفاظ میں پوری کی پوری نقل کی جائے، لیکن اگر اختصار کے پیشِ نظر اس کی تلخیص ضروری ہو تو کم از کم خلاصہ نکالنے میں یہ رعایت ضرور ہونی چاہئے کہ اس کے استدلال کا کوئی اہم جز رہنے نہ پائے، ملک صاحب نے ہر جگہ میری بات کا خلاصہ نکالا ہے، مگر یہ خلاصہ بہت سے مقامات پر غیر محتاط اور بعض جگہ صراحۃً غلط ہے۔

۳- جن حضرات کو میرے مقالے کے مندرجات سے اتفاق نہ ہو سکا، انہوں نے بھی اس بات کا اظہار بہرحال کیا ہے کہ میری تنقید ایک خالص علمی انداز کی تنقید تھی، جس میں طنز و تعریض اور ذاتی چھینٹے اُڑانے سے مکمل پرہیز کیا گیا تھا، خود ملک صاحب نے بھی دبی زبان سے اس کا اعتراف فرمایا ہے، لیکن افسوس ہے کہ خود انہوں نے تنقید کا جو انداز اختیار فرمایا، وہ کسی طرح بھی ایک علمی بحث کے شایانِ شان نہیں تھا، میں نے عرض کیا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اِفہام و تفہیم کے ماحول میں کہہ رہا ہوں، لیکن انہوں نے براہِ راست مناظرے کے اس اِسٹیج سے گفتگو شروع کر دی جہاں مخالف پر طعن و تشنیع کرنے اور اس پر فقرے کسنے اور چھینٹے اُڑانے کے بغیر کوئی بات نہیں ہوتی، اور جہاں صرف اس کو ہی نہیں، اس کے اکابر کو، اور جن مدارس میں اس نے تعلیم پائی ہے ان کو بھی مطعون کرنا زورِ بیان کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔

جہاں تک راقم الحروف کی ذات کا تعلق ہے، ملک صاحب اس پر جو طعن و تشنیع بھی فرمائیں، مجھے ذاتی طور پر اس لئے کوئی اعتراض نہیں ہے کہ میں ''کم علم''

سے لے کر ''بے عمل'' تک ہر خطاب کو اپنے حق میں دُرست سمجھتا ہوں، لیکن ہم سب کو یہ ضرور سوچنا چاہئے کہ اس اندازِ گفتگو کے ساتھ اس اسلام کی کوئی اچھی نمائندگی نہیں کرسکیں گے جو فرعون کے سامنے بھی نرم بات کہنے کی تلقین کرتا ہے۔

اگر ملک صاحب بُرا نہ مانیں تو ایک خیر خواہانہ گزارش اور ہے، اور وہ یہ کہ اوّل تو علمی تنقیدوں میں طعن و تشنیع کا انداز فی نفسہٖ مناسب نہیں۔ دُوسرے اگر کسی زمانے میں اس کو مستحسن سمجھا جاتا ہو تو اَب یہ طریقہ سنجیدہ علمی حلقوں میں متروک ہوچکا ہے۔ اس دور میں طعن و تشنیع کے بارے میں عموماً تأثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے علمی دلائل کے خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تیسرا اگر کسی کو طنز و تعریض کا ایسا ہی ذوق ہو تو پھر اِنشاء کی یہ صنف تھوڑا سا ریاض چاہتی ہے، اس کی نزاکتوں پر قابو پانے کے لئے محنت کی ضرورت ہے، اور اس محنت کے بغیر انسان کو طنز اور جھنجھلاہٹ کا فرق سمجھ میں نہیں آتا۔ اس فن کا سب سے پہلا سبق یہ ہے کہ ''طنز'' جھنجھلا کر دانت پیسنے کا نہیں، بلکہ تبسم زیرِ لب کے ساتھ چٹکی لینے کا نام ہے۔ اور جب یہ سبق ذہن نشین نہ ہو تو یہ گولی خود اپنے ہی اُوپر چل جاتی ہے۔

بہرکیف! جہاں تک ملک صاحب کی تعریضات کا تعلق ہے، ان کے جواب میں تو صرف اتنا ہی عرض کرسکتا ہوں کہ ؎

تو دانی کہ مارا سر جنگ نیست
وگرنہ مجالِ سخن تنگ نیست

اور ؎

آپ ہی اپنی اداؤں پر ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی

البتہ ان کے صرف ان دلائل پر مختصر تبصرہ ان صفحات میں پیش کر رہا ہوں، جو علمی نوعیت کے ہیں، اور جو واقعات ذہنوں میں خلش پیدا کرسکتے ہیں۔

❊❊❊

# بدعت کا اِلزام

"قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کے عنوان سے مولانا مودودی صاحب نے لکھا ہے:-

ان بادشاہوں کی سیاست دِین کے تابع نہ تھی، اس کے تقاضے وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورا کرتے تھے اور اس معاملے میں حلال وحرام کی تمیز روا نہ رکھتے تھے، مختلف خلفائے بنی اُمیہ کے عہد میں قانون کی پابندی کا کیا حال رہا، اسے ہم آگے کی سطور میں بیان کرتے ہیں۔

حضرت معاویہؓ کے عہد میں

یہ پالیسی حضرت معاویہؓ ہی کے عہد سے شروع ہوگئی تھی، اِمام زہریؒ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفائے راشدینؓ کے عہد میں سنت یہ تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہوسکتا ہے، نہ مسلمان کافر کا، حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانۂ حکومت میں مسلمانوں کا کافر کا وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث قرار نہ دیا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے آکر اس بدعت کو ختم کیا۔ (خلافت وملکویت ص:۱۷۳)

میں نے اس عبارت پر دو اعتراض کئے تھے:-

۱- مولانا مودودی صاحب نے خط کشیدہ جملے میں اِمام زہریؒ کی طرف یہ بات منسوب کی ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کے اس مسلک کو بدعت قرار دیا ہے، حالانکہ البدایہ والنہایہ میں (جس کے حوالے سے مولانا نے اِمام زہریؒ کا یہ مقولہ نقل فرمایا ہے) اِمام زہریؒ کا اصل عربی جملہ یہ ہے کہ:-

راجع السُّنّة الأولٰی۔ (۱)

---

(۱) البداية والنهاية ج:۹ ص:۲۳۲، مطبعة السعادة۔

ترجمہ:- حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے پہلی سنت کو لوٹا دیا۔

''پہلی سنت کو لوٹا دیا'' اور ''بدعت کو ختم کرنے'' میں جو زمین و آسمان کا فرق ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

میرا اعتراض یہ تھا کہ مولانا نے ''سنتِ اُولیٰ'' کے لفظ کو ''بدعت'' سے کیوں بدلا؟ اگر مولانا خود حضرت معاویہؓ کے اس مسلک کو ''بدعت'' سمجھتے ہیں تو وہ اپنی طرف سے اسے بدعت فرمائیں، لیکن اِمام زہریؒ کی طرف وہ بات کیوں منسوب کی گئی جو انہوں نے ہرگز نہیں کہی؟

ملک غلام علی صاحب نے میرے اس اعتراض کا اپنے طویل مقالے میں کوئی جواب نہیں دیا۔

۲- میرا دُوسرا اعتراض یہ تھا کہ خود مولانا مودودی صاحب نے جو حضرت معاویہؓ کے اس مسلک کو ''بدعت'' قرار دیا ہے، وہ دُرست نہیں، اس لئے کہ یہ حضرت معاویہؓ کا فقہی اجتہاد تھا، عمدۃ القاری اور فتح الباری کے حوالے سے میں نے کہا تھا کہ اس معاملے میں صحابہؓ کے عہد سے اختلاف چلا آتا ہے، حضرت معاویہؓ کے علاوہ حضرت معاذ بن جبلؓ اور تابعین میں سے مسروقؒ، حسن بصریؒ، محمد بن حنفیہؒ اور محمد بن علی بن حسینؒ کا بھی یہی مسلک ہے کہ مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا جائے گا، اور یہ مسلک بے بنیاد بھی نہیں ہے، بلکہ حافظ ابنِ حجرؒ نے اس مسلک کی بنیاد ایک مرفوع حدیث کو قرار دیا ہے۔

جو شخص بھی میرے مقالے میں یہ بحث پڑھے گا اس پر یہ بات واضح ہوجائے گی کہ میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کا یہ مسلک دلائل کے لحاظ سے زیادہ قوی اور راجح ہے، بلکہ میری گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ یہ ایک فقہی اجتہاد ہے جس سے دلائل کے ساتھ اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن اسے ''بدعت'' اور ''قانون کی بالاتری کا خاتمہ'' نہیں کہا جاسکتا، اور نہ اس پر اس قیاس کی عمارت کھڑی کی جاسکتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے سیاسی اغراض کے لئے حلال و حرام کی تمیز روا نہیں رکھی۔

لیکن ملک غلام علی صاحب نے میرے اس اعتراض کے جواب میں جو طویل بحث فرمائی ہے، اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ وغیرہ کے دلائل کمزور اور ان کے مقابلے میں جمہور فقہاء کے دلائل مضبوط ہیں۔ حالانکہ اگر مولانا مودودی صاحب کا مقصد صرف یہی ہوتا کہ حضرت معاویہؓ کا یہ اجتہاد کمزور، مرجوح یا جمہور کے مسلک کے مطابق غلط ہے، تو ہمیں کوئی اعتراض نہ تھا، اس صورت میں جتنے دلائل ملک صاحب نے حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذؓ کے مسلک کے خلاف پیش کئے ہیں، ہم ان پر دو چار کا اور اضافہ کر سکتے تھے، اس لئے کہ مسلک کے لحاظ سے ہم جمہور فقہاء ہی کے مسلک کے قائل ہیں، اور وہی مسلک ہمارے نزدیک دلائل کے لحاظ سے مضبوط ہے، لیکن بحث تو یہاں ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ اپنے فقہی مسلک کی بناء پر ''بدعت'' کے مرتکب کس طرح ہوگئے؟ ہم نے حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذؓ کے حق میں جو دلائل پیش کئے تھے، اس سے ان کے مذہب کی تائید کرنا یا اسے مضبوط قرار دینا مقصد نہیں تھا، بلکہ یہ دِکھانا تھا کہ یہ حضرات مجتہد ہیں اور ان کے قول کی ایک شرعی دلیل بھی ہے، وہ دلیل اگرچہ کمزور ہے اور اسی لئے ان کا مسلک مختار نہیں، لیکن اس کی بناء پر انہیں بدعت کا مرتکب قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جہاں تک ان کے مسلک کے دلائل کے لحاظ سے کمزور ہونے کا تعلق ہے، یہ مسئلہ ہمارے اور مولانا مودودی صاحب کے درمیان مختلف فیہ نہیں تھا، اس لئے ہم نے اس سے تعرض نہیں کیا۔

صورتِ واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے درمیان بہت سے فقہی مسائل میں اختلاف رہا ہے، جن میں ہر فریق اپنے پاس کچھ دلائل رکھتا تھا، ایک مجتہد کو یہ تو اختیار حاصل ہے کہ ان کے اقوال میں جس کے دلائل کو زیادہ مضبوط پائے اسے اختیار کرے، اور جس کے دلائل پر دِل مطمئن نہ ہو اسے قبول نہ کرے، اور اسے اجتہادی غلطی قرار دے، لیکن ان جیسے مسائل میں کسی صحابی کے مسلک کو ''بدعت'' نہیں کہا جاسکتا اور نہ چودہ سو سال میں آج تک کسی صحابی کے فقہی مسلک کو، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی کمزور کیوں نہ معلوم ہو، بدعت قرار دیا گیا ہے، مثلاً ابو ذر غفاری رضی اللہ

تعالیٰ عنہ کا یہ مسلک مشہور و معروف ہے کہ وہ ایک دن کی روزی سے زیادہ رقم اپنے پاس رکھنا حرام سمجھتے تھے، ظاہر ہے کہ ان کا یہ مسلک قرآن و سنت کے واضح دلائل کے خلاف ہے، اسی وجہ سے صحابہ کرامؓ میں سے کوئی ایک بھی اس معاملے میں ان کا ہم نوا نہیں تھا، سب کے نزدیک ان سے اس مسئلے میں اجتہادی غلطی ہوئی تھی، اور جمہور اُمت نے ہمیشہ دلائل کے ذریعہ اس مسلک کی تردید کی ہے، لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ ان کا یہ فعل ''بدعت'' تھا یا اس سے قانونِ اسلامی مجروح ہوتا تھا۔ ملک غلام علی صاحب لکھتے ہیں:-

> سوال یہ ہے کہ اگر ایک طرف قرآنی آیات اور احادیثِ صحیحہ موجود ہوں، سنتِ نبویہ اور سنتِ خلفائے راشدین اربعہ موجود ہوں اور دُوسری طرف کسی صحابی یا تابعی کا قول یا فعل ہو جو صریحاً ان سب سے متعارض ہو تو کیا اسے بھی دُوسری سنت یا اجتہاد کا نام دیا جاسکتا ہے؟

ملک صاحب کا منشاء غالباً یہ ہے کہ ایسی صورت میں اس صحابی یا تابعی کے قول کو ''اجتہاد'' نہیں بلکہ ''بدعت'' کہا جائے گا، لیکن انہوں نے اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل بیان نہیں فرمائی۔ میرا جواب یہ ہے کہ اگر وہ صحابی یا تابعی مجتہد ہے، اور اپنے قول کی بنیاد کسی بھی شرعی دلیل پر رکھتا ہے (خواہ وہ شرعی دلیل ہمیں کمزور نظر آتی ہو) تو بلاشبہ اسے ''اجتہاد'' ہی کہا جائے گا، اسے بدعت یا تحریف نہیں کہہ سکتے، ایسی صورت میں عمل تو بلاشبہ قرآن و حدیث اور خلفائے راشدینؓ کی سنت ہی پر کیا جائے گا، صحابی کے منفرد مسلک کو کمزور، مرجوح، یہاں تک کہ اجتہادی غلطی بھی کہا جاسکتا ہے، لیکن اسے ''بدعت'' قرار دینے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

صحابہ کرامؓ کا معاملہ تو بہت بلند ہے، بعد کے فقہائے مجتہدین سے ایسے بے شمار اقوال مروی ہیں جو بظاہر قرآن و سنت کے خلاف نظر آتے ہیں، لیکن چونکہ ان کی کوئی نہ کوئی شرعی بنیاد، کمزور یا مضبوط، موجود ہے اس لئے ایسے اقوال کو اجتہادی غلطی تو کہا گیا ہے لیکن ''بدعت'' کسی نے نہیں کہا۔ مثلاً امام شافعیؒ اس بات کے قائل ہیں

کہ اگر کوئی شخص ذبیحے پر بسم اللہ پڑھنا جان بوجھ کر چھوڑ دے تب بھی ذبیحہ حلال ہوتا ہے،[1] حالانکہ قرآنِ کریم کی صریح آیت موجود ہے کہ:-

وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللهِ عَلَيْهِ.

ترجمہ:- اور اس (ذبیحہ) میں سے مت کھاؤ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔

جمہور فقہاء نے امام شافعیؒ کے اس مسلک کی تردید کی ہے، اسے کمزور کہا ہے، اور اس پر عمل نہیں کیا، لیکن کیا کوئی ایک عالم بھی ایسا بتایا جاسکتا ہے جس نے اس مسلک کی وجہ سے امام شافعیؒ پر بدعت کا الزام عائد کیا ہو؟ وجہ یہی ہے کہ امام شافعیؒ مجتہد ہیں اور اپنے قول کی ایک شرعی بنیاد رکھتے ہیں، یہ بنیاد جمہور کے نزدیک کمزور سہی، لیکن ان کو "بدعت" اور "تحریفِ دین" کے الزام سے بَری کرنے کے لئے کافی ہے۔ ورنہ اگر ملک صاحب کے اُصول کے مطابق "بدعت" کے خطاب میں اتنی فیاضی سے کام لیا جائے تو اُمت کا شاید کوئی مجتہد بھی اس نشتر کی زد سے نہیں بچ سکے گا، کیونکہ ہر ایک کے یہاں ایک دو اقوال ضرور ایسے ملتے ہیں جو بظاہر قرآن وسنت کے خلاف نظر آتے ہیں اور جمہور اُمت نے اسی لئے ان کو قبول نہیں کیا بلکہ رَدّ کردیا ہے مگر ان کے عمل کو بدعت کسی نے نہیں کہا۔

ہاں! شرط یہ ہے کہ ایسے قول کا قائل اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہو اور اس کے بارے میں یہ گمان نہ کیا جاسکتا ہو کہ وہ خواہشاتِ نفسانی کی اِتباع میں تحریفِ دِین کا مرتکب ہوگا، اِمام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:-

إن الرأی المذموم ما بنی علی الجهل واتباع الهوٰی من غیر أن یرجع إلیه وما کان منه ذریعة إلیه وإن کان فی أصله محمودًا وذٰلک راجع إلٰی أصل شرعی فالأوّل داخل تحت حد البدعة وتتنزل علیه أدلة الذم والثانی

---

(۱) بدایة المجتهد ج:۱ ص:۴۴۶، مصطفی البابی، ۱۳۷۹ھ۔

خارج عنه ولا يكون بدعة أبدًا.[1]

ترجمہ:- قابلِ مذمت رائے وہ ہے جو جہالت اور خواہشات کی پیروی پر مبنی ہو اور اس میں کسی اصلِ شرعی کی طرف رُجوع نہ کیا گیا ہو، اور رائے کی دُوسری قسم وہ ہے جو اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے محمود ہو لیکن رائے مذموم کا ذریعہ بن سکتی ہو، اور اس کی بنیاد کسی شرعی اصل پر ہوتی ہے، ان میں سے پہلی قسم تو بدعت کی تعریف میں داخل ہے اور اسی پر مذمت کے دلائل کا اطلاق ہوتا ہے، لیکن دُوسری قسم کی رائے اس سے خارج ہے اور وہ کبھی بدعت نہیں ہوسکتی۔

اور خود مولانا مودودی صاحب کی زبانی سنئے کہ وہ ''اجتہاد'' کی کیا تعریف فرماتے ہیں؟

اجتہاد کی اصطلاح کا اطلاق میرے نزدیک صرف اس رائے پر ہوسکتا ہے جس کے لئے شریعت میں کوئی گنجائش پائی جاتی ہو، اور ''اجتہادی غلطی'' ہم صرف اس رائے کو کہہ سکتے ہیں جس کے حق میں کوئی نہ کوئی شرعی استدلال تو ہو مگر وہ صحیح نہ ہو یا بے حد کمزور ہو۔ (خلافت وملوکیت ص:۳۴۳)

اب ملک صاحب غور فرمائیں کہ توریثِ مسلم کے مسئلے میں ان کی ساری بحث کا خلاصہ یہی تو نکلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ نے جس حدیث[2] سے استدلال کیا ہے، وہ استدلال ''بے حد کمزور'' ہے یا زیادہ سے زیادہ ''صحیح نہیں''

---

(۱) الشاطبیؒ: الاعتصام ج:۱ ص:۱۳۱، مطبعة المنار، مصر ۱۳۳۲ھ۔

(۲) یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ملک صاحب نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں ایک راوی مجہول ہے۔ اوّل تو خود ابوداوٗد ہی میں اس کے متصل روایت بغیر مجہول راوی کے آئی ہے، دُوسرے ملک صاحب کی توجہ اس طرف نہیں گئی کہ یہ سند کی تحقیق و تفتیش ہم لوگوں کے لئے تو دلیل ہے، لیکن جن صحابہؓ نے کوئی ارشاد براہِ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہو، ان کے لئے یہ بات حدیث کو رَدّ کرنے کی وجہ کیسے ہوسکتی ہے کہ بعد کے راویوں میں کوئی شخص مجہول آگیا ہے۔

لیکن اس سے خود مولانا مودودی صاحب کے بیان کے مطابق زیادہ سے زیادہ اجتہادی غلطی ہی تو ثابت ہوتی ہے، ''بدعت'' کیسے ثابت ہوگئی؟

ملک غلام علی صاحب لکھتے ہیں:-

> اس سنتِ رسول اور سنتِ خلفائے راشدین کے بالمقابل امیر معاویہؓ کا ایک فیصلہ اور طریقہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دُوسری سنت ہے، یا یہ ایک فقیہ یا ایک مجتہد کا قیاس و اجتہاد ہے، یہ بالکل ایسی بات ہے جیسے آج کل ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور پرویز صاحب جیسے لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا ہر امیر یا مرکزِ ملت جو کچھ طے کردے وہی سنت ہے۔

جناب غلام علی صاحب ذرا ٹھنڈے دِل سے غور فرمائیں کہ وہ کیا بات فرما رہے ہیں؟ کیا میرے کسی ایک لفظ سے بھی یہ اشارہ کہیں نکلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کا فعل ''امیر'' یا ''مرکزِ ملت'' ہونے کی حیثیت سے سنت ہے؟ بات تو یہ کہی جارہی ہے کہ حضرت معاویہؓ صحابی اور فقیہ مجتہد ہیں، انہیں فقہی مسائل میں اجتہاد کا حق حاصل ہے، لہٰذا ان کے اجتہادات کو بدعت یا تحریفِ دِین نہیں کہا جاسکتا، اور وہ ''امیر'' نہ ہوتے تب بھی انہیں یہ حق حاصل تھا، اور جب امیر بن گئے تب بھی ان کی اہلیتِ اجتہاد ختم نہیں ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی فقیہ مجتہد ''امیر'' بن جائے تو اسے محض ''امیر'' ہونے کے جرم میں اجتہاد سے محروم تو نہیں کیا جاسکتا۔ ایسی صورت میں اس کے فقہی اجتہادات مرکزِ ملت کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مجتہد کی حیثیت سے جائز ہوں گے۔

پھر ہمیں سخت حیرت ہے کہ ملک صاحب کو حضرت معاویہؓ اور پرویز صاحب کے مرکزِ ملت کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا؟ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عام اُمراء کی طرح کوئی امیر نہیں بلکہ ایک صحابی، کاتبِ وحی اور صاحبِ فضائل و مناقب بزرگ ہیں، ان کے قیاس و اجتہاد اور بعد کے اُمراء کے قیاس و اجتہاد میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے، علامہ ابنِ قیمؒ سے زیادہ بدعات اور ''رائے مذموم'' کا دُشمن اور کون ہوگا؟ لیکن سنئے کہ صحابہؓ کے قیاسات اور آراء کے بارے میں وہ کیا فرماتے ہیں:-

رأى أفقه الأمة وأبر الأمة قلوبًا وأعمقها علمًا وأقلهم تكلّفًا وأصلحهم قصودًا وأكملهم فطرةً وأتمهم إدراكًا وأصفاهم إذهانًا الذين شاهدوا التنزيل وعرفوا التأويل وفهموا مقاصد الرسول فنسبة آرائهم وعلومهم وقصودهم إلٰى ما جاء به الرسول صلى الله عليه وسلم كنسبتهم إلٰى صحبته والفرق بينهم وبين من بعدهم فى ذٰلک كالفرق بينهم وبينهم فى الفضل فنسبة رأى من بعدهم إلٰى رأيهم كنسبة قدرهم إلٰى قدرهم.[۱]

ترجمہ:- ان حضرات کی رائے جو تمام اُمت میں سب سے زیادہ فقیہ، سب سے زیادہ نیک دِل، سب سے بڑھ کر عمیق علم رکھنے والے، سب سے کم تکلّفات کرنے والے، سب سے بہتر نیتوں کے حامل اور سب سے زیادہ کامل الفطرت تھے، جن کا ادراک سب سے زیادہ مکمل اور جن کے ذہن سب سے زیادہ جلایافتہ تھے، یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے نزولِ قرآن کا مشاہدہ کیا، اس کے معانی کو سمجھا، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد کو پہچانا، لہٰذا ان حضرات کی رائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے ساتھ وہی نسبت رکھتی ہے جیسی خود ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے حاصل ہے، اور اس معاملے (رائے واجتہاد) میں ان کے اور ان کے بعد والوں کے درمیان وہی فرق ہے جو فضیلت کے اعتبار سے ان کے درمیان پایا جاتا ہے، لہٰذا بعد والوں کی رائے ان حضرات کی رائے کے ساتھ وہی نسبت رکھتی ہے جو ان جیسے لوگوں کی ان جیسے لوگوں کے ساتھ موجود ہے۔

---

(۱) ابن القیمؒ: اعلام الموقعین ج:۱ ص:۶۶، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ۔

خلاصہ یہ کہ زیرِ بحث مسئلے میں صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لئے دیکھنے کی بات یہ نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کی رائے دلائل کے لحاظ سے مضبوط ہے یا کمزور؟ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ان میں اجتہاد کی اہلیت ہے یا نہیں، اگر ان میں اجتہاد کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور وہ کسی فقہی مسئلے میں کوئی رائے دیتے ہیں تو خواہ وہ ہمیں کتنی ہی کمزور معلوم ہو، اس سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے، لیکن اسے بدعت قرار دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے شاذ مذاہب میں ہم تک صرف ان حضرات کے اقوال پہنچے ہیں، ان کے دلائل تفصیل کے ساتھ نہیں پہنچ سکے، ورنہ اگر ان کے مکمل دلائل ہم تک پہنچتے تو شاید ان کے مذاہب ہمیں اتنے بدیہی البطلان بھی معلوم نہ ہوتے۔

اب سنئے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا علم و فقہ میں کیا مقام ہے؟ یہ روایت تو بہت سے محدثین اور مؤرخین نے اپنی کتابوں میں درج کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کے حق میں یہ دُعا فرمائی تھی کہ:-

اللّٰھم علّم معاویۃ الکتاب۔ (۱)

ترجمہ:- اے اللہ! معاویہ کو کتاب (قرآن) کا علم عطا فرما۔

نیز جامع ترمذی کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لئے یہ دُعا بھی فرمائی کہ:-

اللّٰھم اجعلہ ھادیًا مھدیًّا و اھد بہٖ۔ (۲)

ترجمہ:- یا اللہ! ان کو رہنما اور ہدایت یافتہ بنا اور ان کے ذریعے لوگوں کو ہدایت دے۔

اور حافظ شمس الدین ذہبیؒ نے سند کے ساتھ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو سواری پر اپنے پیچھے بٹھایا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ”تمہارے جسم کا کون سا حصہ مجھ سے متصل

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ ج:۸ ص:۱۲۲، مطبعۃ السعادۃ، مصر۔

(۲) مشکوٰۃ المصابیح ص:۵۷۹، اصح المطابع کراچی۔

ہے؟'' حضرت معاویہؓ نے جواب دیا کہ: ''پیٹ'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اللّٰھم املأہ علمًا.[1]

ترجمہ:- یا اللہ! اس کو علم سے بھر دے۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دُعا قبول ہوئی۔ صحیح بخاری کی یہ روایت میں اپنے پہلے مقالے میں نقل کر چکا ہوں کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں فرمایا:-

انہ فقیہ. (بلاشبہ وہ فقیہ ہیں)

علامہ ابن القیمؒ نے اعلام الموقعین میں اور حافظ ابنِ حجرؒ نے الاصابہ میں ان صحابہ کرامؓ کے اسمائے گرامی شمار کرائے ہیں جو فقہ و اجتہاد میں معروف تھے، انہوں نے صحابہ کرامؓ کے تین طبقے قرار دیئے ہیں، ایک وہ جن سے بہت سے فتاویٰ مروی ہیں، دُوسرے وہ جن سے ان سے کم فتاویٰ منقول ہوئے ہیں اور تیسرے وہ صحابہؓ جن سے بہت کم فتاویٰ ہم تک پہنچے ہیں، پھر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو متوسط طبقے میں شمار کیا ہے۔[2]

یہی وجہ ہے کہ توریثِ مسلم من الکافر کے مسئلے میں فقہائے اُمت نے جہاں بھی صحابہؓ، تابعینؒ اور دُوسرے فقہاء کے مذاہب شمار کرائے ہیں، وہاں حضرت معاویہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ کے اس قول کو بھی بطور ایک فقہی مسلک کے ذکر کیا ہے اور چودہ سو سال کے عرصے میں کوئی ایک فقیہ ہماری نظر سے نہیں گزرا جس نے اس قول کو ''بدعت'' قرار دیا ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص بھی حقیقت پسندی کے ساتھ ٹھنڈے دِل سے ان حقائق پر غور کرے گا اس کے واسطے بات سمجھنے کے لئے یہ بحث کافی ہوگی، اور وہ یقیناً اس موقف کی تائید کرے گا کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو ان کے اس فقہی مسلک کی بناء پر بدعت کا مرتکب قرار نہیں دیا جا سکتا۔

---

(۱) الذہبیؒ: تاریخ الاسلام ج:۲ ص:۳۱۹۔

(۲) دیکھئے: اعلام الموقعین ج:۱ ص:۹، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، و الاصابۃ ج:۱ ص:۲۲۔

آخر میں ملک غلام علی صاحب کے دیئے ہوئے ایک اور مغالطے کی نشاندہی ضروری ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:-

المغنی ج:۷ ص:۱۶۶ پر ابنِ قدامہؒ پہلے یہ بیان کرتے ہیں کہ محمد بن الحنفیہ، علی بن حسین، سعید بن المسیّب، مسروق، عبداللہ بن معقل، شعبی، ابراہیم نخعی، یحییٰ بن یعمر اور اسحاق کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلم کو کافر کا وارث قرار دیا ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں: ولیس بموثق به عنهم (اور اس کی نسبت ان کی جانب قابلِ اعتماد نہیں ہے)۔ تقریباً یہی وہ نام ہیں جنھیں البلاغ میں بار بار دُہرایا گیا ہے۔

(ترجمان، جون ۱۹۶۹ء، ص:۳۹)

اس عبارت سے ملک غلام علی صاحب کا منشاء یہ ہے کہ میں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس فقہی مسلک کے بارے میں جو کہا تھا کہ بہت سے حضراتِ تابعینؒ نے بھی اس مسلک کو اختیار کیا ہے، اس کی تردید کی جائے، لیکن اس مقصد کے لئے انہوں نے المغنی کی عبارت کو جس طرح نقل کیا ہے، اور اس کے مجموعی مفہوم کے ساتھ جو زیادتی فرمائی ہے اس کا اندازہ پوری عبارت کو سیاق وسباق کے ساتھ دیکھ کر ہی ہوسکتا ہے، علامہ ابنِ قدامہؒ کا پورا فقرہ یہ ہے:-

روی عن عمر ومعاذ ومعاوية أنهم ورثوا المسلم من الكافر ولم يورثوا الكافر من المسلم وحكى ذلك عن محمد بن الحنفية وعلى بن الحسين وسعيد بن المسيّب ومسروق وعبدالله بن معقل والشعبي والنخعي ويحيىٰ بن يعمر وإسحاق وليس بموثوق به عنهم فان أحمد قال: ليس بين الناس اختلاف في أن المسلم لا يرث الكافر.[1]

---

(۱) ابنِ قدامہؒ: المغنی ج:۶ ص:۲۹۴، دار المنار، مصر ۱۳۶۷ھ۔

ترجمہ:- حضرت عمرؓ، حضرت معاذؓ اور حضرت معاویہؓ سے یہ قول مروی ہے کہ انہوں نے مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا، اور کافر کو مسلمان کا وارث نہیں بنایا، یہی محمد بن حنفیہؒ، علیؒ بن حسینؒ، سعید بن مسیّبؒ، مسروقؒ، عبداللہ بن معقلؒ، شعبیؒ، نخعیؒ، یحییٰ بن یعمرؒ اور اسحاقؒ سے بھی منقول ہے، لیکن ان حضرات کی طرف اس قول کی نسبت قابلِ اعتماد نہیں، اس لئے کہ اِمام احمدؒ فرماتے ہیں کہ: لوگوں کے درمیان اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا۔

اب یہ بوالعجبی ملاحظہ فرمایئے کہ علامہ ابن قدامہؒ نے شروع میں اس مسلک کی نسبت صرف محمد بن حنفیہؒ وغیرہ ہی کی طرف نقل نہیں کی ہے، بلکہ حضرت عمرؓ، حضرت معاذؓ اور حضرت معاویہؓ کی طرف بھی نقل کی ہے، اور پھر آخر میں ان تمام ہی حضرات کے بارے میں فرمایا ہے: ''ان حضرات کی طرف اس قول کی نسبت ناقابلِ اعتماد ہے۔''(۱) لیکن ملک غلام علی صاحب حضرت عمرؓ، حضرت معاذؓ اور حضرت معاویہؓ کا نام حذف کرکے صرف محمد بن حنفیہؒ وغیرہ کے اسمائے گرامی ذکر کرتے ہیں اور یہ تأثر دیتے ہیں کہ ابنِ قدامہؒ نے صرف ان حضرات کی طرف اس مسلک کی نسبت کو مشکوک بتایا ہے، حالانکہ اگر ابنِ قدامہؒ کی بات ماننی ہے تو پوری مانئے، اور حضرت معاویہؓ کے بارے میں بھی یہ کہئے کہ ان کی طرف بھی اس قول کی نسبت صحیح نہیں، لہٰذا مولانا مودودی صاحب نے ان کے خلاف جو بحث چھیڑی ہے وہ جڑ مول ہی سے غلط ہے، لیکن یہ آخر انصاف و دیانت کی کون سی قسم ہے کہ ابنِ قدامہؒ کی بات کو محمد بن حنفیہؒ کے بارے میں تو آپ واجب التسلیم قرار دیتے ہیں اور وہ اسی فقرے میں حضرت معاویہؓ کے بارے میں جو کہہ رہے ہیں کہ ان کی طرف اس قول کی نسبت لائقِ اعتماد

---

(۱) اس لئے کہ انہوں نے دلیل میں اِمام احمدؒ کا قول نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ: ''لوگوں کے درمیان اس معاملے میں کوئی اختلاف نہیں ہے'' اس سے صاف واضح ہے کہ اس قول کی نسبت نہ حضرت معاویہؓ وغیرہ کی طرف دُرست ہے، نہ محمد بن حنفیہؒ وغیرہ کی طرف۔

نہیں، تو اسے نقل تک نہیں کرتے، تاکہ یہ کہا جاسکے کہ حضرت معاویہؓ اپنے اس مسلک میں تنہا ہیں، ان کا کوئی ہم نوا نہیں، اور پھر مولانا مودودی صاحب نے انہیں جو "بدعت" کا مرتکب بتایا ہے، اس کی تصدیق و تائید کی راہ ہموار ہوسکے، اس طرزِ عمل پر سوائے اظہارِ افسوس کے اور کیا کیا جائے؟

## نصف دیت کا معاملہ

دُوسرے نمبر پر میں نے مولانا مودودی صاحب کی اس عبارت پر تنقید کی تھی:-

> حافظ ابنِ کثیرؒ کہتے ہیں کہ دیت کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے سنت کو بدل دیا، سنت یہ تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی، مگر حضرت معاویہؓ نے اس کو نصف کردیا اور باقی نصف خود لینی شروع کردی۔ (خلافت وملوکیت ص:۱۷۳ و ۱۷۴)

میں نے اس عبارت پر چار اعتراض کئے تھے:-

۱- خط کشیدہ جملہ مولانا مودودی صاحب نے خود اپنی طرف سے بڑھادیا ہے، اصل کتاب میں یہ جملہ بالکل موجود نہیں ہے، نہ حافظ ابنِ کثیرؒ نے یہ جملہ کہا، نہ امام زہریؒ نے۔

ملک غلام علی صاحب نے میرا یہ اعتراض میری عبارت کے ذیل میں نقل کیا ہے، لیکن نہ تو اس کا کوئی جواب دیا ہے، نہ مولانا مودودی کی غلطی کا اعتراف کیا ہے، عربی داں حضرات خود بھی البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۹ کھول کر دیکھ سکتے ہیں۔

۲- دُوسرا اعتراض میں نے یہ کیا تھا کہ خط کشیدہ حصے کو چھوڑ کر باقی مقولے کی نسبت حافظ ابنِ کثیرؒ کی طرف کرنے میں بھی مولانا مودودی صاحب کو مغالطہ ہوا ہے، یہ مقولہ حافظ ابنِ کثیرؒ کا نہیں، اِمام زہریؒ ہی کا ہے، میں نے لکھا تھا کہ:[1]-

---

(۱) ملک صاحب کا یہ کہنا دُرست نہیں کہ: "اس سے نفسِ مسئلہ پر کچھ اثر نہیں پڑتا" ہمارے نزدیک یہ بات صاف ہونی اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر سننِ بیہقی کی جو روایت ہم نے آگے نقل کی ہے، اس کا کما حقہ اثر ظاہر نہیں ہوتا۔

"وبہ قال الزھری" کے الفاظ اس پر شاہد ہیں۔

## ایک دِلچسپ غلطی

میرے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ملک صاحب نے بڑی ہی دِلچسپ بات لکھی ہے، فرماتے ہیں:-

> مدیر البلاغ نے ابنِ کثیرؒ کے قول کے ساتھ سابق فقرے کے آخری الفاظ وبہ قال الزھری کو غلط طریق پر ملا کر ابنِ کثیرؒ کے قول کو اِمام زہریؒ کا قول بنا دیا ہے، حالانکہ قال اور بہ قال (یا قال بہ) کے معانی کا فرق تو انہیں معلوم ہونا چاہئے تھا، اور اس بات سے بھی بے خبر نہ ہونا چاہئے تھا کہ بہ قال کے الفاظ کو بالعموم آخر میں لایا جاتا ہے اور اس کا اشارہ قولِ ماسبق کی جانب ہوتا ہے۔ (ترجمان القرآن، جون ۱۹۶۹ء صفحہ:۴۰)

اگر ملک غلام علی صاحب کے ذریعے ہماری عربی زبان کی معلومات میں کوئی اضافہ ہوجاتا تو ہم ان کے ممنون ہی ہوتے، لیکن مشکل یہ ہے کہ "مدیر البلاغ" کو ملک صاحب سے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل نہیں ہوسکی، اس کے بجائے اس نے "عربی مدارس کے ماحول" میں تعلیم پائی ہے، جہاں کا ادنیٰ طالبِ علم بھی اس بات کو جانتا ہے کہ "بہ قال" کی ایک قسم اور بھی ہے جو ہمیشہ روایت کے شروع میں آتی ہے، یہ محدثین کا جانا بوجھا طریقہ ہے کہ جب وہ ایک سند سے کسی کا ایک مقولہ ذکر کرتے ہیں اور پھر آگے اسی سند سے اسی شخص کا دُوسرا مقولہ نقل کرنا چاہتے ہیں تو دُوسرے مقولے میں سند کا اعادہ کرنے کے بجائے شروع میں "وبہ قال" کہنے پر اکتفا کرتے ہیں، "بہ" کی ضمیر سند کی طرف راجع ہوتی ہے، یعنی: "وبھٰذا السند قال" جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ "مذکورہ سند سے ہی اس کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے۔"

یہاں بھی "بہ قال الزھری" کا جملہ اسی معنیٰ میں آیا ہے، شروع میں حافظ ابنِ کثیرؒ نے توریثِ مسلم من الکافر کے سلسلے میں اِمام زہریؒ کا قول نقل کیا ہے، اس

کے بعد چونکہ ''نصف دیت'' کے بارے میں اِمام زہریؒ کا مقولہ بھی اسی سند سے مروی تھا، اس لئے اس کے شروع میں ''وبہٖ قال الزھری'' کہہ دیا ہے، ملاحظہ فرمایئے البدایہ والنہایہ کی پوری عبارت اس طرح ہے:-

وقال أبو اليمان عن شعيب عن الزهري: مضت السنة أن لا يرث الكافر المسلم ولا المسلم الكافر وأوّل من ورث المسلم من الكافر معاوية، وقضى بذٰلك بنو أمية بعده حتّٰى كان عمر بن عبدالعزيز فراجع السُّنّة وأعاد هشام ما قضى به معاوية وبنو أمية من بعده وبه قال الزهري ومضت السنة أن دية المعاهد كدية المسلم، وكان معاوية أوّل من قصرها إلى النصف ....الخ.

ترجمہ:- ابو الیمان شعیب سے اور وہ زہریؒ سے روایت کرتے ہیں کہ سنت یہ چلی آتی تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہوگا، نہ مسلمان کافر کا، یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیزؒ آئے تو انہوں نے پہلی سنت کو لوٹا دیا، پھر ہشام نے اس فیصلے کو لوٹا دیا جو حضرت معاویہؓ اور ان کے بعد کے بنو اُمیہ نے کیا تھا، اور مذکور سند ہی سے اِمام زہریؒ کہتے ہیں کہ سنت یہ چلی آتی تھی کہ معاہد کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی، معاویہؓ پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے اسے کم کر کے نصف کر دیا.....الخ۔

اب اگر ملک صاحب کے ارشادات کے مطابق ''وبہٖ قال الزھری'' کے الفاظ کو اگلے فقرے کے بجائے سابق فقرے سے متعلق سمجھا جائے تو عبارت کا ترجمہ یہ ہوجائے گا کہ: ''پہلے وہ شخص جنھوں نے مسلمان کو کافر کا وارث قرار دیا معاویہؓ ہیں، اسی پر ان کے بعد بنو اُمیہ فیصلے کرتے رہے یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیزؒ آئے تو انہوں نے پہلی سنت کو لوٹا دیا، پھر ہشام نے اس فیصلے کو لوٹا دیا، جو حضرت معاویہؓ اور ان کے بعد کے بنو اُمیہ نے کیا تھا، اور یہی اِمام زہریؒ کا قول ہے''۔

اب یہ طرفہ تماشا ملاحظہ فرمایئے کہ ایک طرف تو ملک صاحب اس بات پر مصر ہیں کہ امام زہریؒ کے نزدیک حضرت معاویہؓ کا یہ فیصلہ سنت نہیں بلکہ بدعت تھا، دُوسری طرف یہ بھی فرماتے ہیں کہ "وبہٖ قال الزھری" کا تعلق توریثِ مسلم کے مقولے سے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اِمام زہریؒ نے حضرت معاویہؓ ہی کے فیصلے کو صحیح قرار دیا ہے، اور جس چیز کو وہ "بدعت" سمجھتے ہیں اسی کو اپنا مذہب بھی بنایا ہے۔

کیا جناب ملک صاحب اس پر راضی ہیں؟

"مدیر البلاغ" کا جرم یہ ہے کہ اس نے اس مضحکہ خیز صورتِ حال کو دیکھ کر اتنا لکھ دیا تھا کہ مولانا مودودی صاحب سے اس عبارت کا مفہوم سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہے، یہ مقولہ حافظ ابنِ کثیرؒ کا نہیں، بلکہ اِمام زہریؒ ہی کا ہے، "وبہٖ قال الزھری" کے الفاظ اس پر شاہد ہیں، اور پھر غلط فہمی سے بچانے کے لئے "بہٖ قال الزھری" کا ترجمہ بھی ان الفاظ کے ساتھ کردیا تھا کہ: "مذکورہ سند ہی سے اِمام زہریؒ کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے۔" ہم سمجھتے تھے کہ اہلِ علم کے لئے اتنا اشارہ کافی ہوگا، لیکن ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ ملک صاحب کے لئے اتنا اشارہ غلط فہمی کا سبب بن جائے گا، اور وہ جواب میں ہمیں "بہٖ قال" کے مفہوم سے باخبر کرنے کی سعادت عطا فرمائیں گے۔

بہرکیف! جس شخص کو حدیث اور تاریخ کی عربی کتابوں سے ادنیٰ ممارست بھی رہی ہو وہ اس تشریح کے بعد اس حقیقت میں شبہ نہیں کرسکتا کہ دیت کے بارے میں یہ مقولہ حافظ ابنِ کثیرؒ کا اپنا نہیں، بلکہ اِمام زہریؒ کا ہے، حافظ ابنِ کثیرؒ نے صرف اسے نقل کیا ہے۔

۳- اس کے بعد ہم نے عرض کیا تھا کہ اِمام زہریؒ کا یہ قول یہاں اختصار اور اجمال کے ساتھ بیان ہوا ہے، اس کی پوری تفصیل بیہقیؒ نے اپنی سننِ کبریٰ میں روایت کی ہے، اور اس میں یہ تصریح ہے کہ حضرت معاویہؓ آدھی دیت مقتول کے ورثاء کو دیتے تھے اور باقی نصف بیت المال میں داخل کردیتے تھے،(۱) لہٰذا آدھی دیت کو اپنے ذاتی استعمال میں لانے کا کوئی سوال نہیں۔

---

(۱) السنن الکبریٰ للبیہقی ج:۸ ص:۱۰۲، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباد دکن ۱۳۵۴ھ، پوری عبارت کے لئے ملاحظہ ہو یہی کتاب ص:۲۰۔

یہ بالکل صاف اور سیدھی سی بات تھی کہ حافظ ابنِ کثیرؒ نے امام زہریؒ کا مقولہ اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے، بیہقیؒ نے تفصیل کے ساتھ، لہٰذا اعتبار بیہقیؒ کی روایت کا ہوگا، اور اس کی موجودگی میں یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ حضرت معاویہؓ نے آدھی دیت اپنے استعمال میں لانی شروع کردی تھی، مولانا مودودی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے:-

> تمام بزرگانِ دین کے معاملے میں عموماً اور صحابہ کرامؓ کے معاملے میں خصوصاً میرا طرزِ عمل یہ ہے کہ جہاں تک کسی معقول تأویل سے یا کسی معتبر روایت کی مدد سے ان کے کسی قول یا عمل کی صحیح تعبیر ممکن ہو، اسی کو اختیار کیا جائے اور اس کو غلط قرار دینے کی جسارت اس وقت تک نہ کی جائے جب تک کہ اس کے سوا چارہ نہ رہے۔ (خلافت وملوکیت ص:۳۰۸)

اس لئے ہم سمجھتے تھے کہ سننِ بیہقیؒ کی اس "معتبر روایت" کو دیکھ کر مولانا کی طرف سے مسرّت کا اظہار ہوگا کہ "اس کی مدد سے" حضرت معاویہؓ کے فعل کی صحیح تعبیر مل گئی، لیکن افسوس ہے کہ ملک غلام علی صاحب کو اَب بھی اس بات پر اصرار ہے کہ حضرت معاویہؓ آدھی دیت ذاتی استعمال ہی کے واسطے لیتے تھے، اور بیہقیؒ کی روایت میں جو بیت المال کا لفظ آیا ہے اس سے مراد بھی حضرت معاویہؓ کی ذات ہی ہے، دلائل ملاحظہ فرمایئے:-

> واقعہ یہ ہے کہ مؤرّخین نے دُوسرے مقامات پر بھی امیر معاویہؓ اور دُوسرے بنواُمیہ کے عائد کردہ غنائم و محاصل کے لئے دونوں طرح کے الفاظ استعمال کئے ہیں، ایک ہی واقعے میں کہیں لنفسہٖ کا لفظ ہے اور کہیں لبیت المال کا لفظ، اب اگر بیت المال کی پوزیشن فی الواقع امیر معاویہؓ اور آپ کے جانشینوں کے زمانے میں وہی ہوتی جو عہدِ نبوی اور خلافتِ راشدہ میں تھی، تب تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ ہر جگہ لنفسہٖ سے مراد لبیت مال المسلمین

> ہے، لیکن بیت المال اگر ذاتی اور سیاسی مقاصد و اغراض کے لئے بلا تأمل اور بے دریغ استعمال ہونے لگے، فرمانروا کے صَرفِ خاص اور قوم کے بیت المال میں عملاً کوئی فرق نہ رہے اور مسلمانوں کا امیر بیت المال کے آمد و خرچ اور حساب و کتاب کے معاملے میں مسلمانوں کے سامنے جوابدہ نہ رہے تو پھر صورتِ حال اُلٹ جاتی ہے، اس صورت میں أخذ لبیت المال بھی أخذ لنفسہٖ بن کر رہ جاتا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن، جون ۱۹۶۹ء ص: ۴۰ و ۴۱)

ہماری پہلی گزارش تو یہ ہے کہ اگر ملک صاحب کے اس ارشادِ گرامی کے مطابق حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں "أخذ لبیت المال" بھی "أخذ لنفسہٖ" بن کر رہ گیا ہے تو ملک صاحب کو چاہئے کہ تاریخ میں جن جن مقامات پر حضرت معاویہؓ کا بیت المال کے لئے کچھ لینا مذکور ہے، ان سب کو حضرت معاویہؓ کے "جرائم" کی فہرست میں شامل فرمالیں، اور جب کوئی پوچھے کہ یہ فعل جرم کیسے ہوا؟ تو یہی بلیغ جواب دُہرا دیں کہ حضرت معاویہؓ کے حق میں "أخذ لبیت المال" کا جملہ "أخذ لنفسہٖ" کے معنی دیتا ہے۔

پھر کیا جناب غلام علی صاحب کوئی دلیل ایسی پیش کرسکتے ہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت معاویہؓ نے بیت المال کی رقوم اپنے ذاتی استعمال میں لانی شروع کردی تھیں؟ اور عملاً ان کے ذاتی صَرف اور بیت المال میں کوئی فرق نہیں رہا تھا؟ عجیب بات ہے کہ دعویٰ تو وہ کرتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں بیت المال ذاتی اغراض کے لئے بے دریغ استعمال ہونے لگا تھا، مگر خود اپنے اس دعوے کی کوئی دلیل پیش کرنے کے بجائے اس دعوے کی نفی پر دلیل ہم سے طلب فرماتے ہیں کہ:-

> کیا کوئی شخص یہ بتاسکتا ہے کہ ان کے عہدِ خلافت میں خلیفہ کے لئے ایک مشاہرہ متعین کردیا گیا ہو اور بیت المال کے مصارف ان کے ذاتی مصارف سے بالکل الگ رکھے گئے ہوں۔

حالانکہ بیت المال کی پوزیشن میں تبدیلی کا دعویٰ خود انہوں نے کیا ہے، اور دُنیا بھر کے مُسلّمہ اُصولِ استدلال کی رُو سے دلیل اس کے ذمے ہے جو تبدیلی کا مدعی ہے، جو شخص تبدیلی کا انکار کرتا ہے اس کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تبدیلی کی کوئی دلیل نہیں۔ اس لحاظ سے ان کے دعوے کی تردید کے لئے دلیل پیش کرنا ہماری ذمہ داری نہیں تھی، مگر تبرعاً ہم یہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ اس مقالے کی تحریر کے دوران حضرت معاویہؓ سے متعلق حدیث اور تاریخ کی بیسیوں کتابیں ہماری نگاہ سے گزری ہیں، ہمیں تو کہیں اس کا ادنیٰ ثبوت بھی نہیں مل سکا کہ وہ بیت المال کو ذاتی مصارف میں خرچ کرنے لگے تھے، اس کے بجائے ایک ایسی روایت ملی جو شاید ملک صاحب کی بصیرت میں اضافہ کرسکے، حافظ شمس الدین ذہبی رحمۃ اللہ علیہ سندِ حسن کے ساتھ نقل کرتے ہیں:-

عن معاوية وصعد المنبر يوم الجمعة فقال عند خطبته: أيها الناس! إن المال مالنا والفيء فيئنا، من شئنا أعطينا ومن شئنا منعنا، فلم يجبه أحد، فلما كانت الجمعة الثانية قال مثل ذلك فلم يجبه أحد، فلما كانت الجمعة الثالثة قال مثل مقالته فقام إليه رجل فقال: كلّا! إنما المال مالنا والفيء فيئنا، من حال بيننا وبينه حكمناه إلى الله بأسيافنا. فنزل معاوية فأرسل إلى الرجل فأدخل عليه فقال القوم: هلک، ففتح معاوية الأبواب ودخل الناس فوجدوا الرجل معه على السرير فقال: إن هذا أحياني أحياه الله، سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ستكون أئمة من بعدى يقولون فلا يردّ عليهم قولهم، يتقاحمون فى النار تقاحم القردة، وإنى تكلّمت فلم يرد علىّ أحد فخشيت أن أكون منهم، فتكلّمت الثانية فلم يرد علىّ أحد، فقلت فى نفسى:

إنی من القوم، ثم تکلمت الجمعة الثالثة فقام هذا فرد علیّ فأحیانی أحیاه الله فرجوت أن یخرجنی الله منهم، فأعطاه وأجازه.

ترجمہ:- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ ایک مرتبہ جمعہ کے دن منبر پر چڑھے اور خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ: ''ساری دولت ہماری دولت ہے اور سارا مالِ غنیمت ہمارا مال ہے، ہم جس کو چاہیں گے دیں گے، اور جس کو چاہیں گے روک دیں گے۔'' اس پر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا، دُوسرا جمعہ آیا تو انہوں نے پھر یہی بات دُہرائی، مگر کوئی نہ بولا، پھر جب تیسرا جمعہ آیا تو حضرت معاویہؓ نے پھر یہی بات کہی، تو ایک شخص اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کہا: ''ہرگز نہیں! مال تو سارا ہمارا ہے، مالِ غنیمت بھی ہم سب کا ہے، جو شخص ہمارے اور اس کے درمیان حائل ہوگا، ہم اپنی تلوار کے ذریعے اس کا فیصلہ اللہ کے پاس لے جائیں گے۔'' یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ منبر سے اُترے، اس شخص کو بلوا بھیجا، جب اسے حضرت معاویہؓ کے پاس داخل کیا گیا تو لوگ کہنے لگے کہ یہ شخص مارا گیا، لیکن حضرت معاویہؓ نے دروازے کھول دیئے، لوگ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ شخص ان کے ساتھ چارپائی پر بیٹھا ہوا ہے، اس پر حضرت معاویہؓ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس شخص کو زندہ رکھے، اس نے مجھے زندہ کردیا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ''میرے بعد کچھ اُمراء ایسے آئیں گے جو (غلط) باتیں کہیں گے، مگر ان کا جواب نہیں دیا جائے گا، ایسے لوگ آگ میں بندروں کی طرح داخل ہوں گے۔'' میں نے (اپنا امتحان کرنے کے لئے) ایک بات کہی تھی، کسی نے اس کی تردید

نہ کی تو مجھے ڈر ہوا کہ کہیں میں اُمراء میں داخل نہ ہو جاؤں، تو میں نے دوبارہ وہی بات کہی، پھر بھی کسی نے جواب نہ دیا تو میں نے اپنے دِل میں کہا کہ میں انہی لوگوں میں سے ہوں، پھر میں نے تیسرے جمعہ میں وہی بات کہی تو یہ شخص کھڑا ہو گیا اور اس نے میری تردید کی، اور اللہ اسے زندہ رکھے، اس نے مجھے زندہ کر دیا، اب مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسے اُمراء کے زُمرے سے نکال دے گا۔'' پھر حضرت معاویہؓ نے اس شخص کو انعام دیا۔

حافظ ذہبیؒ یہ روایت نقل کر کے فرماتے ہیں:۔

هذا حديث حسن.[1]

ترجمہ:۔ (سند کے لحاظ سے) یہ حدیث حسن ہے۔

اور سنئے! محمد بن عوف طائیؒ اپنی سند سے عطیہ بن قیسؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ میں نے حضرت معاویہؓ کو خطبے میں فرماتے ہوئے سنا کہ: ''تمہارے بیت المال میں وظائف ادا کرنے کے بعد بھی کچھ رقم بچ گئی ہے، اب میں وہ بھی تمہارے درمیان تقسیم کر رہا ہوں، اگر آئندہ سال بھی رقم بچ گئی تو وہ بھی تقسیم کر دیں گے، ورنہ مجھ پر کوئی الزام نہ ہوگا، فإنه ليس بمالي وإنما هو مال الله الذي أفاء عليكم، اس لئے کہ وہ میرا مال نہیں بلکہ اللہ کا مال ہے جو اللہ نے تم کو بطورِ غنیمت عطا کیا ہے''۔[2]

کیا اب بھی ملک صاحب یہ فرمائیں گے کہ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں بیت المال ذاتی اغراض کے لئے بے دریغ استعمال ہونے لگا تھا؟

۴۔ چوتھا اعتراض میں نے یہ کیا تھا کہ مسئلہ عہدِ صحابہؓ ہی سے مختلف فیہ چلا آتا ہے کہ ذمی کی دیت مسلمان کے برابر ہوگی یا اس سے آدھی یا تہائی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس معاملے میں مختلف احادیث مروی

(۱) الذہبیؒ: تاریخ الاسلام ج:۲ ص:۳۲۱ و۳۲۲، مکتبۃ القدسی ۱۳۶۸ھ۔

(۲) ابنِ تیمیہؒ: منہاج السنۃ ج:۳ ص:۱۸۵، بولاق ۱۳۲۲ھ۔

ہیں، کسی میں پوری دیت ادا کرنے کا حکم ہے، کسی میں آدھی کا، اسی لئے حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے بھی آدھی دیت لینے کا حکم مروی ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا عمل بھی اسی پر رہا، اور اِمام مالکؒ کا بھی یہی مذہب ہے، اِمام ابوحنیفہؒ پوری دیت والی روایت کو ترجیح دیتے ہیں اور مسلمان اور ذمی کی دیت میں کوئی فرق نہیں کرتے، حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان دونوں مذاہب کی درمیانی راہ اختیار کرتے ہوئے متعارض احادیث میں تطبیق دی اور یہ مسلک اختیار کیا کہ آدھی دیت مقتول کے ورثاء کو دِلوائی اور آدھی دیت بیت المال کو۔ میں نے صرف یہ صاف لکھا تھا کہ یہ حضرت معاویہؓ کا فقہی اجتہاد ہے، جس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے مگر اسے بدعت نہیں کہا جاسکتا۔

ملک صاحب نے اس کے جواب میں پھر حضرت معاویہؓ کے دلائل پر گفتگو کرکے انہیں کمزور کرنے کی کوشش کی ہے، اور ان کے مقابلے میں اپنے دلائل پیش کئے ہیں، اگرچہ ان کے بیان کئے ہوئے دلائل پر بھی کلام کیا جاسکتا ہے، لیکن ہمارے خیال میں یہ پوری بحث بالکل غیر متعلق ہے، اس لئے کہ بحث سرے سے یہ ہے ہی نہیں کہ حضرت معاویہؓ کے دلائل مضبوط ہیں یا کمزور، ہم خود بھی مسلک کے لحاظ سے حضرت معاویہؓ کے مسلک کے قائل نہیں ہیں، گفتگو تو یہ ہے کہ ایک فقیہ مجتہد کے کسی فقہی مسلک کو دلائل کے لحاظ سے کمزور قرار دینے کے بعد بھی اسے بدعت نہیں کہا جاسکتا، اور ہم سمجھتے ہیں کہ "توریثِ مسلم" کے مسئلے میں ہم اس پر کافی بحث کرچکے ہیں، یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

## مالِ غنیمت میں خیانت

مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے:-

> مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے صریح اَحکام کی خلاف ورزی کی، کتاب وسنت کی رُو سے پورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت

المال میں داخل ہونا چاہئے اور باقی چار حصے اس فوج میں تقسیم
ہونے چاہئیں جو لڑائی میں شریک ہو، لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم
دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا ان کے لئے الگ نکال
دیا جائے، پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔

مولانا مودودی صاحب نے اس واقعے کے لئے پانچ کتابوں کے حوالے دیئے تھے، جن میں سے ایک البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۲۹ کا حوالہ بھی تھا، میں نے اس حوالے کی مکمل عبارت نقل کر کے ثابت کیا تھا کہ اس میں صاف یہ الفاظ موجود ہیں کہ: ''یجمع کلہ من ھذہ الغنیمۃ لبیت المال'' (اس مالِ غنیمت کا سارا سونا چاندی بیت المال کے لئے جمع کیا جائے)۔ ایسی صورت میں مولانا مودودی صاحب کے لئے جائز نہیں تھا کہ وہ اس کتاب کے حوالے سے یہ تحریر فرمائیں کہ: ''حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا، ان کے لئے الگ نکال لیا جائے۔'' محترم ملک غلام علی صاحب اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

مولانا مودودی نے اس بات کی سند میں پانچ کتابوں کے
حوالے دیئے تھے جن میں سے پانچواں اور سب سے آخری
حوالہ البدایہ والنہایہ کا تھا، اب جناب محمد تقی صاحب نے کیا یہ
ہے کہ باقی کتابوں کو چھوڑ کر صرف البدایہ کا حوالہ نقل کر دیا ہے۔

ملک صاحب نے یہ بات کچھ ایسے انداز سے فرمائی ہے کہ جیسے میں نے البدایہ والنہایہ کا حوالہ نقل کر کے کسی جرمِ عظیم کا ارتکاب کیا ہے، سوال یہ ہے کہ جب مولانا مودودی صاحب نے البدایہ کا حوالہ بقید صفحات خود اپنی کتاب میں درج فرمایا ہے، اور ساتھ ہی ضمیمے میں یہ بھی لکھا ہے کہ:-

اصحابِ علم خود اصل کتابوں سے مقابلہ کر کے دیکھ سکتے ہیں۔

(خلافت وملوکیت ص:۲۹۹)

تو کیا یہاں ''البدایہ'' کی طرف رُجوع کرنا محض اس وجہ سے گناہ ہوگیا ہے
کہ اس سے مولانا مودودی صاحب کی ایک غلطی واضح ہوتی ہے؟

یہ دُرست ہے کہ باقی چار حوالوں میں ''بیت المال'' کا لفظ نہیں ہے، لیکن میں ایک مثال پیش کرتا ہوں (جسے محض بات سمجھنے کے لئے پیش کیا جارہا ہے، اس لئے اس پر بُرا ماننے کی کوئی وجہ نہیں) ملک صاحب غور فرمائیں کہ اگر چار اخباروں میں یہ خبر شائع ہو کہ: ''مولانا مودودی صاحب نے اپنے لئے ایک لاکھ روپیہ چندہ وصول کیا'' اور ایک پانچویں اخبار میں خبر کے الفاظ یہ ہوں کہ: ''مولانا مودودی صاحب نے جماعتِ اسلامی کے لئے ایک لاکھ روپیہ چندہ وصول کیا'' پھر کوئی شخص ان پانچوں اخباروں کے حوالے سے مولانا پر یہ الزام عائد کرے کہ وہ اپنی ذات کے لئے چندہ وصول کرتے ہیں، تو کیا ملک صاحب اس الزام تراش شخص کو پانچواں اخبار محض اس لئے نہیں دِکھائیں گے کہ اس کا حوالہ پانچویں نمبر پر سب سے آخر میں دیا گیا تھا؟

ظاہر ہے کہ اس شخص سے یہی کہا جائے گا کہ پانچویں اخبار میں صراحت کے ساتھ ''جماعتِ اسلامی'' کا لفظ موجود ہے، اس لئے تمہارے لئے جائز نہیں تھا کہ اس اخبار کا حوالہ بھی دو، اور یہ بھی کہو کہ مولانا مودودی صاحب نے یہ چندہ اپنی ذات کے لئے وصول کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر معقول آدمی ان پانچوں اخبارات کو پڑھ کر یہ کہے گا کہ دراصل پہلے چار اخبارات میں خبر مجمل اور مختصر شائع ہوئی ہے، اور پانچویں اخبار نے اصل حقیقت واضح کردی ہے، اس لئے اعتبار اسی کا ہوگا، پہلے اخبارات نے یا تو معاملے کی تحقیق نہیں کی یا ان کے رپورٹروں نے مولانا سے عناد کی بناء پر اس چندے کو مولانا کی ذات کی طرف منسوب کردیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہی بات میں نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں کہہ دی تو کون سا گناہ کیا؟ یہاں تو پانچ حوالوں کا معاملہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اگر دس کتابوں میں بھی حضرت معاویہؓ یا کسی اور صحابی، تابعی یا کسی بھی شریف آدمی کی طرف ایک مجمل بات منسوب کی گئی ہو جس سے اس کی ذات پر کوئی اعتراض وارِد ہوسکتا ہو اور کوئی گیارہویں کتاب اس کی تفصیل بیان کرکے حقیقت واضح کردے تو عقل، دیانت اور انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ دس کی دس کتابوں کو اسی آخری کتاب کی تشریح پر محمول کیا جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ مولانا مودودی صاحب کی یہ غلطی دو اور دو چار کی طرح واضح ہے، اسے سمجھنے کے لئے کسی لمبے چوڑے فلسفے کی ضرورت نہیں، اور اگر کوئی شخص اتنی واضح غلطی کو بھی صحیح قرار دینے پر اصرار کرے تو اسے اعلان کردینا چاہئے کہ وہ مولانا مودودی صاحب کو معصوم اور غلطیوں سے پاک تصوّر کرتا ہے، ساری دُنیا کی آنکھیں فریب کھاسکتی ہیں، لیکن ان کے قلم سے کوئی کوتاہی سرزد نہیں ہوسکتی۔

ملک صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ ان پانچوں مؤرّخین میں سب سے آخر میں آئے ہیں، اس لئے ان کا قول پہلے مؤرّخین کے مقابلے میں مرجوح ہے۔ لیکن اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے جتنی باتیں پہلی تواریخ کے خلاف یا ان سے زائد نقل کی ہیں، وہ ساری کی ساری ردّ کردی جائیں، کیونکہ پہلی تواریخ میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ پھر تو حافظ ابنِ کثیرؒ نے فضول ہی ایک مستقل تاریخ لکھنے کی تکلیف گوارا کی، انہیں چاہئے تھا کہ پہلی تواریخ ہی پر اکتفا فرمالیتے، اور ایک حافظ ابنِ کثیرؒ ہی پر کیا موقوف ہے، اگر تاریخ کا بعد میں لکھا جانا اس کی تردید کی دلیل ہے تو اسلام میں جو تاریخ سب سے پہلے لکھی گئی تھی، اس کے بعد کسی کو بھی اس موضوع پر قلم نہیں اُٹھانا چاہئے تھا، اور اگر کسی نے اُٹھالیا تھا تو ساری اُمت کو چاہئے تھا کہ بعد کی تمام تواریخ کو نذرِ آتش کردیتی کہ ان سے گمراہیاں پھیلتی ہیں۔

مولانا مودودی صاحب کی اس صریح غلطی کی تأویل کرنے کے لئے جناب غلام علی صاحب نے دِلچسپ ترین بات یہ لکھی ہے کہ: ''آٹھویں صدی ہجری تک ابنِ کثیرؒ سے پہلے جن لوگوں نے اس واقعے کو نقل و روایت کیا ہے اور جنھوں نے ان پہلی تاریخوں کا مطالعہ کیا ہے، کیا ان کا یہ بیان کرنا یا یہ سمجھنا بالکل غلط ہوگا کہ امیر معاویہؓ نے یہ مال اپنی ذات کے لئے طلب کیا تھا؟'' ملک صاحب کا منشاء غالباً یہ ہے کہ اگر ایک تاریخی حقیقت کے مجمل رہنے کی وجہ سے ساتویں صدی تک کے انسان کسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہوں، اور آٹھویں صدی میں وہ حقیقت واضح ہوکر سامنے آئی ہو تو

بعد کے لوگوں پر بھی واجب ہے کہ وہ حقیقت کے اس انکشاف سے آنکھیں بند کر کے بدستور غلط فہمی ہی میں مبتلا رہیں، اور محض اس لئے اس حقیقت پر کان نہ دھریں کہ وہ ساتویں صدی کے لوگوں پر واضح نہیں ہو سکتی تھی۔

یوں ملک صاحب کے مزید اطمینان کے لئے ہم یہ وثوق کے ساتھ عرض کر سکتے ہیں کہ ساتویں صدی تک کے لوگوں نے بھی ان الفاظ کا یہی مطلب لیا ہوگا کہ حضرت معاویہؓ نے یہ مال اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ بیت المال کے لئے منگایا تھا، اس لئے کہ وہ لوگ زبان و بیان کے محاورات سے اتنے بے خبر نہیں تھے کہ الفاظ کے ظاہر ہی کو تھام کر بیٹھ جائیں اور اس بات سے قطع نظر کر لیں کہ اگر ایک امیرِ سلطنت اپنے کسی ماتحت کو یہ حکم لکھ کر بھیجے کہ ''خراج کا روپیہ مجھے بھیج دو'' تو محاورۃً ''مجھے'' سے مراد اپنی ذات نہیں ہوتی بلکہ سرکاری خزانہ ہوتا ہے، اور اگر کوئی شخص اس ''مجھے'' کے لفظ کو پکڑ کر بیٹھ جائے تو اس کو خلفائے راشدینؓ کے اَحکام میں بھی (معاذ اللہ) خیانت کی بو آ سکتی ہے۔

ان دلائل کی روشنی میں یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یہ سونا چاندی اپنی ذات کے لئے نہیں، بلکہ بیت المال کے لئے منگایا تھا، اس سلسلے میں ملک صاحب نے جو تاویلات ذکر فرمائی ہیں، ان کا جواب بھی عرض کر دیا گیا، اور میں سمجھتا ہوں کہ خود ملک صاحب بھی جب کبھی تنہائی میں اپنی ان تاویلات پر غور فرمائیں گے تو انہیں کوئی خوشی نہیں ہوگی۔

اب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ بیت المال ہی کے لئے سہی، سارا سونا چاندی طلب کر لینا شرعاً کہاں جائز ہے؟ اس کا جواب میں نے یہ دیا تھا کہ اگر سارا سونا چاندی پورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ ہو تو یہ حکم شریعت کے مطابق ہو جاتا ہے، بیت المال میں سونے چاندی کی کمی ہوگی اس لئے حضرت معاویہؓ نے یہ حکم دے دیا کہ سارا سونا چاندی (جو حضرت معاویہؓ کے اندازے کے مطابق کل مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ تھا) بیت المال میں بھیج دیا جائے، ملک صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں:-

یہ استدلال بھی مہمل ہے کہ اس وقت بیت المال میں سونے

چاندی کی کمی تھی جسے امیر معاویہؓ پورا کرنا چاہتے تھے، اس زمانے میں مبادلہ زَر اور تبادلہ اشیاء کا نظام زیادہ پیچیدہ نہ تھا، اور سونے چاندی کے ذخائر بیت المال کے استحکام کے لئے محفوظ رکھنے کی خاص ضرورت نہ تھی۔

اب یہ مقام تو ہمارے محترم نقاد ہی کو حاصل ہے کہ وہ چودہ سو سال پہلے کی حکومت کے بارے میں اس زمانے کے حکمران سے بھی زیادہ صحیح اندازہ لگالیتے ہیں کہ اس وقت بیت المال میں سونے چاندی کی ضرورت تھی یا نہیں تھی، ہمیں کشف و الہام کا یہ کمال تو حاصل نہیں، لہٰذا ہمیں یہ جرأت بھی نہیں ہے کہ اپنے اندازے کے خلاف ہر اِمکان کو ''مہمل'' قرار دے دیں، لیکن جو تھوڑی سی عقل اللہ نے دی ہے، اس سے اتنا خیال ضرور ہوتا ہے کہ اس زمانے میں جو نظامِ زَر (Monetary System) رائج تھا، وہ دو دھاتی معیار (Bi-Metalism) پر مبنی تھا جس میں بیت المال کو سونے چاندی کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس نظام میں سکے بھی سونے چاندی ہی کے چلتے تھے اور آج کل کی طرح سونے چاندی کی کمی زائد نوٹ چھاپ کر پوری نہیں کی جاسکتی تھی، اس لئے بیت المال کے استحکام کے لئے سونے چاندی کی ضرورت آج سے زیادہ ہو تو ہو، کم کسی طرح نہیں تھی۔

اور اگر بالفرض اس وقت بیت المال کو سونے چاندی کی ضرورت آج کے مقابلے میں کم ہوتی تھی تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کبھی ضرورت پڑتی ہی نہیں تھی؟ اور کیا اس دور میں کسی ایسے وقت کا تصوّر ہی نہیں کیا جاسکتا جس میں بیت المال کے اندر سونا چاندی ضرورت کے مقابلے میں کم ہوگیا ہو؟

ملک غلام علی صاحب نے تاریخِ طبریؒ کی ایک روایت پیش کر کے کہا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے صرف سونا چاندی ہی نہیں بلکہ دُوسری نفیس اور عمدہ اشیاء (الروائع) بھی طلب کی تھیں، لیکن طبریؒ کی اس روایت میں کئی راوی مجہول الحال ہیں، اس کے مقابلے میں خود انہوں نے مستدرک حاکمؒ کی جو روایت نقل کی ہے وہ سند کے لحاظ سے مضبوط ہے، اور اس میں ''الروائع'' کا لفظ نہیں ہے، لہٰذا یہ لفظ

حاشیہ آرائی کے سوا کچھ نہیں۔

میں نے اپنے مضمون میں مولانا مودودی صاحب کی عبارت کو ان کے مأخذ کے مقابلے میں رکھ کر یہ دکھلایا تھا ہ دونوں میں کیا کیا تفاوت پایا جاتا ہے؟ اس کا مقصد صرف دونوں عبارتوں کا فرق بیان کرنا تھا۔ وہاں حضرت معاویہؓ کے فعل کے جواز اور عدمِ جواز سے بحث نہیں تھی، یہ بحث میں نے آگے کی تھی، لیکن جناب ملک غلام علی صاحب نے میرے مضمون کے نکات میں تقدیم وتأخیر کر کے انہیں ''تأویلات'' کا لقب عطا فرمایا اور پھر ان تأویلات کی تردید میں کئی صفحات سپردِ قلم کئے ہیں۔ جب خلطِ مبحث اس حد تک پہنچ جائے تو ظاہر ہے کہ اس کا جواب دینا تطویل بھی ہے اور وقت کا ضیاع بھی، ملک صاحب کے بنیادی نکات کا جواب میں نے اُوپر دے دیا ہے، اس خلطِ مبحث کے لئے میں قارئین کو صرف یہ دعوت دینے پر اکتفا کرتا ہوں کہ وہ میرے اور ان کے مضمون کو آمنے سامنے رکھ کر مطالعہ فرمالیں، اِن شاء اللہ حقیقت واضح ہوجائے گی۔

## حضرت علیؓ پر سبّ وشتم

اس موضوع پر مولانا مودودی صاحب کی زیرِ بحث عبارت یہ تھی:۔

> ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر، خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، حتیٰ کہ مسجدِ نبوی میں منبرِ رسولؐ پر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین واخلاق کے

لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔ (خلافت وملوکیت ص:۱۷۴)

۱- میں نے اس پر سب سے پہلا اعتراض یہ کیا تھا کہ مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کی طرف یہ "مکروہ بدعت" غلط منسوب کی ہے کہ: "وہ خود خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے" اس کا ثبوت نہ مولانا مودودی کے دیئے ہوئے حوالوں میں موجود ہے، نہ تاریخ وحدیث کی کسی اور کتاب میں۔ ملک صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں:-

مجھے عثمانی صاحب کی شکایت اس حد تک تسلیم ہے کہ جن مقامات کے حوالے مولانا مودودی نے دیئے ہیں وہاں یہ بات صراحۃً مذکور نہیں کہ امیر معاویہؓ خود سبّ وشتم کرتے تھے۔

(ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۶۹ء ص:۲۴ و ۲۵)

لیکن اس کے بعد انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ بعض دُوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت معاویہؓ بھی اس فعل کا ارتکاب کرتے تھے، اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انہوں نے البدایہ والنہایہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ ہیں کہ:-

لما حج معاوية أخذ بيد سعد بن أبي وقاص وأدخله دار الندوة فأجلسه معه علىٰ سريره ثم ذكر علي بن أبي طالب فوقع فيه فقال: أدخلتني دارك وأجلستني علىٰ سريرك ثم وقعت في علي تشتمه .... الخ.

(خود ملک صاحب کے الفاظ میں اس روایت کا ترجمہ یہ ہے:-)

جب معاویہؓ نے حج کیا تو انہوں نے سعد بن ابی وقاصؓ کو ہاتھ سے پکڑا اور دار الندوۃ میں لے جا کر اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا، پھر علی بن ابی طالب کا ذکر کرتے ہوئے ان کی عیب جوئی کی، حضرت سعدؓ نے جواب دیا: "آپ نے مجھے اپنے گھر میں داخل کیا، اپنے تخت پر بٹھایا، پھر آپ نے علیؓ کے حق میں بدگوئی اور

سبّ وشتم شروع کردی۔

ملک صاحب کے بقول اس روایت کے ''شواہد ومتابعات'' مسلم اور ترمذی میں بھی موجود ہیں، مسلم کی ایک حدیث یہ ہے:-

عن عامر بن سعد بن أبی وقاص عن أبیه قال: أمر معاویة بن أبی سفیان سعدًا فقال: ما منعک أن تسبّ أبا تراب؟ فقال: اما ما ذکرت ثلاثًا قالهن رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فلن أسبّه.

(ملک صاحب کے الفاظ میں ترجمہ یہ ہے:-)

عامر بن سعد بن ابی وقاصؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ نے حضرت سعدؓ کو حکم دیا، پھر کہا کہ: آپ کو کس چیز نے روکا ہے کہ آپ ابوتراب (حضرت علیؓ) پر سبّ وشتم کریں؟ انہوں نے جواب دیا کہ: جب میں ان تین ارشادات کو یاد کرتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے متعلق فرمائے تھے تو ہرگز ان پر سبّ وشتم نہیں کرسکتا.....الخ۔

یہاں سب سے پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس روایت کے اس ترجمے کو دُرست مان لیا جائے جو جناب غلام علی صاحب نے کیا ہے، اور اس سے بعینہٖ وہ تأثر لیا جائے جو وہ لے رہے ہیں، تب بھی اس کی روشنی میں مولانا مودودی صاحب کے اس قول کی دلیل کیسے مل گئی کہ: ''حضرت معاویہؓ خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے''؟ ہر معقولیت پسند انسان یہ فرق محسوس کرسکتا ہے کہ نجی مجلسوں میں کسی شخص پر اعتراضات کرنا اور بات ہے اور ''جمعہ کے خطبوں میں برسرِ منبر سبّ وشتم کی بوچھاڑ'' بالکل دُوسری چیز، دعویٰ تو یہ کیا جارہا ہے کہ حضرت معاویہؓ جمعہ کے خطبوں میں سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، اور دلیل یہ دی جارہی ہے کہ ایک نجی مجلس میں ایک صحابی کے سامنے انہوں نے حضرت علیؓ پر کچھ

اعتراضات کئے، اس پر ملک صاحب لکھتے ہیں:-

ممکن ہے کہ عثمانی صاحب یہاں نکتہ اُٹھائیں کہ اس میں منبر کا ذکر نہیں ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ ایسا فعل جس کا دُوسروں کو اَمر کیا جائے اور جس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں بازپُرس کی جائے، کوئی معقول وجہ نہیں کہ اس کا ارتکاب علانیہ نہ ہو۔ پھر بالفرض اگر یہ فعل منبر پر کھڑے ہوکر نہیں، بلکہ سریر پر بیٹھ کر کیا جائے تو کیا قباحت میں کوئی کمی واقع ہوجاتی ہے؟ بلکہ ایک طرح سے پرائیوٹ مجلس میں سبّ وشتم اپنے ساتھ اغتیاب کو بھی جمع کرلیتا ہے۔

اس سوال کا جواب تو صرف ملک صاحب ہی کے پاس ہوگا کہ صرف پرائیوٹ مجلس ہی کی گفتگو ''اغتیاب'' کے ذیل میں کیوں آتی ہے؟ منبر پر سبّ وشتم کرنا اغتیاب کیوں نہیں؟ یہ بات فی الحال موضوع سے خارج ہے۔ بہرکیف! ان کے کہنے کا خلاصہ یہ ہوا کہ پرائیوٹ مجلس میں کسی کو بُرا بھلا کہنا منبر پر سبّ وشتم کرنے سے زیادہ بڑا گناہ ہے، کیونکہ اس میں بقول ان کے ''اغتیاب'' بھی شامل ہوجاتا ہے، لیکن شاید ملک صاحب یہ لکھتے وقت یہ بھول گئے کہ اس مسئلے میں مولانا مودودی صاحب کیا ارشاد فرماچکے ہیں، انہوں نے مذکورہ عبارت ہی میں لکھا ہے کہ:-

کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دِین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔

خط کشیدہ الفاظ انہوں نے اس جرم کی شناعت کو بڑھانے کے لئے ہی لکھے ہیں، اگر ملک صاحب کے قول کے مطابق خطبے میں گالی دینا پرائیوٹ مجلس میں بُرا کہنے سے اَھوَن ہے تو براہِ کرم وہ اس کی تشریح بھی فرمادیں کہ اس ''خاص طور پر'' کا کیا مطلب ہوا؟

واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا روایت کا مفہوم ملک صاحب نے صحیح طور سے بیان نہیں فرمایا، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں نقطۂ نظر کا جو شدید اختلاف تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، حضرت علیؓ حضرت معاویہؓ کو بغاوت کا مرتکب سمجھتے تھے اور اس کا اظہار بھی فرماتے تھے، دُوسری طرف حضرت معاویہؓ یہ سمجھتے تھے کہ حضرت علیؓ قاتلینِ عثمان سے قصاص لینے میں مداہنت برت رہے ہیں، اس لئے بر غلط ہیں۔ نقطۂ نظر کے اس شدید اختلاف کا اظہار دونوں کی نجی مجلسوں میں ہوتا رہتا تھا۔ حضرت معاویہؓ اپنے ذاتی خصائل و اوصاف اور فضائل و مناقب میں چونکہ حضرت علیؓ کے ہم پلہ نہیں تھے، اس لئے ہوسکتا ہے کہ ان نجی مجلسوں میں ان کے منہ سے کوئی ایک آدھ لفظ غیر محتاط بھی نکل جاتا ہو، لیکن اس رائی پر یہ پربت آخر عدل و انصاف کی کون سی منطق سے کھڑا کیا جاسکتا ہے کہ وہ ''علانیہ خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علیؓ پر سبّ و شتم کی بوچھاڑ'' کرتے تھے۔

اصل میں مذکورہ روایت کے اندر لفظ ''سبّ'' استعمال ہوا ہے، عربی زبان میں اس کا مفہوم بہت وسیع ہے، اُردو میں لفظ ''سبّ و شتم'' جس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے عربی زبان میں اس کا استعمال اس مفہوم میں نہیں ہوتا۔

اگر کوئی شخص کسی کی غلط رَوِش پر اعتراض کرے، اس کی کسی غلطی پر ٹوکے، اسے خطا کار ٹھہرائے، یا تھوڑا بہت بُرا بھلا کہہ دے تو اُردو میں اس کے لئے لفظ ''سبّ و شتم'' استعمال نہیں ہوتا، نہ اس پر ''گالی'' کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے، لیکن عربی زبان میں معمولی سے اعتراض یا تغلیط کو بھی لفظ ''سبّ'' سے تعبیر کردیتے ہیں، اور کلامِ عرب میں اس کی بہت سی نظیریں ملتی ہیں۔

صحیح مسلم ہی کی ایک حدیث میں ہے کہ تبوک کے سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رُفقاء کو یہ ہدایت فرمائی تھی کہ کل جب تم تبوک کے چشمے پر پہنچو تو تم میں سے کوئی شخص اس کے پانی کو میرے پہنچنے سے پہلے نہ چھوئے، اتفاق سے دو صاحبان قافلے سے آگے نکل کر چشمے پر پہلے پہنچ گئے اور انہوں نے پانی پی لیا، راوی کہتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو:-

فسبّهما النبی صلی الله علیه وسلم.[1]

ترجمہ:- ان دونوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ''سبّ'' فرمایا۔

کیا کوئی شخص یہاں روایت کا یہ ترجمہ کرسکتا ہے کہ (معاذ اللہ) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں گالیاں دیں؟ یا ان پر ''سب وشتم کی بوچھاڑ'' کردی؟ ظاہر ہے کہ نہیں! یہاں ''سبّ'' کا لفظ غلطی پر ٹوکنے، خطا کار ٹھہرانے یا غلطی پر سخت سست کہنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، ادھر میں نے اپنے پہلے مقالے میں صحیح بخاری کی ایک روایت پیش کر کے ثابت کیا تھا کہ ایک صاحب نے حضرت علیؓ کے لئے محض ''ابو تراب'' کا لفظ استعمال کرنے کو ''سبّ'' سے تعبیر فرمادیا تھا۔

ان حالات میں بلا خوفِ تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت سعدؓ کے ساتھ اپنی نجی مجلس میں بھی حضرت علیؓ پر جو ''سبّ'' کیا، یا کرنے کی ہدایت کی تو وہ اُردو والا ''سبّ وشتم'' نہیں تھا جسے مولانا مودودی صاحب نے بڑی آسانی کے ساتھ ''گالیاں دینے'' سے تعبیر فرمادیا ہے، بلکہ صحیح مسلم کی مذکورہ حدیث کی طرح یہاں بھی ''سبّ'' سے مراد حضرت علیؓ پر اعتراض کرنا اور ان کی (مزعومہ) غلطی سے اپنی براءت کا اظہار ہے، اس سے زائد کچھ نہیں، ورنہ یہ بات آخر کیونکر عقل میں آسکتی ہے کہ ایک طرف حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ کو اپنے سے افضل قرار دیتے ہیں (والله إنی لأعلم أنه خیر منّی وأفضل)،[2] ضرار صدائی سے کہتے ہیں کہ: ''میرے سامنے علیؓ کے اوصاف بیان کرو'' اور جب وہ حضرت علیؓ کی غیر معمولی تعریفیں کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ: ''اللہ ابوالحسن (علیؓ) پر رحم کرے، خدا کی قسم وہ ایسے ہی تھے'' (رحم الله أبا الحسن کان والله کذلک)،[3] اور جب حضرت علیؓ کی وفات کی خبر پہنچتی ہے تو اس پر شدید رنج وغم کا اظہار فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: ''ابنِ ابی طالبؓ

---

(۱) صحیح مسلم ج:۲ ص:۲۴۶، اصح المطابع کراچی، کتاب الفضائل، باب معجزات النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۲) البدایة والنهایة ج:۸ ص:۱۲۹۔

(۳) الاستیعاب تحت الاصابة ج:۳ ص:۴۳ و۴۴، المکتبة التجاریة الکبریٰ، القاهرة ۱۹۳۹ء۔

کی موت سے فقہ اور علم رُخصت ہو گئے" (ذهب الفقه والعلم بموت ابن أبی طالب)[1]، اور دُوسری طرف انہیں گالیاں دینے اور ان پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرنے کو جزوِ ایمان بھی سمجھتے ہیں؟ اگر حضرت سعدؓ کی مذکورہ روایت کو ان تمام روایات کے ساتھ ملاکر دیکھا جائے اور ساتھ میں حضرت معاویہؓ کے مقامِ صحابیت، ان کے علم و فضل، ان کی شرافت ونجابت اور ان کے حلم و تدبر کو سامنے رکھا جائے تو کسی بھی صاحبِ انصاف کو اس بات میں شک نہیں رہ سکتا کہ یہاں "سبّ" کا ترجمہ "گالی" سے کرنا ایسی ہی زیادتی ہے جیسے صحیح مسلم کی مذکورہ حدیث کا یہ ترجمہ کرنا کہ:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (معاذ اللہ) انہیں گالیاں دیں۔

میں نے اپنے مقالے میں نقل کیا تھا کہ حضرت معاویہؓ کے پاس جب حضرت علیؓ کی وفات کی خبر پہنچی تو وہ رونے لگے، اور اپنی اہلیہ سے حضرت علیؓ کی تعریف کی، اس واقعے پر جو تبصرہ ملک غلام علی صاحب نے فرمایا ہے، اس کا جواب دینا تو میرے بس سے باہر ہے، البتہ اسے محض عبرت کے لئے قارئین کے سامنے نقل کرنا چاہتا ہوں، فرماتے ہیں:-

مجھے اس رونے پر کسی شاعر کا یہ شعر بے اختیار یاد آ گیا ؎

آئے تربت پر مری، روئے، کیا یاد مجھے
خاک اُڑانے لگے جب کر چکے برباد مجھے

واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے رونے سے تو دراصل یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا ضمیر خود جانتا تھا کہ خلیفۂ وقت سے لڑ کر انہوں نے کس خطائے عظیم کا ارتکاب کیا تھا، اور ان کا دِل خوب جانتا تھا کہ بغاوت کے جرم سے قطع نظر علیؓ جیسے شخص کے مقابلے میں خود ان کا دعوائے خلافت کس قدر بے جا تھا۔

(ترجمان القرآن، جولائی ۱۹۶۹ء ص:۲۸)

یہاں تک ہماری گزارشات کا خلاصہ دو باتیں ہیں، ایک یہ کہ مولانا

---

(۱) البدایة والنهایة ج:۸ ص:۱۳۰۔

مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ پر جو یہ بے دلیل الزام عائد کیا ہے کہ وہ "خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے" اس کا ثبوت نہ صرف یہ کہ ان کے دیئے ہوئے حوالوں میں نہیں ہے، بلکہ جو روایت ملک صاحب نے پیش کی ہے، اس سے بھی یہ الزام ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ مولانا مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ جمعہ کے خطبوں میں برسرِ منبر اس حرکت کا ارتکاب کیا جاتا تھا، جس کا حاصل یہ ہے کہ سبِّ علیؓ کو جزوِ دین بنالیا گیا تھا، اسی لئے اس کو انہوں نے "بدعت" کے عنوان سے تعبیر کیا ہے، حالانکہ ملک صاحب نے جو روایت پیش کی ہے، اس کے پیشِ نظر یہ ایک نجی مجلس کا واقعہ تھا۔

دُوسرے یہ کہ اس نجی مجلس میں بھی جو "سبّ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس کا ترجمہ "گالی" سے کرنا دُرست نہیں، اس کا حاصل حضرت علیؓ کے طرزِ عمل پر اعتراض کرنا، ان کے موقف کو غلط ٹھہرانا، اور اس موقف سے اپنی براءت کا اظہار ہے، اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ صحیح مسلم کی حدیثِ مذکورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لفظِ "سبّ" منسوب کیا گیا ہے۔

۲- دُوسرا مسئلہ حضرت معاویہؓ کے گورنروں کا ہے، مولانا مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کے "تمام گورنر" بلا استثناء خطبوں میں سبِّ علیؓ کیا کرتے تھے، اس دعوے کی دلیل میں مولانا مودودی نے صرف دو روایتوں کا حوالہ دیا تھا، ایک سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کو باقاعدہ سبِّ علیؓ کی تاکید فرمائی تھی، اور دُوسری سے معلوم ہوتا ہے کہ مروان بن حکم اپنے خطبوں میں حضرت علیؓ پر سبّ کیا کرتا تھا۔

ان میں سے پہلی روایت کے بارے میں، میں نے تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ اس کے تمام راوی از اوّل تا آخر شیعہ ہی شیعہ ہیں، اور ان میں سے بعض کو علمائے رجال نے "کذاب" تک کہا ہے، اس لئے یہ روایت لائقِ اعتماد نہیں۔

ملک صاحب نے اس کے جواب میں "رُواۃِ تاریخ" کے عنوان سے لمبی چوری بحث کی ہے، لیکن اس میں سب وہی باتیں دُہرائی ہیں جو مولانا مودودی

صاحب نے ''خلافت وملوکیت'' کے ضمیمے میں لکھی ہیں۔ میرے مقالے کی ساتویں قسط ملک صاحب کی اس بحث کے بعد شائع ہوئی تھی، میں اس میں ان تمام دلائل پر مفصل گفتگو کر کے ان کا جواب دے چکا ہوں، ملک صاحب نے میری اس بحث کا کوئی جواب اَب تک نہیں دیا، اس لئے مجھے یہاں اس بحث کے اعادے کی ضرورت نہیں، جو حضرات چاہیں اس بحث کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

رہی دُوسری روایت، سو اس کے بارے میں، میں نے صحیح بخاری کی ایک حدیث سے ثابت کیا تھا کہ مروان بن حکم کا ''سبّ'' کیا تھا؟ ایک شخص نے حضرت سہلؓ سے آکر شکایت کی کہ مدینہ کا گورنر حضرت علیؓ پر ''سبّ'' کرتا ہے، حضرت سہلؓ نے پوچھا: ''کیا کہتا ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''حضرت علیؓ کو ابو تراب کہتا ہے'' حضرت سہلؓ نے جواب میں اسے بتایا کہ یہ لقب تو حضرت علیؓ کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت میں دیا تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ مروان کے سبّ وشتم کی حقیقت بس اتنی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو محبت میں اس نام سے پکارتے تھے، مروان زیادہ سے زیادہ اسے اس کے حقیقی معنوی میں استعمال کرتا ہوگا، اس کے جواب میں ملک صاحب لکھتے ہیں:-

> اِمام بخاریؒ نے حدیث کا صرف وہ حصہ روایت کیا ہے جس سے حضرت علیؓ کی منقبت ثابت ہوتی ہے۔

غالباً ملک صاحب کا منشاء یہ ہے کہ یہاں مروان کی کچھ اور گالیاں بھی مذکور ہوں گی جنھیں اِمام بخاریؒ چھوڑ گئے۔ میری گزارش یہ ہے کہ روایت کا جو حصہ اِمام بخاریؒ چھوڑ گئے ہیں، اگر جناب غلام علی صاحب کسی معتبر روایت سے وہ حصہ نقل کر کے دِکھا دیتے، اور اس میں واقعتاً حضرت علیؓ کو گالیاں دی گئی ہوتیں، تب تو ان کا یہ کہنا بجا ہوسکتا تھا، لیکن وہ باقی ماندہ حصہ پیش بھی نہیں کرتے تو محض ان کے قیاس بلکہ واہمے کی بنیاد پر یہ کیسے کہہ دیا جائے کہ اس روایت کا کچھ حصہ اِمام بخاریؒ چھوڑ گئے ہیں؟ اس طرح تو ہر باطل سے باطل مسلک کی دلیل یہ لائی جاسکتی ہے کہ بخاری کی فلاں حدیث اِمام بخاریؒ نے مختصر نقل کی ہے، اس کے باقی ماندہ حصے سے فلاں

بات ثابت ہوتی ہے۔ ملک صاحب علمی و تحقیقی مباحث میں کم از کم ایسی باتوں سے تو پرہیز فرمائیں۔ آگے تحریر فرماتے ہیں:۔

> عثمانی صاحب کا یہ خیال غلط ہے کہ مروان، ابوتراب سے بس ''مٹی کا باپ'' مراد لیتا تھا، عربی میں ''ابو'' کا لفظ بطور مضاف صرف باپ کے معنی میں نہیں آتا ''والے'' کے معنی میں بھی آتا ہے ..... مروان طنزاً اس لفظ کو خاک آلود کے معنی میں استعمال کرتا تھا۔

میری گزارش یہ ہے کہ ''ابوتراب'' کا لفظی ترجمہ آپ ''مٹی کا باپ'' کر لیجئے یا ''مٹی والا'' بہرحال یہ پیار بھرا لقب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو دیا تھا، کوئی شخص کسی بُری نیت سے یہ لفظ حضرت علیؓ کے لئے استعمال کرے تو یہ اس کی احمقانہ تعریض ہے، نیت کے لحاظ سے اس کا یہ فعل لائقِ ملامت ضرور ہے لیکن اس لفظ کو انصاف کے کسی بھی قاعدے سے ''سبّ وشتم کی بوچھاڑ'' یا ''گالی'' نہیں کہا جاسکتا۔ میں لکھ چکا ہوں کہ حضرت علیؓ کے ایک فوجی افسر حضرت جاریہ بن قدامہؓ نے ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ کو ''ابوسنور'' (بلی والا یا بلی کا باپ) کے نام سے یاد کیا تھا، اگر لفظ ''ابوتراب'' کو سبّ وشتم کی بوچھاڑ کہا جاسکتا ہے تو معلوم نہیں جناب غلام علی صاحب ''ابوسنور'' کو کیا فرمائیں گے؟

یہ تو وہ دو روایتیں تھیں جن کا حوالہ مولانا مودودی صاحب نے دیا ہے، (۱) ملک غلام علی صاحب نے اپنے مقالے میں تین روایتیں اور پیش کی ہیں، پہلے مسند احمد سے حضرت اُمِّ سلمہؓ کی ایک روایت پیش کی ہے کہ انہوں نے بعض اصحاب سے فرمایا: ''کیا تمہارے یہاں منبروں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سبّ ہوتا ہے؟'' لوگوں نے پوچھا: ''وہ کیسے؟'' حضرت اُمِّ سلمہؓ نے فرمایا: ''أليس يسبّ علي ومن أحبّه؟'' (کیا علیؓ اور ان سے محبت کرنے والوں پر سبّ نہیں ہوتا؟)۔

---

(۱) یہاں پُرانے ایڈیشن میں ایک حاشیہ تھا جس سے رُجوع کا اعلان ''البلاغ'' جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ میں کردیا گیا تھا، مگر وہ کچھ عرصہ چھپتا رہا، اب اسے یہاں سے نکال دیا گیا ہے۔ محمد تقی عثمانی ۷/۶/۱۴۲۲ھ

دُوسرے ابوداؤدؒ اور مسند احمدؒ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے سامنے کسی شخص نے حضرت علیؓ پر لگاتار ''سبّ'' شروع کیا تو حضرت سعید بن زیدؓ نے حضرت مغیرہؓ کو تنبیہ فرمائی کہ تمہارے سامنے یہ ''سبّ'' ہو رہا ہے اور تم اس پر کوئی نکیر نہیں کرتے؟

تیسرے ابنِ جریر طبریؒ کی ایک روایت پیش کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ صلح کرتے وقت من جملہ اور شرائط کے یہ شرط بھی رکھی تھی کہ: ''ان کے سنتے ہوئے حضرت علیؓ پر سبّ نہ کیا جائے''۔

یہ ہیں وہ تین روایتیں جن کی بنیاد پر انہوں نے سبِّ علیؓ کے بارے میں لکھا ہے کہ: ''یہ بات جس طرح تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے وہ اسے قطعیت اور تواتر کا درجہ دے رہی ہے۔''

مذکورہ بالا روایات کا تحقیقی جواب دینے سے قبل میں یہاں کچھ اور روایات پیش کرتا ہوں، ملک صاحب براہِ کرم ان کا بغور مطالعہ فرمائیں۔

الف:- ابنِ حبیبؒ (متوفی ۲۴۵ھ) مشہور مؤرّخ ہیں، وہ نقل کرتے ہیں:-

فلما قدم الكوفة على رضى الله عنه جعل أصحابه يتناولون عثمان فقال بنو الأرقم: لا نقيم بلد يشتم فيه عثمان، فخرجوا إلى الجزيرة فنزلوا الرها، وشهدوا مع معاوية الصفين.[1]

ترجمہ:- جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ میں آئے تو ان کے ساتھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بدگوئی کرنے لگے، بنو الارقم نے کہا کہ: ہم اس شہر میں نہیں رہ سکتے جس میں حضرت عثمانؓ پر سبّ وشتم کیا جاتا ہو، چنانچہ وہ جزیرہ کی طرف چلے گئے اور رہا کے مقام پر مقیم ہوئے اور حضرت معاویہؓ کے ساتھ جنگِ صفّین میں شریک ہوئے۔

---

(۱) ابن حبیبؒ: المحبّر ص: ۲۹۵، دائرۃ المعارف ۱۳۶۱ھ۔

ب:- ابنِ جریر طبریؒ نقل کرتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کے بھیجے ہوئے ایک وفد سے خطاب کرتے ہوئے حضرت علیؓ نے فرمایا:-

معاوية الذی لم يجعل الله عز و جل له سابقة فی الدين ولا سلف صدق فی الإسلام طليق بن طليق حزب من هٰذه الأحزاب لم يزل الله عز و جل ولرسوله صلی الله عليه وسلم وللمسلمين عدوا هو وأبوه حتّٰی دخلا فی الإسلام كارهين.

ترجمہ:- معاویہ وہ ہیں جن کے لئے اللہ نے نہ دِین میں کوئی فضیلت رکھی ہے، نہ اسلام میں ان کا کوئی اچھا کارنامہ ہے، خود بھی طلیق ہیں اور ان کے باپ بھی طلیق، ان احزاب میں سے ہیں (جو مدینہ پر چڑھ کر آئے تھے) اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمیشہ دُشمن رہے، وہ بھی اور ان کے باپ بھی یہاں تک کہ اسلام میں بادلِ ناخواستہ داخل ہوئے۔

اسی روایت میں آگے ہے کہ وفد کے لوگوں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ: ''کیا آپ گواہی دیتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مظلوماً قتل ہوئے؟'' تو آپؓ نے فرمایا کہ: ''لا أقول إنه قتل مظلومًا ولا إنه قتل ظالمًا'' (نہ میں یہ کہتا ہوں کہ وہ ظالم بن کر قتل ہوئے اور نہ یہ کہتا ہوں کہ مظلوم بن کر قتل ہوئے) اس پر وفد یہ کہہ کر چلا آیا کہ: ''جو حضرت عثمانؓ کے قتل کو مظلوماً نہیں سمجھتا، ہم اس سے بَری ہیں''۔[1]

ج:- ابنِ جریرؒ ہی نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے صفّین میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:-

فإن معاوية وعمرو بن العاص وابن أبی معيط وحبيب بن مسلمة وابن أبی سرح والضحاک بن قيس ليسوا بأصحاب دين ولا قرآن أنا أعرف بهم منكم قد

(۱) الطبری ج:۴ ص:۴ و ۵۔

صحبتهم أطفالا وصحبتهم رجالا فكانوا أشر أطفال وأشر رجال.[1]

ترجمہ:- معاویہ، عمرو بن عاص، ابنِ معیط، حبیب بن مسلمہ، ابنِ سرح اور ضحاک بن قیس، دِین اور قرآن سے تعلق رکھنے والے نہیں ہیں، میں انہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں، میں ان کے ساتھ اس وقت بھی رہا ہوں جب یہ بچے تھے اور اس وقت بھی رہا ہوں جب یہ مرد تھے، یہ بچے تو بدترین بچے اور مرد تھے تو بدترین مرد۔

د:- حجر بن عدیؒ حضرت علیؓ کے معروف ساتھیوں میں سے تھے، ان کے اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں حافظ ابنِ کثیرؒ لکھتے ہیں:-

إنهم كانوا ينالون من عثمان ويطلقون فيه مقالة الجور وينتقدمون على الأمراء .... الخ.[2]

ترجمہ:- یہ لوگ حضرت عثمانؓ کی بدگوئی کرتے اور ان کے بارے میں ظالمانہ باتیں کہتے تھے۔

ہ:- بعض مؤرخین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے عین صلح کی گفتگو کے دوران بھی حضرت معاویہؓ کے لئے سخت توہین آمیز الفاظ استعمال کئے اور ان کے ایمان تک کو مشکوک بتایا، البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۲۵۸ میں مؤرخین کے یہ اقوال نقل کرکے حافظ ابنِ کثیرؒ نے ان کی تردید کی ہے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم تو ان جیسی بیشتر روایتوں کو ان کی سند کے ضعف اور راویوں کے ناقابلِ اعتماد ہونے کی بناء پر صحیح نہیں سمجھتے اور ان میں سے بعض کو قطعی جھوٹ اور افتراء سمجھتے ہیں، لیکن مولانا مودودی صاحب اور ملک غلام علی صاحب جو تاریخی روایات کو بے چون و چرا مان لینے کے قائل ہیں، براہِ کرم "اسماء

---

(۱) الطبری ج:۴ ص:۲۴۔

(۲) البدایة والنهایة ج:۸ ص:۵۴۔

الرجال کے دفتر'' کھولے بغیر یہ بتائیں کہ اگر ان روایات کی بناء پر کوئی شخص یہ عبارت لکھے کہ:-

> ایک مکروہ بدعت حضرت علیؓ کے زمانے میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے ساتھ خطبوں میں برسرِ منبر حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ پر سبّ و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، اور ان کے محبت رکھنے والے دوست اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔

اور پھر کوئی شخص مذکورہ چار روایات کو نقل کر کے اس جملے کی تائید میں یہ لکھ دے کہ: ''یہ بات جس طرح تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے وہ اسے قطعیت اور تواتر کا درجہ دے رہی ہے'' تو مولانا مودودی صاحب اور محترم ملک غلام علی صاحب کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا؟ کیا وہ ان واقعات کو ''قانون کی بالاتری کا خاتمہ'' قرار دے کر ملوکیت کا آغاز (معاذ اللہ) حضرت علیؓ سے کر سکیں گے؟

ملک صاحب سے اس تمہیدی سوال کے بعد اصل موضوع کی طرف رُجوع کرتا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان نقطۂ نظر کا شدید اختلاف تھا جو بالآخر باہمی جنگ پر منتج ہوا، لیکن ان کا یہ باہمی اختلاف کبھی شرافت کی حدود سے متجاوز نہیں ہوا، جو روایتیں اس کے بظاہر خلاف نظر آتی ہیں، خواہ ان میں حضرت علیؓ کا حضرت معاویہؓ اور حضرت عثمانؓ پر سبّ و شتم کرنا مذکور ہو یا حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کا حضرت علیؓ پر، ان میں سے اکثر تو فتنہ پرداز قسم کے سبائیوں کی گھڑی ہوئی ہیں، اور جو دو ایک روایتیں صحیح سند کے ساتھ آئی ہیں، ان میں لفظِ ''سبّ'' سے مراد بلاشبہ ایک دُوسرے کے موقّف کو غلط قرار دینے اور اس سے اپنی براءت کا اظہار ہے۔

جن روایتوں سے خود حضرت معاویہؓ کا حضرت علیؓ پر سبّ کرنا یا اس کا حکم دینا معلوم ہوتا ہے، ان کی حقیقت تو ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں، رہیں یہ تین روایتیں تو ان سے خود حضرت معاویہؓ کا سبّ کرنا تو ظاہر ہے کہ ثابت نہیں ہوتا، ان

کے بعض ساتھیوں کا سبّ کرنا معوم ہوتا ہے۔ لیکن جس ماحول میں ''ابوتراب'' کہنے کو بھی ''سبّ'' سے تعبیر کردیا جاتا ہو، وہاں ہر شخص یہ اندازہ لگاسکتا ہے کہ اس سے مراد ''گالی دینا'' نہیں، بلکہ تغلیط وتعریض ہے، یہ ممکن ہے کہ تغلیط وتعریض میں بعض لوگ کسی وقت حدود سے کسی قدر متجاوز بھی ہوگئے ہوں، لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جاسکتا کہ حضرت معاویہؓ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر جمعہ کے خطبوں میں حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کیا کرتے تھے۔

حیرت ہے کہ مولانا مودودی اور غلام علی صاحب ایک طرف تو صرف لفظ ''ابوتراب'' کو ''سبّ وشتم کی بوچھاڑ'' کہنے پر مصر ہیں، دُوسری طرف وہ خود حضرت معاویہؓ کو بغاوت کا مجرم قرار دیتے ہیں، ان کی طرف انسانی شرافت کے یکسر خلاف حرکات منسوب کرتے ہیں، انہیں مالِ غنیمت میں خیانت کا مرتکب بتاتے ہیں، انہیں ظالم و جابر ثابت کرتے ہیں، ان کے باوجود یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ پر ''سبّ وشتم کی بوچھاڑ'' کی ہے۔ ملک صاحب نے اپنے مضمون میں ماضی قریب کے بعض مصنّفین کی عبارتیں بھی پیش کی ہیں کہ انہوں نے وہی باتیں لکھی ہیں جو مولانا مودودی صاحب نے لکھی ہیں۔ لیکن اوّل تو ان کے اور مولانا مودودی صاحب کے اندازِ بیان میں عموماً خاصا فرق ہے، دُوسرے ظاہر ہے کہ یہ بات کسی غلطی کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتی کہ وہ ماضی قریب کے بعض دُوسرے مصنّفین سے بھی سرزد ہوئی ہے۔ اس لئے اس پر گفتگو لاحاصل ہے۔[1]

## استلحاقِ زیاد

اس مسئلے میں مولانا مودودی صاحب کی زیرِ بحث عبارت یہ ہے:-

زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ کے ان افعال میں

---

(۱) اس ضمن میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی زبانی حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کا جو واقعہ ملک صاحب نے ''حکایات الاولیاء'' سے نقل کیا ہے، اس میں حضرت شاہ شہیدؒ نے شیعہ حضرات کو الزامی جواب دیا ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت شاہ شہیدؒ کا نظریہ یہی تھا۔

سے ہے جس میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مُسلّم قاعدے کی خلاف ورزی کی تھی۔ زیاد طائف کی ایک لونڈی سمیہ نامی کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا، لوگوں کا بیان تھا کہ زمانۂ جاہلی میں حضرت معاویہؓ کے والد جناب ابوسفیانؓ نے اس لونڈی سے زنا کا ارتکاب کیا اور اس سے وہ حاملہ ہوئی۔ حضرت ابوسفیانؓ نے خود بھی ایک مرتبہ اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ زیاد انہی کے نطفے سے ہے۔ حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں وہ آپ کا زبردست حامی تھا اور اس نے بڑی اہم خدمات انجام دی تھیں، ان کے بعد حضرت امیر معاویہؓ نے اس کو اپنا حامی اور مددگار بنانے کے لئے اپنے والد ماجد کی زناکاری پر شہادتیں لیں اور اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ زیاد انہیں کا ولد الحرام ہے۔ پھر اسی بنیاد پر اسے اپنا بھائی اور خاندان کا فرد قرار دے دیا۔ یہ فعل اخلاقی حیثیت سے جیسا کچھ مکروہ ہے وہ تو ظاہر ہی ہے۔ مگر قانونی حیثیت سے بھی یہ ایک صریح اور ناجائز فعل تھا کیونکہ شریعت میں کوئی نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف حکم موجود ہے کہ: ''بچہ اس کا ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا، اور زانی کے لئے کنکر پتھر ہیں'' اُمّ المؤمنین حضرت اُمِّ حبیبہؓ نے اسی وجہ سے اس کو اپنا بھائی تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور اس سے پردہ فرمایا۔

میں نے ابنِ خلدون وغیرہ کے حوالے سے یہ ثابت کیا تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں سمیہ کے ساتھ حضرت ابوسفیانؓ کے جس تعلق کو مولانا مودودی صاحب نے ''زنا'' کا عنوان دیا ہے، وہ درحقیقت جاہلی نوعیت کا ایک نکاح تھا، اور اس نوعیت کا نکاح اگرچہ اسلام کے بعد منسوخ ہوگیا، لیکن اس قسم کے نکاح سے جو اولاد جاہلیت میں پیدا ہوئی اسے ثابت النسب کہا گیا، وہ اولاد حرام نہیں ہوئی۔ زیاد کا معاملہ بھی یہی تھا کہ

حضرت ابوسفیانؓ نے اسلام سے پہلے خفیہ طور پر یہ اقرار کرلیا تھا کہ زیاد انہی کا بیٹا ہے، اس لئے اس کا نسب ثابت ہو چکا تھا، حضرت معاویہؓ نے دس گواہوں کے گواہی دینے پر (جن میں بیعتِ رضوان کے شریک صحابہؓ بھی شامل تھے) اس واقعے کا صرف اعلان کیا اور زیاد کو اپنا سوتیلا بھائی تسلیم کرلیا۔

جناب ملک غلام علی صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

ظاہر ہے کہ نسب و انتساب کی یہ صورتیں جو جاہلیت میں رائج تھیں وہ اس وقت تک متحقق اور مُسلّم شمار نہیں ہوسکتی تھیں جب تک سوسائٹی میں ان کا اعلانِ عام نہ ہوجائے اور مرد صلبی اولاد کی طرح بچے کو اپنے کنبے میں داخل نہ کرلے۔

ملک صاحب نے اپنے مضمون میں اسی بات پر زور دیا ہے کہ اگر زیاد زنا کے بجائے جاہلی نکاح سے پیدا ہوا تھا تو انتساب کا اعلانِ عام ضروری تھا اور خفیہ طور پر استلحاق کا اقرار ثبوتِ نسب کے لئے کافی نہیں تھا۔ لیکن اوّل تو غلام علی صاحب نے اس بات کی کوئی دلیل نہیں دی کہ جاہلیت کے اس انتساب میں اعلانِ عام ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتا تھا، جاہلیت کے نکاحوں کی جو تفصیل حضرت عائشہ صدیقہؓ سے صحیح بخاری میں مروی ہے، اس میں اس شرط کا کوئی بھی ذکر نہیں ہے، بلکہ جاہلی نکاح کے جو اور طریقے اسلام سے پہلے رائج تھے، ان پر نظر کی جائے تو صراحۃً یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ایسے انتساب کے لئے اعلانِ عام ہرگز ضروری نہیں تھا، بلکہ اگر معاملہ بالکل خفیہ رہے تب بھی انتساب ہوجاتا تھا، علامہ داؤدیؒ تحریر فرماتے ہیں:-

بقی علیها أنحاء لم تذکرها، الأوّل نکاح الخدن وهو فی قوله تعالٰی ولا متخذات أخدان کانوا یقولون ما استتر فلا بأس به وما ظهر فهو لوم۔[1]

ترجمہ:- جاہلی نکاح کی کچھ قسمیں ایسی بھی ہیں جو حضرت عائشہؓ نے بیان نہیں فرمائیں، ان میں سے پہلی قسم خفیہ آشنائی کا نکاح

---

(۱) دیکھئے: فتح الباری ج:۹ ص:۱۵۰، و عمدۃ القاری ج:۲۰ ص:۱۲۳۔

ہے، اور اس کا ذکر قرآنِ کریم کے ارشاد: "وَلا مُتَّخِذَاتِ أَخْدَان"
میں موجود ہے، جاہلیت کے لوگ کہا کرتے تھے کہ ایسا تعلق اگر
خفیہ طور پر ہو تو اس میں کچھ حرج نہیں، اور علی الاعلان ہو تو وہ
قابلِ ملامت بات ہے۔

اس سے صاف واضح ہے کہ جاہلی نکاح میں خفیہ تعلق یا خفیہ انتساب قابلِ ملامت نہیں تھا، لہٰذا ملک غلام علی صاحب کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ: ''نسب و انتساب کی یہ صورتیں اس وقت تک مُسلَّم نہیں ہوسکتی تھیں جب تک سوسائٹی میں ان کا اعلانِ عام نہ ہوجائے۔''

پھر اگر خفیہ استلحاق جاہلیت میں قابلِ قبول نہیں تھا تب بھی حضرت ابوسفیانؓ نے کم از کم دس آدمیوں کی موجودگی میں نسب کا اقرار کیا تھا۔ مؤرّخ مدائنی نے ان دس گواہوں کے نام شمار کرائے ہیں اور حافظ ابنِ حجرؒ نے انہیں نقل کیا ہے۔[1] اس لئے قانونی طور پر اس اقرار کو خفیہ نہیں کہا جاسکتا، ابنِ خلدون نے اس کے لئے "خفیۃً" کا جو لفظ استعمال کیا ہے، اس کا مطلب اس سے زائد نہیں کہ عام لوگوں میں یہ اقرار مشہور و معروف نہیں ہوا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ زیاد کا استلحاق اگر ایسا ہی بے بنیاد اور شریعت کے مُسلَّمہ قاعدوں کی صریح خلاف ورزی پر مبنی ہوتا جیسا کہ مولانا مودودی صاحب یا بعض دُوسرے حضرات نے سمجھا ہے تو پھر ساتھ ہی یہ تسلیم کرلینا چاہئے کہ اُمتِ اسلامیہ اپنے خیرالقرون میں حق کے محافظوں سے یکسر خالی ہوگئی تھی، ورنہ کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ اتنی بڑی دھاندلی کا ارتکاب ایک ایسے دور میں کیا جائے جس میں چپے چپے پر نزولِ وحی کا مشاہدہ کرنے والے صحابہؓ موجود ہوں، بیعتِ رضوان کے شریک صحابہؓ خود اس صریح دھاندلی کے حق میں گواہی دیں، اور اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس دھاندلی کے حق میں خود مہرِ تصدیق ثبت کریں؟

ملک غلام علی صاحب نے لکھا ہے:-

---

(۱) دیکھئے: الاصابۃ ج:۱ ص:۵۶۳، المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ، زیاد بن ابیہ۔

> اُمّ المؤمنین نے سوچا ہوگا کہ بے چاروں کی حاجت روائی ہو،
> اس لئے ابنِ ابی سفیان لکھ دیا۔

تصوّر تو فرمایئے! کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟ مطلب یہ ہے کہ اُمّ المؤمنین رضی اللہ عنہا نے محض چند ''بیچاروں کی حاجت روائی'' کی خاطر قرآن وسنت سے اس صریح بغاوت کو گوارا کرلیا۔ خدارا! غور فرمائیں کہ کیا معاذ اللہ ایک ولد الزنا کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا برادرِ نسبتی قرار دینے کی بے غیرتی ان سے کسی بھی قیمت پر سرزد ہوسکتی تھی؟ حیرت ہے کہ جناب ملک غلام علی صاحب کو یہ گوارا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایسا گمان کیا جائے، لیکن مولانا مودودی صاحب کی غلطی تسلیم کرنا کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے۔

میں نے اپنے مضمون میں ثابت کیا تھا کہ جن معترضین نے اس وقت استلحاقِ زیاد پر نکتہ چینی کی تھی ان کی وجۂ اعتراض بالکل دُوسری تھی، ان کا کہنا یہ تھا کہ ابوسفیان رضی اللہ عنہ کبھی سمیہ کے قریب تک نہیں گئے، لیکن جب معاملہ دس گواہوں سے ثابت ہوگیا تو انہوں نے اپنے اعتراض سے رُجوع کرلیا اور اپنے رویے پر ندامت کا اظہار کرکے حضرتِ معاویہؓ سے معافی بھی مانگی۔ ملک صاحب اس کے جواب میں صرف اتنا لکھتے ہیں:-

> اس کا جواب یہ ہے کہ یہ فیصلہ خواہ صحیح تھا یا غلط، بہرحال اسے مملکت میں نافذ کردیا گیا جیسا کہ دیت اور توریث کے فیصلے نافذ کئے گئے تھے۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہ فیصلہ غلط طور پر نافذ کیا گیا تھا تو معترضین نے اپنے سابقہ رویے پر شرمندگی کا اظہار کیوں کیا؟ حاکم کے کسی فیصلے کو زبردستی نافذ کرادینا اور بات ہوتی ہے اور اسے صحیح تسلیم کرلینا بالکل دُوسری چیز، یہاں معترضین نے صرف یہی نہیں کہ اس فیصلے کے نفاذ میں مزاحمت نہیں کی، بلکہ صراحۃً اقرار کیا کہ ان کا سابقہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی تھا اور اب وہ اس پر ندامت محسوس کرتے ہیں۔

ملک صاحب کا یہ خیال بھی دُرست نہیں ہے کہ بعد میں تاریخ اور انساب کی

کتابیں زیاد کو ''زیاد بن ابیہ'' اور ''زیاد بن عبید'' ہی لکھتی چلی آئی ہیں۔ علمِ انساب کے سب سے مشہور عالم اور مؤرّخ علامہ بلاذریؒ دُوسری صدی ہجری میں گزرے ہیں، انہوں نے اپنی معروف کتاب ''الانساب الاشراف'' میں زیاد کا ترجمہ ''زیاد بن ابی سفیان'' ہی کے عنوان سے کیا ہے۔

ملک غلام علی صاحب نے اس قضیہ سے بھی استدلال کرنے کی کوشش کی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضرت سعدؓ اور حضرت عبد بن زمعہؓ کے درمیان پیش آیا تھا، لیکن یہ استدلال اس لئے دُرست نہیں کہ اس واقعے میں باندی کے بچے کے دعوے دار دو تھے، ایک باندی کے آقا کی طرف سے اس کے بھائی (حضرت عبد بن زمعہؓ) اور دُوسرے عتبہ کی طرف سے اس کے بھائی (حضرت سعدؓ)، گویا ایک طرف خود صاحبِ فراش بچے کا مدعی تھا اور دُوسری طرف غیر صاحبِ فراش، اس صورت کا حکم کھلا ہوا تھا کہ بچہ اس کو ملے گا جو فراش کا مالک ہو، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بچہ صاحبِ فراش کو دیا اور حضرت سعدؓ کا دعویٰ مسترد کردیا۔

اس کے برخلاف زیاد کے معاملے میں ابوسفیانؓ کے سوا کسی اور کا اقرار یا دعویٔ نسب ثابت نہیں، اس لئے اس کی نوعیت بالکل بدل جاتی ہے، اگر صورتِ واقعہ یہ ہوتی کہ ایک طرف عبید (جس کے فراش پر زیاد پیدا ہوا تھا) زیاد کو اپنی طرف منسوب کرنے کا دعویٰ کرتا، اور دُوسری طرف ابوسفیانؓ اسے اپنی طرف منسوب کرنا چاہتے تو بلاشبہ یہ معاملہ حضرت سعدؓ کے قضیہ کے مشابہ ہوجاتا، اور اس صورت میں شرعاً زیاد کا نسب عبید سے ثابت ہوتا نہ کہ ابوسفیانؓ سے، لیکن جب خود عبید اس معاملے میں خاموش ہے اور زیاد کے انتساب کا دعویٰ نہیں کرتا تو اَب دعویٰ صرف ابوسفیانؓ کا ہے، اور چونکہ یہ دعویٰ اسلام سے قبل ہوچکا تھا، اس لئے وہ قابلِ قبول ہے، اور اسے حضرت سعدؓ کے دعوے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

ملک صاحب نے اس موضوع پر جو بحث کی ہے وہ بہت منتشر اور غیر مرتب ہے لیکن اس کے بنیادی نکات کا جواب میں نے اُوپر دے دیا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس بحث میں اصل فیصلہ کن باتیں وہی ہیں جو اُوپر آچکیں، اور اگر یہ نکات ذہن میں

رہیں تو ملک صاحب کی علمی بحث کا جواب ہو جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ ماضی قریب کے فلاں فلاں مصنّفین نے بھی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے اس فعل پر اعتراض کیا ہے، تو اصل واقعے کے سامنے آنے کے بعد یہ کوئی علمی دلیل نہیں رہتی۔ اصل حقیقت کی دیانت دارانہ تحقیق کے بعد ہمیں اس پر شرحِ صدر ہے کہ جس جس نے اس معاملے میں حضرت معاویہؓ کو مطعون کیا ہے، اس نے غلطی کی ہے، خواہ مولانا مودودی ہوں یا مولانا ابوالکلام آزاد یا کوئی اور۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر ایک غلط بات مولانا مودودی صاحب کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد، قاضی زین العابدین میرٹھی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے بھی لکھ دی ہو، تو وہ صحیح کیونکر ہو سکتی ہے؟

غلام علی صاحب نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک عبارت ''تحفہ اثنا عشریہ'' سے نقل کی اور چیلنج کے انداز میں ارشاد فرمایا ہے کہ: ''مدیر البلاغ مولانا مودودی اور شاہ عبدالعزیزؒ کی تحریر آمنے سامنے رکھ کر ذرا مجھے بتائیں کہ مولانا مودودی نے وہ کیا خاص بات لکھی ہے اور ان کے بقول اس معاملے میں عام معترضین سے زیادہ سخت اور افسوسناک اور مکروہ اُسلوبِ بیان اختیار کیا ہے۔'' مولانا مودودی صاحب کی عبارت، میں بحث کے شروع میں نقل کر چکا ہوں، قارئین اس کا مقابلہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے مندرجہ ذیل جملوں سے کر لیں جو انہوں نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں لکھے ہیں:-

> اس وقت معاویہؓ نے ابوسفیانؓ کے اسی کلمے سے تمسک کیا جو ان کی زبان سے عمرو بن عاص اور حضرت امیرؓ کے رُوبرو نکلا تھا اور اس کو اپنا بھائی قرار دیا اور ۴۴ھ میں زیاد بن ابی سفیان اس کا لقب تحریر کیا۔ تمام مملکت میں اعلان کرا دیا کہ اس کو زیاد بن ابی سفیان کہا کریں۔

یہ دُرست ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو دُرست نہیں سمجھتے، اور اس معاملے میں ہمیں ان سے اختلاف ہے، انہوں نے زیاد کے حق میں بہت سخت الفاظ استعمال کئے ہیں، لیکن کیا مذکورہ عبارت میں کوئی ایک لفظ

بھی ایسا ہے جسے حضرت معاویہؓ کے لئے اہانت آمیز کہا جا سکے؟ اس کے بعد مولانا مودودی صاحب کی عبارت پھر پڑھ لیجئے اور دیکھئے کہ اس میں بقول ملک صاحب کے کوئی ''خاص بات'' ہے یا نہیں...؟

## ابنِ غیلان کا واقعہ

مولانا مودودی صاحب نے لکھا ہے:-

> حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور ان کی زیادتیوں پر شرعی اَحکام کے مطابق کارروائی کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا گورنر عبداللہ بن عمرو بن غیلان ایک مرتبہ بصرے میں منبر پر خطبہ دے رہا تھا، ایک شخص نے دورانِ خطبہ اس کو کنکر مار دیا، اس پر عبداللہ نے اس شخص کو گرفتار کروا دیا اور اس کا ہاتھ کٹوا دیا۔ حالانکہ شرعی قانون کی رُو سے یہ ایسا جرم نہ تھا جس پر ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ حضرت معاویہؓ کے پاس استغاثہ گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں ہاتھ کی دیت تو بیت المال سے ادا کر دوں گا مگر میرے عُمّال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں۔

میں نے اس واقعے کے اصل مآخذ (البدایہ والنہایہ) کے حوالے سے ثابت کیا تھا کہ اس واقعے میں جس شخص کا ہاتھ کاٹا گیا تھا، خود اس کے رشتہ داروں نے ابنِ غیلان سے یہ تحریر لکھوائی تھی کہ حاکم نے اس کا شبہ میں ہاتھ کاٹا ہے، چنانچہ حضرت معاویہؓ کے سامنے مقدمے کی جو صورت خود استغاثہ کرنے والوں نے پیش کی اور جس کا اقرار خود مدعا علیہ حاکم نے بھی تحریری طور پر کیا، وہ یہ تھی کہ ابنِ غیلان نے ایک شخص کا ہاتھ شبہ میں کاٹ دیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ شبہ میں ہاتھ کاٹ دینا بلاشبہ حاکم کی سنگین غلطی ہے، لیکن اس غلطی کی بناء پر کسی کے نزدیک بھی یہ حکم نہیں ہے کہ اس حاکم سے قصاص لینے کے لئے اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے، بلکہ اس غلطی کی سزا میں اس پر تعزیر بھی جاری کی جا سکتی ہے اور اسے معزول بھی کیا جا سکتا ہے۔ مذکورہ

واقعے میں حضرت معاویہؓ نے اس شخص کی دیت بھی ادا کی اور حاکم کو معزول بھی کر دیا۔

میرے استدلال کے جواب میں ملک غلام علی صاحب نے جو بحث کی ہے، وہ خلطِ مبحث کا افسوس ناک نمونہ ہے۔ انہوں نے تین چار صفحات میں تو خلفائے راشدینؓ کے عدل و انصاف کے متفرق واقعات ذکر کئے ہیں، ظاہر ہے کہ حضراتِ خلفائے راشدینؓ کے فیصلوں کے بلند معیار سے کون انکار کرسکتا ہے؟ یہ دعویٰ بھی کبھی ہم نے نہیں کیا کہ حضرت معاویہؓ کے فیصلے خلفائے راشدینؓ کے فیصلوں سے بہتر یا حزم و احتیاط اور اِصابتِ رائے میں ان کے برابر تھے۔ گفتگو تو یہ ہو رہی ہے کہ ان کے فیصلے کو مولانا مودودی صاحب نے ''قانون کی بالاتری کا خاتمہ'' اور شریعت کے خلاف قرار دیا ہے، وہ شرعی قانون کی رُو سے غلط کیونکہ کہا جاسکتا ہے؟

پھر ملک صاحب نے لکھا ہے کہ چونکہ واقعتاً اس شخص کا ہاتھ شبہ میں نہیں، بلکہ حاکم کو کنکر مارنے پر کاٹا گیا تھا اور ''کنکر مارنے پر ہاتھ کاٹ دینا کسی طرح بھی شبہ کی اصطلاحِ فقہی کی تعریف میں نہیں آسکتا'' اس لئے حضرت معاویہؓ کا یہ فیصلہ غلط تھا۔

ملک صاحب اگر ذرا ٹھنڈے دِل اور انصاف سے غور فرمائیں تو ان پر بھی یہ بات واضح ہوسکتی ہے کہ مذکورہ واقعے میں حضرت معاویہؓ کے سامنے کنکر مارنے کا ذکر نہ استغاثہ کرنے والوں نے کیا، نہ مدعا علیہ حاکم نے، ان کے سامنے تو دادرسی ہی اس بات کی طلب کی گئی کہ ہمارے آدمی کا ہاتھ شبہ میں کاٹ دیا گیا ہے۔ جب مدعی اور مدعا علیہ دونوں ایک صورتِ واقعہ پر متفق ہیں تو حضرت معاویہؓ کو یہ علمِ غیب آخر کہاں سے حاصل ہوسکتا تھا کہ مظلوم نے خود اصل واقعے کو چھپا کر مدعا علیہ کے جرم کو ہلکا کر دیا ہے؟ ملک صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کو اصل واقعے کی تحقیق کرنی چاہئے تھی۔ لیکن تحقیق اور تفتیش کا سوال وہاں پیش آتا ہے جہاں مدعی اور مدعا علیہ میں کوئی اختلاف ہو، جہاں مقدمے کے دونوں فریق کسی بات پر متفق ہوجائیں، وہاں اگر فیصلہ ان کی بیان کردہ متفقہ صورت پر کر دیا جائے تو حاکم کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ فرض کیجئے کہ زید عمر پر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے میرے بھائی کو قتل کیا ہے۔ حاکم جب عمر سے پوچھتا ہے تو وہ اقبالِ جرم کرلیتا ہے، اگر اس صورت میں حاکم عمر پر

قتل کی سزا عائد کر دے تو کیا وہ گناہگار کہلائے گا؟

جناب غلام علی صاحب نے اس بحث میں دوسری تضاد بیانی یہ کی ہے کہ ایک طرف تو وہ مجھ سے یہ مطالبہ فرماتے ہیں کہ: "میں عثمانی صاحب کا بڑا ممنون ہوں گا اگر وہ البلاغ ہی میں یہ بات واضح فرمادیں کہ یہ عجیب و غریب اصول کتاب، سنت یا کسی فقہی کتاب کے کون سے مقام پر مذکور ہے کہ شبہ کا فائدہ جس طرح ملزم کو ملتا ہے، اسی طرح حاکم کو بھی ملتا ہے؟" گویا اس طرح وہ فقہی اصول کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں، لیکن دوسری طرف خود ہی تحریر فرماتے ہیں:۔

> یہ اصول اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ ہر انسان کی طرح ایک حاکم یا قاضی بھی اپنے فیصلے میں غلطی کر سکتا ہے اور وہ جائز تحفظ کا حق دار ہے۔

میں حیران ہوں کہ ان دونوں باتوں میں کس طرح تطبیق دوں؟ سوال یہ ہے کہ اگر ایک حاکم غلطی سے کسی کا ہاتھ شبہ میں کاٹ دے (یعنی سرقہ کی تمام شرائط پوری ہونے میں کوئی کسر رہ گئی ہو، اس کے باوجود وہ قطعِ ید کی سزا جاری کر دے) تو آپ کے نزدیک سزا میں اس کا ہاتھ کٹے گا یا نہیں؟ ملک صاحب کی پہلی بات کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اس کا ہاتھ کٹے گا لیکن اس کی دلیل میں انہوں نے شامی کی جو عبارت پیش کی ہے اس میں کہیں قصاص کا ذکر نہیں، اس میں صرف اتنا لکھا ہے کہ "یعزر القاضی ویعزل عن القضاء" (قاضی کو تعزیر کی جائے گی اور اسے عہدۂ قضاء سے معزول کر دیا جائے گا) اس میں قصاص کا ذکر کہاں ہے؟ اور یہ میں لکھ چکا ہوں کہ حضرت معاویہؓ نے ابنِ غیلان کو معزول کر دیا تھا، جس کا ذکر مولانا مودودی نے حذف کر دیا ہے۔ اور اگر ان کے نزدیک ہاتھ نہیں کٹے گا جیسا کہ ملک صاحب کی دوسری عبارت سے معلوم ہوتا ہے تو پھر میرا دعویٰ بھی تو یہی ہے کہ اس صورت میں حاکم پر قصاص نہیں آئے گا بلکہ اسے تعزیر اور معزولی کی سزا دی جائے گی، اس سے میرے استدلال کی تردید کیونکر ہوئی؟

یہ بات انتہائی افسوسناک ہے کہ ملک غلام علی صاحب نے ردّ المحتار (شامی) کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں یہ بات صراحۃً موجود ہے کہ اگر کوئی قاضی

یا حاکم شبہ میں سرقہ وغیرہ کی حد جاری کردے تو ضمان بیت المال پر آتا ہے اور حاکم کو پورا تحفظ ملتا ہے، اور اگر عمداً ایسی غلطی ہوئی ہو تو ضمان خود اس پر آتا ہے، اس پر تعزیر بھی کی جاتی ہے اور اسے معزول بھی کیا جاتا ہے، لیکن قصاص کسی صورت میں نہیں آتا۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ کی پوری عبارت یہ ہے[1]:-

وأما الخطأ في حقه تعالىٰ بأن قضى بحد زنا أو سرقة أو شرب واستوفي الحد ثم ظهر أن الشهود كما مر فالضمان في بيت المال وإن كان القضاء بالجور عن عمد وأقرّ به فالضمان في ماله في الوجوه كلها بالجناية والاتلاف ويعزر القاضي ويعزل عن القضاء.

ترجمہ:- اور رہا حاکم کا حق اللہ کے معاملے میں غلطی کرنا، مثلاً یہ کہ اس نے حدِ زنا، حدِ سرقہ یا شراب نوشی کی حد کا فیصلہ کرکے حد جاری کردی پھر معلوم ہوا کہ گواہ حسبِ سابق (یعنی نااہل) تھے تو ضمان بیت المال پر آئے گا، اور اگر فیصلہ جان بوجھ کر ظلم پر مبنی ہو تو تمام صورتوں میں خواہ وہ بدنی نقصان رسانی کی ہوں یا مالی اتلاف کی، ضمان خود قاضی کے مال پر آئے گا اور قاضی کو تعزیر بھی کی جائے گی اور اسے قضاء کے عہدے سے معزول بھی کیا جائے گا۔

اس عبارت میں جو پہلی صورت (گواہوں کے نااہل ہونے کی) بیان کی گئی ہے، وہ بعینہٖ حضرت معاویہؓ والے مقدمے کی ہے، اس لئے کہ ان کے سامنے مقدمہ قضا بالشبہ کا پیش ہوا تھا، اس بارے میں علامہ شامیؒ نے صاف لکھا ہے کہ ضمان (دیت) بھی بیت المال پر ہوگا، حاکم پر نہیں۔ بلکہ اس عبارت سے تو صاف یہ معلوم بھی ہوجاتا ہے کہ اگر حضرت معاویہؓ کو معلوم بھی ہوجاتا کہ قضاءِ قاضی بالجور ہوئی ہے

---

(۱) الشامیؒ: ردّ المحتار ج:۳ ص:۵۳۰، بولاق، مصر، "مطلب في ما لو قضى القاضي بالجور"۔

تب بھی اس پر قصاص نہ آتا بلکہ ضمان، تعزیر اور معزولی کی سزائیں دی جاتیں۔ اب یہ انتہا درجے کی دلاوری ہی کی بات ہے کہ ملک صاحب شامی کی اس عبارت کو جو صراحۃً ان کے موقف کی تردید کر رہی ہے اپنی تائید میں پیش کر کے مجھ سے دلیل کا مطالبہ بھی فرماتے ہیں، اِنَّ ھٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ!

# گورنروں کی زیادتیاں

اس کے بعد مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہؓ کے کچھ اور گورنروں کی زیادتیوں کے واقعات درج کیے تھے اور ان کا ذمہ دار حضرت معاویہؓ کو ٹھہرایا تھا، ان میں سے پہلا واقعہ زیاد کا تھا کہ اس نے بعض لوگوں کے ہاتھ صرف اس جرم پر کاٹ دیئے کہ انہوں نے اس پر خطبے کے دوران سنگ باری کی تھی، اس روایت میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کے ایک راوی علی ہیں[1]، جن سے عمر بن شبہ نے یہ روایت نقل کی ہے، اگر یہاں علی سے مراد علی بن عاصم ہیں تو ان کی روایات ائمۂ جرح و تعدیل کے نزدیک قابلِ استدلال نہیں ہیں، اس بات پر تو سبھی متفق ہیں کہ روایات کے معاملے میں بکثرت غلطیاں کرتے ہیں، حافظے میں کمزور ہیں اور انہیں وہم بہت ہو جاتا ہے اور غلطی کا اعتراف کبھی نہیں کرتے، پھر بعض حضرات کا کہنا تو یہ ہے کہ جان بوجھ کر جھوٹ نہیں بولتے اور بعض حضرات نے ان پر کذب کا الزام بھی لگایا ہے۔ یزید بن ہارون فرماتے ہیں: "ما زلنا نعرفه بالكذب" (ہمیں مسلسل ان کے جھوٹ کی اطلاعات ملتی رہی ہیں)، انہوں نے کئی روایات خالد الحذاء سے نقل کی ہیں، جب حضرت خالد سے تصدیق کی گئی تو انہوں نے سب کا انکار کیا۔[2]

اور اگر اس سے مراد علی بن محمد ہیں جیسا کہ تاریخِ طبری ہی کے بہت سے

---

(۱) عمر بن شبہ کے اساتذہ میں "علی" نام کے دو اُستاذوں کا ذکر ملتا ہے، ایک علی بن عاصم ہیں (تہذیب ج:۷ ص:۴۶۰) اور دُوسرے علی بن محمد جن سے طبریؒ میں کئی روایتیں مروی ہیں۔

(۲) ابو حاتم الرازیؒ: الجرح والتعدیل ج:۳ ص:۱۹۸ و ۱۹۹، و تهذيب التهذيب ج:۷ ص:۳۴۴ تا ۳۴۸۔

مقامات پر عمر بن شبہ، علی بن محمد سے روایت کرتے ہیں، تو عمر بن شبہ کے ہم عصروں میں بھی اس نام کے دو صاحبان گزرے ہیں، ایک علی بن محمد مدائنی، یہ بھی متکلم فیہ ہیں۔[۱] اور دُوسرے علی بن محمد موصلی، انہیں خود ان کے شاگرد حافظ ابونعیمؒ نے کذّاب قرار دیا ہے۔[۲] پھر ان کے اُستاذ مسلمہ بن محارب ہیں، جتنی اسماء الرجال کی کتابیں ہمارے پاس ہیں ان میں کہیں ان کا تذکرہ نہیں مل سکا۔

اس وجہ سے یہ روایت ناقابلِ اعتماد ہے، لیکن علیٰ سبیل الفرض میں نے یہ لکھا تھا کہ اگر اس روایت کو دُرست بھی مان لیا جائے تو کسی تاریخ میں یہ موجود نہیں ہے کہ حضرت معاویہؓ کو اس کی اطلاع ہوئی اور انہوں نے اس پر زیاد کو کوئی تنبیہ نہیں کی۔ ملک صاحب نے اس احتمال کو رَدّ کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ کو اس واقعے کا علم نہیں ہوا، میرے نزدیک بھی اس میں شک نہیں کہ یہ محض احتمال ہی ہے، اسے نہ قطعیت کا درجہ دیا جاسکتا ہے اور نہ قوی احتمال قرار دیا جاسکتا ہے، اس لئے صحیح بات یہی ہے کہ یہ روایت ناقابلِ اعتماد ہے۔

دُوسرا واقعہ بسر بن ابی ارطاةؓ کا تھا کہ انہوں نے یمن میں حضرت علیؓ کے گورنر عبیداللہ بن عباس کے دو بچوں کو قتل کردیا اور ہمدان میں بعض مسلمان عورتوں کو کنیز بنالیا۔

جہاں تک بچوں کے قتل کا تعلق ہے، میں نے عرض کیا تھا کہ یہ حضرت معاویہؓ کے عہدِ خلافت کا نہیں بلکہ مشاجرات کے زمانے کا قصہ ہے جبکہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے لشکر باہم برسرِ پیکار تھے، اور اوّل تو ان جنگوں کے بیان میں راویوں نے رنگ آمیزیاں بہت کی ہیں، حافظ ابنِ کثیرؒ بھی اس قصے کو نقل کرکے لکھتے ہیں: "وفی صحته عندی نظر" اس قصے کی صحت پر مجھے اعتراض ہے (البدایہ ج:۷ ص:۳۲۲)، دُوسرے یہ شدید افراتفری کا دور تھا جس میں گورنر اور فوج کے سالار مسلسل لڑائیوں میں مصروف رہے ہیں۔ ان حالات میں ان پر ہمہ وقت پورا قابو رکھنا بہت مشکل تھا،

---

(۱) العسقلانیؒ: لسان المیزان ج:۴ ص:۲۵۳، دائرۃ المعارف، دکن ۱۳۳۰ھ۔

(۲) الذہبیؒ: میزان الاعتدال ج:۲ ص:۲۳۷، مطبعة السطوة ۱۳۲۵ھ۔

حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں نے اپنے ماتحتوں کو یہ ہدایت کی ہوئی تھی کہ وہ قتال کے وقت حدِ ضرورت سے آگے نہ بڑھیں، خود انہی بسرؓ کا مقولہ میں نے نقل کیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے انہیں ہر بالغ شخص کے قتل سے بھی منع کیا تھا چہ جائیکہ چھوٹے بچوں کو بھی قتل کریں، اب اگر گورنر اور سپہ سالار اس عہد پر قائم نہیں رہے تو یہ ان کی غلطی ہے۔ اور جس زمانے میں کئی کئی محاذوں پر لڑائی ہو رہی ہو، اس وقت عہدوں میں اکھاڑ پچھاڑ آسان نہیں ہوتی، اسی بناء پر حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کا گروہ جو ہرگز کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا اس دور میں حضرت علیؓ کے ساتھ لگا رہا اور ان میں سے بعض لوگ اُونچے منصبوں پر فائز رہے، اس لئے کہ انہیں اس نازک وقت میں اُکھاڑنا نئے نئے فتنوں کا سبب بنتا، جن کی روک تھام حضرت علیؓ کے لئے سخت مشکل تھی، اسی قسم کی مجبوریاں حضرت معاویہؓ کے ساتھ بھی تھیں، جن کی بناء پر وہ گورنروں اور سپہ سالاروں پر کماحقہ نظر نہ رکھ سکے، لیکن جب یہ افراتفری کا وقت گزر گیا تو انہوں نے بسر بن ابی ارطاةؓ کو معزول بھی کر دیا۔ ملک غلام علی صاحب نہ جانے کیوں معزولی کو تسلیم نہیں فرماتے، حالانکہ میں نے تاریخ ابنِ خلدونؒ کا حوالہ بقیدِ صفحات دیا تھا، جو صاحب چاہیں تاریخِ مذکور ج:۳ ص:۸، ۹، مطبوعہ بیروت "بعث معاویة العمال الی الأمصار" کا مطالعہ فرمالیں۔

رہا مسلمان عورتوں کو کنیز بنانے کا قصہ، سو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ قصہ الاستیعاب کے سوا کسی کتاب میں مجھے نہیں ملا، اور استیعاب میں جو سند ذکر کی گئی ہے وہ بھی ضعیف ہے، کیونکہ اس کے راوی موسیٰ بن عبیدہ ہیں جن کے بارے میں امام احمدؒ کا قول ہے کہ ان سے روایت کرنا حلال نہیں۔ اس کے جواب میں ملک غلام علی صاحب لکھتے کہ: "مولانا نے ابنِ عبدالبر کا جو قول نقل کیا ہے وہ موسیٰ بن عبیدہ وغیرہ کے حوالے سے نہیں نقل کیا ہے، بلکہ ابو عمرو الشیبانی کے حوالے سے نقل کیا ہے، ابنِ عبیدہ والی روایت بعد میں بطور تائید آئی ہے، ابو عمرو الشیبانی ثقہ راوی ہیں۔"

یہاں ملک صاحب نے حافظ ابنِ عبدالبرؒ کے کلام کی بالکل غلط تشریح کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ شروع میں حافظ ابنِ عبدالبرؒ نے ابو عمر الشیبانی کے حوالے سے

بسر بن ابی ارطاۃؓ کے مدینہ پر خروج کرنے کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد ان کے الفاظ یہ ہیں:-

وفی هٰذه الخرجة التی ذکر أبو عمرو الشیبانی أغار بسر بن إرطاة علیٰ همدان وسبی نساءهم.[1]

ترجمہ:- بسر بن ارطاۃ کے جس سفر کا یہ ذکر ابوعمرو الشیبانی نے کیا ہے اسی سفر میں بسر بن ارطاۃ نے ہمدان پر حملہ کرکے وہاں کی عورتوں کو قید کیا۔

پھر اس کی دلیل میں موسیٰ بن عبیدہ والی سند بیان کی ہے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ عورتوں کو کنیز بنانے کا قصہ ابوعمرو شیبانی کی روایت سے بیان نہیں کیا گیا بلکہ شیبانی کا ذکر محض سفر کے حوالے کے طور پر آیا ہے کہ جس سفر کا انہوں نے ذکر کیا ہے اسی سفر میں موسیٰ ابن عبیدہ کی روایت کے مطابق عورتوں کو کنیز بنانے کا واقعہ بھی پیش آیا ہے۔ لہٰذا اس قصے کو بیچارے ابوعمرو الشیبانی کے سر منڈھ دینا کسی طرح صحیح نہیں!

پھر ملک صاحب فرماتے ہیں: ''تاریخی بحث میں ہر قدم پر راوی کی خیریت معلوم کرنے کی کوشش کرنا نہ ممکن ہے، نہ آج تک کسی سے ہوسکا ہے'' لیکن میں اس مسئلے پر تفصیل کے ساتھ تاریخی روایات کا مسئلہ کے تحت میں گفتگو کرچکا ہوں کہ جن روایتوں سے صحابہ کرامؓ پر فسق یا ارتکابِ کبیرہ کا الزام لگتا ہو ان میں راوی کی ''خیریت'' ضرور معلوم کی جائے گی، اور میں نہیں سمجھتا کہ کسی مسلمان کے لئے یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ راویوں کو ضعیف، مجروح، جھوٹا، کذّاب اور افتراء پرداز سمجھنے کے باوجود انہی کی بات مان کر صحابہ کرامؓ کو مطعون کرنا گوارا کرلے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اگر سچ مچ یہ بات دُرست ہوتی کہ مسلمان عورتوں کو بازار میں کھڑا کرکے بیچا گیا تو اس واقعے کی شہرت حدِ تواتر تک پہنچ جانی چاہئے تھی، یہ تاریخِ اسلام کے اس عظیم سانحے کا ایک ہی راوی کیوں ہے؟ اور راوی بھی وہ جس

---

(۱) الاستیعاب تحت الاصابة ج:۱ ص:۱۶۴، المکتبة التجاریة ۱۳۵۸ھ۔

سے بقول امام احمدؒ روایت کرنا حلال نہیں؟ اور پھر تاریخی کتابوں کے اتنے بڑے ذخیرے میں یہ بات صرف الاستیعاب ہی میں کیوں ملتی ہے؟ طبری، ابنِ کثیر، ابنِ عساکر، حافظ ابنِ حجر اور ابنِ سعد جیسے مؤرخین اس قصے کو کیوں نقل نہیں کرتے؟ ملک صاحب اس کے جواب میں فرماتے ہیں:-

> جتنی محنت اور جتنا وقت ان حضرات نے کتابوں کی ورق گردانی میں صرف کیا ہے اگر میں کرتا تو شاید میں بھی متعدد تائیدی حوالے پیش کر دیتا۔(1)

اس کے بعد انہوں نے اسد الغابہ کی ایک عبارت اور نقل کی ہے کہ اس میں بھی یہ قصہ موجود ہے، لیکن موصوف جو عبارت تائید کے طور پر لائے ہیں، وہ بلا سند و حوالہ ہے، میرا خیال ہے کہ اس سے بہتر تو استیعاب ہی کی روایت تھی کہ اس کی ایک، ضعیف سہی، سند تو ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اب تک تلاشِ بسیار کے باوجود مسلمان عورتوں کو کنیز بنانے کا یہ قصہ کسی صحیح سند کے ساتھ کہیں نہیں مل سکا۔ اور اتنا دِل گردہ ہم میں نہیں ہے کہ راویوں کو ضعیف اور مجروح جانتے بوجھتے ہم یہ باور کرلیں کہ حضرت عثمانؓ کی آنکھ بند ہوتے ہی وہ اُمت جسے ''خیر القرون'' کہا گیا ہے، غیرت و حمیت سے اتنی کوری، خدا کے خوف سے اتنی بے نیاز اور آخرت کے خیال سے اتنی بے فکر ہوگئی تھی کہ اسے مسلمان عورتوں کی عزّت و آبرو کا بھی کوئی پاس باقی نہیں رہا تھا۔

اس کے بعد مولانا مودودی صاحب نے دو واقعات ذکر کئے تھے جن میں لڑائی کے دوران مخالفین کا سر کاٹ کر ایک جگہ سے دُوسری جگہ بھیجا گیا، ایک حضرت عمار بن یاسرؓ کا سر حضرت معاویہؓ کے پاس لایا گیا اور دُوسرا عمرو بن الحمق کا۔

یہاں آگے بڑھنے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ سر کاٹ کر ایک جگہ سے دُوسری

---

(1) واضح رہے کہ میں نے اپنا سابقہ مضمون تقریباً ڈیڑھ ماہ میں لکھا تھا، جبکہ اس کے ساتھ دُوسرے تحریری کام بھی جاری تھے، اس کے مقابلے میں ملک غلام علی صاحب کا مضمون تیرہ مہینے جاری رہا اور اس عرصے میں ان کی کوئی اور تحریر سامنے نہیں آئی۔

جگہ لے جانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ باغیوں کے اَحکام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

وأكره أن تؤخذ رءوسهم فيطاف بها في الآفاق لأنه مثلة وقد نهٰى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن المثلة ولو بالكلب العقور ولأنه لم يبلغنا أن عليًّا رضى الله عنه صنع ذٰلك في شيء من حروبه وهو المتبع في الباب .... وقد جوز ذٰلك بعض المتأخرين من أصحابنا إن كان فيه كسر شوكتهم أو طمانية قلب أهل العدل استدلالًا بحديث ابن مسعود حين حمل رأس أبي جهل إلٰى رسول الله صلى الله عليه وسلم فلم ينكر عليه.(۱)

ترجمہ:- میں اس بات کو مکروہ سمجھتا ہوں کہ باغیوں کے سر اُتار کر ان کا گشت کرایا جائے، کیونکہ یہ مثلہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کٹکھنے کتے کا بھی مثلہ کرنے سے منع فرمایا ہے، نیز اس لئے کہ ہمیں کوئی روایت ایسی نہیں پہنچی کہ حضرت علیؓ نے اپنی جنگوں میں ایسا کیا ہو، اور اس باب (باغیوں سے لڑائی) میں وہی قابلِ اتباع ہیں ..... اور ہمارے اصحاب (حنفیہ) میں سے بعض متاخرین نے اس عمل کو جائز قرار دیا ہے، اگر اس سے باغیوں کی شوکت ٹوٹتی ہو یا اہلِ عدل کو دِلی طمانیت حاصل ہوتی ہو، یہ حضرات ابنِ مسعودؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ وہ ابوجہل کا سر اُتار کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے تو آپؐ نے ان پر کوئی نکیر نہیں فرمائی تھی۔

جہاں تک حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے واقعے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں میری گزارش یہ تھی کہ یہ روایت مولانا نے صحیح نقل کی ہے، لیکن اس میں

(۱) السرخسیؒ: المبسوط ج:۱۰ ص:۱۳۱، مطبعة السعادة، مصر ۱۳۲۴ھ۔

صرف اتنا ذکر ہے کہ حضرت عمارؓ کا سر حضرت معاویہؓ کے پاس لایا گیا، اس میں نہ تو یہ مذکور ہے کہ یہ عمل حضرت معاویہؓ کے حکم سے ہوا، اور نہ یہ کہ حضرت معاویہؓ نے اس کی ہمت افزائی یا تصدیق و توثیق فرمائی، بلکہ میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جس طرح حضرت علیؓ نے حضرت زبیر بن عوامؓ کا سر کاٹ کر لانے والے کو زبانی تنبیہ فرمائی تھی، اسی طرح حضرت معاویہؓ نے بھی اس پر افسوس کا اظہار کیا ہوگا جسے راوی نے ذکر نہیں کیا۔ ملک غلام علی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر حضرت معاویہؓ نے اس پر اظہارِ افسوس کیا ہوتا تو روایت میں اس کا ذکر ضرور ہوتا، جیسے ان کی دُوسری گفتگو روایت میں نقل کی گئی ہے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے گمان کے لئے روایت میں کوئی دلیل نہیں ہے، اور یہ بات بھی میں نے محض ایک احتمال کے طور پر کہی تھی، لیکن کیا اس بات سے بھی انکار کیا جاسکتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اس عمل کا حکم نہیں دیا تھا، اور نہ کوئی ایسا کام کیا جسے اس عمل پر پسندیدگی کا اظہار کہا جاسکے۔ ادھر مبسوط سرخسیؒ کی مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک مجتہد فیہ مسئلہ ہے جس میں زیادہ سے زیادہ بات کراہت کی حد تک پہنچتی ہے۔ اس مکروہ عمل کا ارتکاب حضرت معاویہؓ کے حکم یا ایماء کے بغیر کچھ لوگوں نے کرلیا، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں کو حضرت معاویہؓ کا تنبیہ کرنا روایات سے ثابت نہیں ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس پر یہ عمارت کھڑی نہیں کی جاسکتی کہ حضرت معاویہؓ کے عہد میں قانون کی بالاتری کا خاتمہ ہوگیا تھا، ان کی سیاست دِین کے تابع نہیں رہی تھی، اس کے تقاضے وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورے کرتے تھے اور اس معاملے میں حلال و حرام کی تمیز روا نہ رکھتے تھے۔

دُوسرا واقعہ عمرو بن الحمق کا تھا کہ حضرت معاویہؓ نے ان کے سر کا گشت کرایا، میں نے گزارش کی تھی کہ گشت کرانے کا قصہ مولانا کے دیئے ہوئے چار حوالوں میں سے صرف البدایہ والنہایہ میں ہے، تہذیب التہذیب میں گشت کرانے کا قصہ نہیں، مگر موصل سے حضرت معاویہؓ کے پاس جانے کا قصہ موجود ہے۔ اس کے برخلاف طبری کی روایت میں نہ سر کاٹنے کا ذکر ہے، نہ اسے لے جانے کا بیان ہے اور نہ گشت کرانے کا قصہ ہے، بلکہ حضرت معاویہؓ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ: ''ہم عمرو

بن الحمق پر زیادتی کرنا نہیں چاہتے، انہوں نے حضرت عثمانؓ پر نیزے کے نو وار کیئے تھے[1] تم بھی ان پر نیزے کے نو وار کرو۔'' اس میں یہ الفاظ کہ: ''ہم ان پر زیادتی نہیں کرنا چاہتے'' واضح طور سے حضرت معاویہؓ کی طرف سے ہر زیادتی کی تردید کر رہے ہیں۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ طبریؒ کی یہ روایت دُوسری روایتوں کے مقابلے میں زیادہ قابلِ ترجیح ہے، کیونکہ وہ حضرت معاویہؓ کے بُردبارانہ مزاج سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے، اس کے برعکس البدایہ والنہایہ کی روایت سند وحوالے کے بغیر بھی ہے اور حضرت معاویہؓ کے مزاج سے بعید بھی، مولانا مودودی صاحب حضرت علیؓ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

> جب دونوں طرح کی روایات موجود ہیں اور سند کے ساتھ بیان ہوئی ہیں تو آخر ہم ان روایات کو کیوں ترجیح نہ دیں جو ان کے مجموعی طرزِ عمل سے مناسبت رکھتی ہیں اور خواہ مخواہ وہی روایات کیوں قبول کریں جو اس کی ضد نظر آتی ہیں۔
>
> (خلافت وملوکیت ص:۳۴۸)

میں نے پوچھا تھا کہ اس اُصول کا اطلاق حضرت معاویہؓ پر کیوں نہیں ہوتا؟ اس کے جواب میں جناب غلام علی صاحب لکھتے ہیں: ''فرض کیا کہ امیر معاویہؓ نے اسے گشت نہ کرایا ہو لیکن اتنی بات تو البدایہ اور تہذیب دونوں میں منقول ہے کہ یہ سر موصل سے بصرہ وکوفہ اور وہاں سے دمشق امیر معاویہؓ تک پہنچا۔''

میری گزارش یہ ہے کہ طبریؒ کی روایت حضرت معاویہؓ کی طرف سے ہر زیادتی کی تردید کر رہی ہے اور اس میں سر کاٹ کر بھیجنے کا بھی ذکر نہیں ہے۔ تاہم اگر بالفرض موصل کے عامل نے یہ سر بھیجا بھی ہو تو حضرت معاویہؓ اس سے بَری ہیں، کیونکہ انہوں نے ہر قسم کی زیادتی سے صراحۃً منع فرمادیا تھا۔

---

(۱) الطبریؒ: تاریخ الأمم والملوک ج:۴ ص:۱۹۷، مطبعة الاستقامة، القاهرة ۱۳۵۸ھ۔

# حجر بن عدیؓ کا قتل

حضرت معاویہؓ پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ انہوں نے حضرت حجر بن عدیؓ کو ناجائز طور پر قتل کیا، مولانا مودودی صاحب نے بھی اس الزام کو تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ میں نے اس کے جواب میں حضرت حجر بن عدیؓ کے قتل کا پورا واقعہ تاریخِ طبری وغیرہ سے نقل کر کے بیان کردیا تھا، جس کی رُو سے مولانا مودودی صاحب کے اس موقف کی تردید ہوجاتی ہے کہ حجر بن عدیؓ کو محض ان کی حق گوئی کی سزا میں قتل کیا گیا۔ میں نے حوالوں کے ساتھ ثابت کیا تھا کہ حضرت حجر بن عدیؓ نے سبائی فتنہ پردازوں کے اُکسانے پر حضرت معاویہؓ کی حکومت کے خلاف ایک بھاری جمعیت تیار کی تھی جو مختلف اوقات میں ان کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے منصوبے بناتی رہی، اس نے کھلم کھلا حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ پر لعن طعن کو اپنا وطیرہ بنالیا اور بالآخر حضرت معاویہؓ کی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار ہوگئی۔ حضرت مغیرہؓ اور زیاد بن ابی سفیان نے نرمی اور گرمی کا ہر طریقہ آزمالیا، مگر یہ لوگ اپنی شورش سے باز نہ آئے، آخرکار کوفہ کے ستر شرفاء نے جن میں اُونچے درجے کے صحابہؓ و تابعینؒ بھی شامل تھے، ان کے خلاف مندرجہ بالا اُمور کی شہادت دی، اس شہادت کے بعد حضرت معاویہؓ نے حجر بن عدیؓ کے قتل کا فیصلہ کیا۔

جنابِ ملک غلام علی صاحب نے اس مسئلے میں میرے مضمون کے جواب میں جو طویل بحث کی ہے، وہ تقریباً اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے، اس لمبی چوڑی بحث میں سے اگر مناظرانہ عبارت آرائی، طعن و تشنیع، غیر متعلق باتوں، سیاسی جذبات انگیزیوں کو خارج کردیا جائے تو تین نکتے ایسے ملتے ہیں جو فی الواقعہ علمی نوعیت کے بھی ہیں اور زیرِ بحث مسئلے سے متعلق بھی، اس لئے وہ جواب کے مستحق ہیں، یہاں میں مختصراً انہی پر گفتگو کروں گا۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ بغاوت کا جرم صرف اس وقت سزائے موت کا مستوجب ہوتا ہے جبکہ اہلِ بغی ایک طاقتور جماعت اور بھاری گروہ پر مشتمل ہوں اور مسلح ہوکر

اسلامی حکومت کا مقابلہ کریں۔ ملک غلام صاحب کا کہنا یہ ہے کہ حضرت حجر بن عدیؓ کے گروہ پر یہ تعریف صادق نہیں آتی بلکہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ ایک معمولی ایجی ٹیشن تھا۔ زیاد کی پولیس کے خلاف انہوں نے جو لڑائی لڑی اس میں اسلحے بھی استعمال نہیں ہوئے، اس پورے ہنگامے میں صرف ایک مرتبہ تلوار کے استعمال کا ذکر تواریخ میں آیا ہے۔

جواباً عرض ہے کہ اگر حجر بن عدیؓ کے واقعات کو تفصیل کے ساتھ تاریخوں میں دیکھا جائے تو اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ ان کی جمعیت ایک بھاری اور طاقتور جمعیت تھی جسے قابو میں لانے کے لئے زیاد جیسے گورنر کو بڑی مشقت و محنت اُٹھانی پڑی۔ مندرجہ ذیل دلائل اس کی تائید کرتے ہیں۔

۱- حافظ شمس الدین ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حجر بن عدیؓ تین ہزار افراد کی مسلح جمعیت لے کر حضرت معاویہؓ کے خلاف کوفہ سے نکلے تھے۔ (فسار حجر عن الكوفة فى ثلاثه آلاف بالسلاح)۔[1]

۲- ان کی جمعیت اتنی بڑی تھی کہ اسی کے بل پر انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو حضرت معاویہؓ کی حکومت کے خلاف یہ کہہ کر آمادہ کرنا چاہا تھا کہ اگر آپ اس معاملے (خلافت) کو طلب کرنا پسند کرتے ہوں تو ہمارے پاس آجایئے، اس لئے کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ مرنے کے لئے اپنی جانوں کو تیار کر چکے ہیں (فإن كنت تحب أن تطلب هذا الأمر فاقدم إلينا فقد وطنا أنفسنا على الموت معك)۔[2]

۳- ان کے طاقتور ہونے کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ زیاد جب حضرت عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر بصرہ گیا تو وہ ان لوگوں پر قابو نہ پاسکے اور زیاد کو خط میں لکھا کہ:-

اگر تم کوفہ کو بچانے کی ضرورت سمجھتے ہو تو جلدی آجاؤ۔[3]

---

(۱) الذہبیؒ: تاریخ الاسلام ج:۲ ص:۲۷۶، مکتبۃ القدسی ۱۳۶۸ھ۔

(۲) الدینوریؒ: الأخبار الطوال ص:۲۲۱۔

(۳) طبقات ابن سعد ج:۶ ص:۲۱۸ جزو:۲۲، دار صادر بیروت، والبدایۃ والنہایۃ ج:۸ ص:۵۳۔

۴- طبریؒ نے نقل کیا ہے کہ زیاد نے تین مرتبہ اپنی پولیس حجرؓ کے پاس بھیجی، ہر بار پولیس کی تعداد میں اضافہ بھی کیا گیا، لیکن کسی بھی مرتبہ پولیس حجرؓ اور ان کے ساتھیوں پر غالب نہ آسکی۔

۵- پولیس کی ناکامی کے بعد زیاد نے ہمدان، تمیم، ہوازن، ابناء اعصر، مزحج، اسد اور غطفان کے قبائل پر مشتمل ایک پوری فوج تیار کی[1] اور اسے کندہ میں حجرؓ کے مقابلے کے لئے بھیجا، یہ فوج بھی حجرؓ کو گرفتار نہ کرسکی، یہاں تک کہ حجر بن عدیؓ نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔

۶- حضرت وائل بن حجرؓ اور کثیر بن شہابؓ، حضرت حجر بن عدیؓ کے خلاف گواہیوں کا جو صحیفہ لے کر گئے تھے اور جس پر انہوں نے خود بھی گواہی دی اس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ: ''انہوں نے امیر المؤمنین کے عامل کو نکال باہر کیا'' ظاہر ہے کہ دو چار افراد پر مشتمل ایک چھوٹی سی ٹولی یہ کام نہیں کرسکتی۔ ملک صاحب فرماتے ہیں کہ ''مجھے کسی تاریخ کی کتاب میں یہ واقعہ نہیں ملا'' لیکن جب ستر صحابہؓ و تابعینؒ اس پر گواہی دے رہے ہیں اور طبریؒ اسے ذکر کرتے ہیں تو معلوم نہیں تاریخ کی کتاب میں واقعہ ملنے کا اور کیا مطلب ہے؟

میں سمجھتا ہوں کہ اگر ملک غلام علی صاحب ان تمام باتوں پر غور فرمائیں گے تو ان کا یہ شبہ آسانی سے دُور ہوجائے گا کہ حجرؓ کی جماعت ایک معمولی سے گروہ پر مشتمل تھی جس پر اہلِ بغی کی تعریف صادق نہیں آتی۔

جناب غلام علی صاحب نے دُوسرا نکتہ یہ اُٹھایا ہے کہ اگر بالفرض حجر بن عدیؓ بغاوت کے مرتکب ہوئے تھے تو گرفتاری کے بعد انہیں قتل کرنا جائز نہیں تھا، کیونکہ باغی اسیر کو قتل کی سزا نہیں دی جاتی۔

لیکن جس شخص نے بھی فقہ کی کتابوں میں اسلام کے قانونِ بغاوت کا

---

(۱) ابن عساکرؒ: تہذیب تاریخ دمشق ج:۲ ص:۲۷۳ و ۲۷۴، روضۃ الشام ۱۳۳۰ھ، وطبری ج:۴ ص:۱۹۴ تا ۱۹۶۔

مطالعہ کیا ہو، وہ بہ آسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ ملک صاحب کا یہ کہنا کسی طرح دُرست نہیں کہ باغی اگر گرفتار ہوجائے تو سزائے موت سے بچ جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی باغی کے بارے میں یہ اندیشہ ہو کہ اگر اسے آزاد کردیا گیا تو وہ پھر اسلامی حکومت کے خلاف جمعیت بنا کر دوبارہ بغاوت کا مرتکب ہوگا تو اسے قتل کرنے کی اجازت تمام فقہاء نے دی ہے۔ سزائے موت صرف اس وقت موقوف ہوتی ہے جبکہ باغیوں کی جماعت لڑائی میں ختم ہوگئی ہو اور جو دو چار افراد باقی رہ گئے ہوں ان کی موجودگی اسلامی حکومت کے لئے خطرہ نہ بن سکتی ہو۔ اس سلسلے میں فقہاء کی حسبِ ذیل تصریحات ملاحظہ فرمایئے۔ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

وكذٰلك لا يقتلون الأسير إذا لم يبق لهم فئة .... وإن كانت له فئة فلا بأس بأن يقتل أسيرهم لأنه ما اندفع شره ولٰكنه مقهور ولو تخلص انحاز إلٰى فئته فإذا رأى الإمام المصلحة في قتله فلا بأس بأن يقتله.[1]

ترجمہ:- اسی طرح اگر باغیوں کی کوئی جماعت باقی نہ رہ گئی ہو تو قیدی کو قتل نہیں کریں گے ..... اور اگر اس کی جماعت باقی ہو تو ان کے گرفتار شدہ باغی کو قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں اس لئے کہ اس کا شر دفع نہیں ہوا، وہ محض مجبور ہوگیا ہے، اور اگر اسے آزادی مل گئی تو وہ اپنی جماعت کے ساتھ مل جائے گا، لہٰذا اگر اِمام اسے قتل کرنے میں مصلحت دیکھے تو اسے قتل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

فتاویٰ عالمگیریہ میں اسی مسئلے کو یوں بیان کیا گیا ہے:-

ومن أسر منهم فليس للإمام أن يقتله إذا كان يعلم أنه لو

---

(۱) السرخسي: المبسوط ج:۱۰ ص:۱۲۶، مطبعة السعادة ۱۳۲۴ھ۔

لم يقتله لم يلتحق إلىٰ فئة ممتنعة أما إذا كان يعلم أنه لو لم يقتله يلتحق إلىٰ فئة ممتنعة فيقتله.[1]

ترجمہ:- اور باغیوں میں سے جو شخص گرفتار ہو جائے تو اگر یہ معلوم ہو کہ اسے قتل نہ کرنے کی صورت میں وہ کسی طاقتور جماعت سے جا نہیں ملے گا تو اِمام کو اسے قتل کرنے کا حق نہیں، لیکن اگر اسے یہ معلوم ہو کہ اگر اسے قتل نہ کیا گیا تو وہ کسی طاقتور جماعت سے جا ملے گا تو اسے قتل کردے۔

حجر بن عدیؓ کے بارے میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو پورا اندیشہ تھا کہ اگر انہیں چھوڑ دیا گیا تو وہ پھر حکومت کے خلاف بغاوت کے مرتکب ہوں گے، چنانچہ ایک موقع پر انہوں نے اس کا اظہار بھی فرمایا:-

إن حجرًا رأس القوم وأخاف إن خليت سبيله أن يفسد علىٰ مصرى.[2]

ترجمہ:- حجرؓ اس پوری قوم کے سردار ہیں، اور اگر میں نے انہیں چھوڑ دیا تو مجھے خطرہ ہے کہ وہ میری حکومت کے خلاف فساد کریں گے۔

اور ایک اور موقع پر انہوں نے ارشاد فرمایا:-

قتله أحب إليّ من أن أقتل معه مائة ألف.[3]

ترجمہ:- ان کا قتل کرنا مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ میں ان کے ساتھ ایک لاکھ آدمیوں کو قتل کروں۔

ان حالات میں خود فیصلہ کر لیجئے کہ جناب غلام علی صاحب کا یہ موقف کس

---

(۱) فتاویٰ عالمگیری ج:۲ ص:۲۸۰، نولشکور، مزید ملاحظہ فرمائیے: ردّ المحتار ج:۳ ص:۴۸۱، و فتح القدير ج:۴ ص:۴۱۲، و بدائع الصنائع ج:۷ ص:۱۴۱۔

(۲) الطبری ج:۴ ص:۲۰۴۔

(۳) البداية والنهاية ج:۸ ص:۵۴۔

حد تک دُرست ہے کہ گرفتار ہونے کے بعد حجر بن عدیؒ کو قتل کرنا جائز نہیں رہا تھا۔

ملک غلام علی صاحب کو اس کارروائی پر تیسرا قابلِ ذکر اعتراض یہ ہے کہ زیاد نے ستر گواہیوں کا جو صحیفہ حضرت معاویہؓ کے پاس روانہ کیا، وہ سب لکھی ہوئی گواہیاں تھیں، جو فقہی اصطلاح کے مطابق "کتاب القاضی إلی القاضی" کے تحت آتی ہیں، اور گواہی کا یہ طریقہ حدود و قصاص کے معاملات میں معتبر نہیں ہوتا۔

لیکن ملک صاحب موصوف نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ ان ستر گواہوں میں سے دو گواہ حضرت وائل بن حجرؓ اور حضرت کثیر بن شہابؓ بھی تھے جن کے ذریعے یہ صحیفہ بھیجا گیا تھا، لہٰذا ان دو گواہوں نے اپنی گواہی حضرت معاویہؓ کے سامنے زبانی پیش کی تھی، اور باقی گواہیاں محض تائید کے طور پر تھیں، شرعی نصابِ شہادت حضرت وائلؓ اور حضرت کثیرؓ کی زبانی گواہیوں سے پورا ہوگیا تھا، چنانچہ حافظ شمس الدین ذہبیؒ لکھتے ہیں:-

وجاء الشهود فشهدوا عند معاوية عليه.[1]

ترجمہ:- گواہ آئے اور انہوں نے حضرت معاویہؓ کے رُوبرو حجر بن عدیؒ کے خلاف گواہی دی۔

بلکہ حافظ ذہبیؒ نے "شہود" کا لفظ صیغۂ جمع کے ساتھ استعمال کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دو حضرات کے علاوہ بھی بعض گواہوں نے زبانی شہادت دی تھی۔ رہا حضرت شریحؒ کا قصہ، سو ان کی تردید کے باوجود نصابِ شہادت باقی تھا، اس لئے کہ حضرت وائلؓ اور حضرت کثیر بن شہابؓ نے اپنی گواہیوں سے رُجوع نہیں کیا تھا، پھر حضرت شریحؒ نے جن الفاظ میں تردید کی، ان میں حضرت حجر بن عدیؒ کے عابد و زاہد ہونے کا ذکر تو موجود ہے لیکن جن باغیانہ سرگرمیوں کی شہادت دُوسروں نے دی تھی، ان کی نفی نہیں ہے۔ اس لئے قانونی طور پر ان کی تردید سے اصل مسئلے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان تین نکات کی وضاحت کے بعد ملک غلام علی صاحب

---

(۱) الذہبیؒ: تاریخ الاسلام ج:۲ ص:۲۷۶، مکتبۃ القدسی ۱۳۶۸ھ۔

کی پوری بحث کا جواب ہوجاتا ہے، کیونکہ ان کی ساری گفتگو انہی نکات پر مبنی ہے، البتہ آخر میں ان کے ایک اور اعتراض کا جواب بھی پیشِ خدمت ہے جو عام ذہنوں میں خلش پیدا کرسکتا ہے، ملک صاحب لکھتے ہیں:-

> حضرت معاویہؓ نے بعض صحابہؓ کے کہنے پر چھ افراد کو چھوڑ دیا اور آٹھ کو قتل کرنے کا حکم دیا، سوال یہ ہے کہ اس دوگونہ اور امتیازی سلوک کی وجہ کیا ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ عثمانی صاحب نے اس سوال کا جواب بعض پوچھنے والوں کو یہ دیا(۱) ہے کہ باغی کا قتل واجب نہیں، صرف جائز ہے، اس لئے امیر معاویہؓ نے جسے چاہا قتل کرادیا، جسے چاہا معاف کردیا، ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے! اس کے معنی تو یہ ہیں کہ عثمانی صاحب حضرت معاویہؓ کو ماشاء اللہ یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء کے مقامِ عالی پر فائز کرنا چاہتے ہیں کہ معاملہ عدالت کا نہیں، مشیت کا تھا، میں یہ حقیقت کھول کر بیان کرچکا کہ اوّل تو یہ اصحاب ہرگز باغی نہ تھے، اور بالفرض اگر تھے بھی تو گرفتار ہوجانے کے بعد مجردِ جرم بغاوت کی سزا ہرگز قتل نہیں ہے۔ اب میں عثمانی صاحب سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ چبا چبا کر(۲) بات کرنے کے بجائے صاف صاف بتائیں کہ انہوں نے یہ اُصول کہاں سے اخذ کیا ہے کہ باغی اسیر کا قتل واجب تو نہیں، مگر جائز ہے؟
>
> (ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۶۹ء ص:۴۴)

ملک صاحب کا یہ مطالبہ بالکل ایسا ہے جیسے کوئی کسی سے یہ کہنے لگے کہ صاف صاف بتاؤ تم نے یہ اُصول کہاں سے اخذ کیا ہے کہ نماز کے لئے وضو ضروری

---

(۱) یہ بات مجھ سے ایک خط میں پوچھی گئی تھی، ملک صاحب کے اس ارشاد سے اندازہ ہوا کہ یہ خطوط کہاں سے اور کس تنظیم کے ساتھ آرہے تھے۔

(۲) زبان کی شیرینی ملاحظہ فرمائیے۔

ہے؟ میں حیران ہوں کہ وہ کس بنیاد پر مجھ سے یہ مطالبہ فرما رہے ہیں۔ جس شخص کو بھی فقہی کتابوں سے ادنیٰ مس ہو وہ اس ''اُصول'' کے اثبات کے لئے ایک دو نہیں بلا مبالغہ فقہاء کے بیسیوں حوالے پیش کرسکتا ہے، ملک صاحب مجبور فرماتے ہیں تو ان میں سے چند ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

''درمختار'' فقہِ حنفی کا معروف متن ہے، اس میں لکھا ہے:-

والإمام بالخيار في أسيرهم إن شاء قتله وإن شاء حبسه.[1]

ترجمہ:- گرفتار شدہ باغی کے بارے میں اِمام کو اختیار ہے، اگر چاہے تو اسے قتل کردے اور اگر چاہے تو اسے محبوس رکھے۔

اِمام کمال الدین بن ہمامؒ اس ''اختیار'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ومعنى هٰذا الخيار أن يحكم نظره فيما هو أحسن الأمرين في كسر الشوكة للا بهوى النفس والتشفي.[2]

ترجمہ:- اس اختیار کا مطلب یہ ہے کہ اِمام (حاکم) اس بات پر غور کرے کہ باغیوں کی شوکت توڑنے کے لئے کون سی صورت زیادہ بہتر ہے، محض خواہشاتِ نفس اور سنگ دِلی کی وجہ سے کوئی صورت اختیار نہ کرے۔

ملک العلماء کاسانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:-

وأما أسيرهم فإن شاء الإمام قتله استئصالا لشافتهم وإن شاء حبسه لاندفاع شره بالأسر والحبس وإن لم يكن لهم فئة يتحيزون إليها لم يتبع مدبرهم ولم يجهز علىٰ جريحهم ولم يقتل أسيرهم لوقوع الأمن عن شرهم عند انعدام الفئة.[3]

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ج:۳ ص:۴۸۱، بولاق، مصر۔

(۲) ابن الهمامؒ: فتح القدير ج:۴ ص:۴۱۲۔

(۳) الكاسانیؒ: بدائع الصنائع ج:۷ ص:۱۴۱، مطبعة جمالية، مصر ۱۳۲۸ھ۔

ترجمہ:- جہاں تک باغی اسیر کا تعلق ہے تو اِمام اگر چاہے تو اسے قتل کردے تاکہ ان کی مکمل بیخ کنی ہو جائے، اور اگر چاہے تو اسے قید رکھے، اس لئے کہ اس کا شر گرفتاری سے بھی دُور ہوسکتا ہے، اور اگر باغیوں کی کوئی ایسی جمعیت نہ ہو جہاں وہ پناہ لے سکیں تو نہ ان کے بھاگنے والے افراد کا تعاقب کیا جائے گا، نہ ان کے زخمیوں کا کام تمام کیا جائے گا اور نہ ان کے گرفتار شدہ افراد کو قتل کیا جائے گا، اس لئے کہ جب ان کی کوئی جمعیت نہیں رہی تو ان کے شر کا بھی کوئی خوف نہیں رہا۔

علامہ مرغینانی رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ ہدایہ تحریر فرماتے ہیں:-

فإن كانت (أی فئة) يقتل الإمام الأسير وإن شاء حبسه.

ترجمہ:- اگر باغیوں کی جمعیت موجود ہو تو ان کے گرفتار شدہ افراد کو اِمام قتل کردے اور چاہے تو قید رکھے۔

یہ چند حوالے میں نے محض مثال کے طور پر پیش کردیئے ہیں، ورنہ فقہ کی کوئی بھی مکمل کتاب اس مسئلے سے خالی نہیں، فقہاءؒ کی ان تصریحات سے قدرِ مشترک کے طور پر جو بات نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ جس باغی اسیر کی جمعیت باقی ہو، اسے قتل کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ اِمام کے سپرد کیا گیا ہے تاکہ وہ حالات کے پیشِ نظر مناسب فیصلہ کرسکے، اگر کسی قیدی کا وجود باغیوں کی جمعیت کو تقویت پہنچاسکتا ہو اور اس سے ان کی جماعت کی شوکت میں اضافہ ہوسکتا ہو تو اسے قتل کروادے، اور جس قیدی کے بارے میں ظنِ غالب یہ قائم ہوجائے کہ باغیوں کی شوکت کو توڑنے کے لئے اسے قتل کرنا ضروری نہیں ہے تو اس کی سزائے موت کو موقوف کردے۔

تمام فقہاءؒ اس حکم کے بیان پر متفق ہیں اور ہر ایک فقہی کتاب میں اِمام کو یہ اختیار دیا گیا ہے، اب اگر جناب ملک غلام علی صاحب کو یہ بات ناگوار ہے تو وہ میدانِ حشر میں ان تمام بزرگوں سے جنھوں نے اپنی کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہے یہ سوال ضرور کریں کہ: ”آپ نے صرف حضرت معاویہؓ ہی کو نہیں، اسلامی حکومت کے

تمام فرماں رواؤں کو "یعذب من یشاء ویغفر لمن یشاء" کے مقامِ عالی پر کیوں فائز کردیا؟ اور اپنی کتابوں میں بار بار "إن شاء قتله وإن شاء حبسه" لکھ کر "عدالت" کے اس مسئلے کو "مشیت" کا مسئلہ کس طرح بنادیا؟"

## ایک ضروری گزارش

ہم نے حضرت حجر بن عدیؓ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ ان کی سرگرمیاں نفس الامر میں بغاوت کے تحت آتی تھیں، اس لئے حضرت معاویہؓ نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا، اس میں وہ معذور تھے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ حضرت حجر بن عدیؓ اس بغاوت کی بناء پر فسق کے مرتکب ہوئے، بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ بغاوت کرنے والا اگر صاحبِ بدعت نہ ہو اور نیک نیتی کے ساتھ معتد بہ دلیل و تأویل کی بنیاد پر اسلامی حکومت کے خلاف خروج کرے، تو اگرچہ اس پر اَحکام تو اہلِ بغی ہی کے جاری ہوں گے، لیکن اس بناء پر اسے فاسق بھی نہیں کہا جائے گا، جیسا کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے خلاف لڑائی کی، اس میں جمہور اہلِ سنت کے نزدیک حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا، اسی لئے حضرت علیؓ نے ان کے ساتھ اہلِ بغی کا سا معاملہ کرکے ان کے خلاف جنگ کی، اس جنگ میں حضرت معاویہؓ کے بہت سے رُفقاء شہید بھی ہوئے اور ظاہر ہے کہ ان کی شہادت میں حضرت علیؓ کا چنداں قصور بھی نہیں تھا کیونکہ وہ اِمامِ برحق تھے، لیکن اس بناء پر حضرت معاویہؓ کو مرتکبِ فسق قرار نہیں دیا گیا، بلکہ انہیں مجتہدِ مخطیٔ کہا گیا، علامہ موفق الدین بن قدامہؒ اسی بات کو واضح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

والبغاة إذا لم يكونوا من أهل البدع ليسوا بفاسقين وإنما هم يخطئون في تأويلهم والإمام وأهل العدل مصيبون في قتالهم فهم جميعًا كالمجتهدين من الفقهاء في الأحكام من شهد منهم قبلت شهادته إذا كان عدلًا وهٰذا قول الشافعي ولا أعلم في قبول شهادتهم خلافًا.[1]

---

(۱) ابن قدامہؒ: المغنی ج:۸ ص:۱۱۷ و ۱۱۸، دار المنار، مصر ۱۳۶۷ھ۔

ترجمہ:- اور باغی لوگ اگر اہلِ بدعت میں سے نہ ہوں تو وہ فاسق نہیں ہیں، بلکہ ان کی تأویل غلط ہے، اور اِمام اور اہلِ عدل بھی ان سے جنگ کرنے میں برحق ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے اَحکامِ شرعیہ میں مجتہد فقہاء (کہ ان میں سے ہر ایک دُوسرے کو برغلط سمجھتا ہے، لیکن مرتکبِ فسق کوئی نہیں ہوتا) لہٰذا ان میں سے جو شخص گواہی دے، اس کی گواہی مقبول ہے بشرطیکہ وہ عدل ہو، یہ اِمام شافعیؒ کا قول ہے اور اس کی شہادت کو قبول کرنے میں علماء کے کسی اختلاف کا مجھے علم نہیں ہے۔

حضرت حجر بن عدیؓ چونکہ ایک عابد و زاہد انسان تھے اور ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ کی حکومت کے خلاف جو کچھ کیا، اس کا منشاء طلبِ اقتدار تھا، اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ انہوں نے خروج کا ارتکاب کسی تأویل کے ساتھ ہی کیا ہوگا، اس لئے ان کا ذکر بھی ادب و احترام کے ساتھ ہونا چاہئے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ بعض علماء مثلاً شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی موت کے لئے شہادت کا لفظ استعمال کیا، اور چونکہ وہ نیک نیتی کے ساتھ اپنے آپ کو اہلِ عدل میں سے سمجھتے تھے، اس لئے جہاں شمس الائمہ رحمۃ اللہ علیہ نے بعض شہدائے اہلِ عدل کی وصیتیں نقل کی ہیں، ان میں حضرت حجر بن عدیؓ کی وصیت بھی نقل فرمادی ہے کہ مجھے غسل نہ دیا جائے۔[1] کیونکہ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کا اصل مقصد اس جگہ یہ بتانا ہے کہ اہلِ بغی کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے جو اہلِ عدل شہید ہوجائیں انہیں غسل نہیں دیا جائے گا، اس کی دلیل میں انہوں نے جہاں حضرت عمار بن یاسرؓ اور حضرت زید بن صوحانؓ کی وصیت نقل کی ہے، وہیں حضرت حجر بن عدیؓ کی وصیت بھی نقل کردی ہے، جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ چونکہ اپنے آپ کو اہلِ عدل میں سے سمجھتے تھے اور انہوں نے یہ وصیت کی کہ مجھے غسل نہ دیا جائے، اس لئے معلوم

---

(۱) السرخسیؒ: المبسوط ج:۱۰ ص:۱۳۱، مطبعۃ السعادۃ، مصر ۱۳۲۴ھ۔

ہوا کہ شہدائے اہلِ عدل کو ان کے نزدیک غسل کے بغیر دفن کرنا چاہئے۔ اس سے ملک صاحب کا یہ استنباط دُرست نہیں ہے کہ حضرت حجر بن عدیؓ نفس الامر میں بھی اہلِ عدل میں سے تھے اور انہیں قتل کرنا جائز نہیں تھا، کیونکہ اگر انہیں واقعۃً اہلِ عدل میں سے مانا جائے تو پھر لازماً کہنا پڑے گا کہ ان کے مقابلے میں حضرت معاویہؓ اہلِ بغی میں سے تھے، اب کیا ملک صاحب یہ بھی فرمائیں گے کہ خلیفۂ برحق حجر بن عدیؓ تھے اور حضرت معاویہؓ ان کے مقابلے میں باغی تھے؟ جبکہ اہلِ سنت کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت حسنؓ سے مصالحت کے بعد ان کی خلافت بلاشبہ منعقد ہوچکی تھی، اور غالباً مولانا مودودی صاحب کو بھی اس سے انکار نہیں ہوگا۔

میں نے حجر بن عدیؓ کے واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے شروع میں لکھا تھا کہ:

''اس واقعے میں بھی مولانا مودودی صاحب نے اوّل تو چند باتیں ایسی کہی ہیں جن کا ثبوت کسی بھی تاریخ میں یہاں تک کہ ان کے دیئے ہوئے حوالوں میں بھی نہیں ہے۔'' ان چند باتوں میں سے ایک بات تو حضرت عائشہؓ کا قول تھا جو مجھے پہلے کسی کتاب میں نہیں ملا تھا، بعد میں مل گیا تو جمادی الثانیہ ۱۳۸۹ھ کے ''البلاغ'' میں، میں نے معذرت کا اعلان کردیا تھا۔ ملک صاحب فرماتے ہیں کہ آپ نے ''چند باتیں'' بصیغۂ جمع لکھی ہیں، اگر مولانا مودودی کی کوئی اور بات ابھی تک کتابوں میں نہ ملی ہوتو اس کی نشاندہی کی جائے، ورنہ غیر ذمہ دارانہ باتوں سے پرہیز کیا جائے۔

اس کے جواب میں ملک صاحب سے گزارش ہے کہ براہِ کرم ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ کے ''البلاغ'' میں صفحہ:۱۹ کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں، جس میں، میں نے بتایا ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے زیاد کے بارے میں لکھا ہے کہ: ''وہ خطبے میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا'' لیکن جتنے حوالے انہوں نے دیئے ہیں، ان میں کہیں بھی زیاد کا حضرت علیؓ کو گالیاں دینا مذکور نہیں، بلکہ قاتلینِ عثمان پر لعنت کرنا مذکور ہے۔ طبری، ابنِ اثیر، البدایہ اور ابنِ خلدون سب کی عبارتیں میں نے ''البلاغ'' کے مذکورہ صفحے پر لکھ دی ہیں۔ کیا ملک صاحب نے ان کا مطالعہ نہیں فرمایا؟

# یزید کی ولی عہدی

یزید کی ولی عہدی کے مسئلے میں ملک غلام علی صاحب نے میرے مضمون پر جو تبصرہ فرمایا ہے اسے بار بار ٹھنڈے دِل سے پڑھنے کے بعد میں اس کے بارے میں تاٰویل در تاٰویل کے بعد ہلکی سے ہلکی بات یہ کہہ سکتا ہوں کہ غالباً ملک صاحب نے میرے مضمون کو بنظرِ غائر پڑھنے سے قبل ہی اس پر تبصرہ لکھنا شروع کردیا ہے اور میرے موقف کو صحیح سمجھنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ موصوف کی اس بحث میں جگہ جگہ یہ نظر آتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے ایک موقف تصنیف فرما کر مجھ سے منسوب کرتے ہیں، اور پھر اس کی تردید میں صفحات کے صفحات لکھتے چلے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے اس تبصرے میں کہیں نزاعِ لفظی باقی رہ گیا ہے، کہیں تضاد بیانی پیدا ہوگئی ہے، اور کہیں بالکل غیر متعلق بحثیں چھڑ گئی ہیں۔

اگر میری مصروفیات میں ''بحث برائے بحث'' کا کوئی خانہ ہوتا تو میں موصوف کے مضمون کے ایک ایک جز پر تبصرہ کرکے بتاتا کہ انہوں نے میرے موقف کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں کن کن تضاد بیانیوں اور لفظی مغالطوں کا ارتکاب کیا ہے اور بات کہاں سے کہاں پہنچادی ہے، لیکن جیسا کہ میں بار بار عرض کرچکا ہوں، میرے پیشِ نظر مناظرہ بازی نہیں، صرف اہلِ سنت کے موقف کا مدلل اظہار اور اس پر جو علمی نوعیت کے اِشکالات ہوسکتے ہیں، ان کا دفعیہ ہے، اس لئے اس مسئلے میں میرا کام بہت مختصر رہ گیا ہے، البتہ جن حضرات کو ملک صاحب کے فنِ مناظرہ سے زیادہ دِلچسپی ہو، ان سے میری درخواست ہے کہ وہ ایک مرتبہ میرے اور ان کے مضمون کو آمنے سامنے رکھ کر ضرور مطالعہ فرمالیں، اِن شاء اللہ بڑی بصیرت وعبرت حاصل ہوگی۔

میں نے یزید کی ولی عہدی کے سلسلے میں اہلِ سنت کے جس موقف کا اظہار کیا تھا، وہ یہ تھا کہ یزید کو جانشین نامزد کرنا حضرت معاویہؓ کی رائے کی غلطی تھی، جو دیانت داری اور نیک نیتی ہی کے ساتھ سرزد ہوئی، لیکن اس کے نتائج اُمت کے لئے اچھے نہ ہوئے، میں نے بحث کے شروع ہی میں واضح کردیا تھا کہ اس مسئلے میں مولانا

مودودی صاحب سے ہمارا اختلاف یہ ہے کہ ان کے نزدیک یہ صرف رائے کی دیانت دارانہ غلطی نہیں تھی بلکہ اس کا محرک حضرت معاویہؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا ذاتی مفاد تھا، اس مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر ''دونوں صاحبوں نے اس بات سے قطع نظر کرلیا کہ وہ اُمتِ محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں؟'' اور ہمارے نزدیک یہ محض رائے کی غلطی تھی، حضرت معاویہؓ نے یزید کو صرف اس لئے ولی عہد نامزد نہیں کیا کہ وہ ان کا بیٹا تھا، بلکہ وہ نیک نیتی کے ساتھ اسے خلافت کا اہل سمجھتے تھے، گویا ہمارے نزدیک ان کے فیصلے کی اصل بنیاد یہ تھی کہ ان کے نزدیک وہ خلافت کا اہل بھی تھا اور اُمت اس پر جمع بھی ہوسکتی تھی، اور مولانا مودودی کے نزدیک ان کے فیصلے کی بناء صرف یہ تھی کہ وہ ان کا بیٹا ہے۔

میرا یہ موقف میرے مضمون سے بالکل واضح ہے، اور اسی کے مفصل دلائل میں نے پیش کئے تھے اور آخر میں لکھا تھا:-

> جیسا کہ ہم شروع میں عرض کرچکے ہیں، مذکورہ بالا بحث سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور معاویہؓ کی رائے واقعے کے لحاظ سے سو فیصد دُرست تھی اور انہوں نے جو کچھ کیا وہ نفس الامر میں ٹھیک کیا، بلکہ مذکورہ بحث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کی رائے کسی ذاتی مفاد پر نہیں بلکہ دیانتداری پر مبنی تھی، اور انہوں نے جو کچھ کہا وہ امانت کے ساتھ اور شرعی جواز کی حدود میں رہ کر کیا، ورنہ جہاں تک رائے کا تعلق ہے، جمہور اُمت کا کہنا یہ ہے کہ اس معاملے میں رائے انہی حضراتِ صحابہؓ کی صحیح تھی جو یزید کو ولی عہد بنانے کے مخالف تھے، جس کی مندرجہ ذیل وجوہ ہیں:-
>
> ۱- حضرت معاویہؓ نے تو بے شک اپنے بیٹے کو نیک نیتی کے ساتھ خلافت کا اہل سمجھ کر ولی عہد بنایا تھا، لیکن ان کا یہ عمل ایک ایسی نظیر بن گیا جس سے بعد کے لوگوں نے نہایت ناجائز فائدہ

اُٹھایا، انہوں نے اس کی آڑ لے کر خلافت کے مطلوبہ نظامِ شوریٰ کو درہم برہم کرڈالا، اور مسلمانوں کی خلافت بھی شاہی خانوادے میں تبدیل ہوکر رہ گئی ....الخ۔

لیکن ملک غلام علی صاحب یزید کی ولی عہدی کی بحث کے بالکل شروع میں میرا کیا موقف بیان فرماتے ہیں؟ ملاحظہ فرمایئے:۔

اب یزید کی ولی عہدی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ اس بات پر اُمت کا اجماع منعقد ہوچکا ہے کہ خلیفۂ وقت اگر اپنے بیٹے یا دُوسرے رشتہ دار میں نیک نیتی کے ساتھ شرائطِ خلافت پاتا ہے تو اسے ولی عہد بناسکتا ہے اور خلیفہ کی نیت پر حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ اس کا صاف مطلب دُوسرے لفظوں میں یہ ہوا کہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ اور خاندانی بادشاہت دونوں اسلام میں یکساں طور پر جائز و مباح ہیں اور مسلمان ان دونوں میں سے جس طرزِ حکومت کو چاہیں اپنا سکتے ہیں۔ (ترجمان القرآن جنوری ۱۹۷۰ء ص:۳۳)

میرے اور ملک صاحب کے اس اقتباس کا ایک ایک جملہ ملاکر دیکھئے، ہمارے فاضل تبصرہ نگار کی سخن فہمی، امانت و دیانت اور نقل و بیان کی خوبصورتی ملاحظہ فرمایئے، اور اس کے بعد بتایئے کہ جو بحث اس سخن فہمی کی بنیاد پر ایسی علمی دلآوری کے ساتھ شروع کی گئی ہو، اس کا کیا جواب دیا جائے...؟

میں بار بار لکھ چکا ہوں کہ میری بحث کا منشاء حضرت معاویہؓ کے اس فعل کی تصویب و تائید نہیں ہے، بلکہ یہ بتانا ہے کہ ان کا یہ فیصلہ نیک نیتی پر مبنی تھا، اس لئے کہ وہ یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے، اس کے لئے من جملہ اور دلائل کے ایک دلیل میں نے یہ بھی پیش کی تھی کہ حضرت معاویہؓ نے یہ دُعا فرمائی کہ "یا اللہ! اگر یزید اس منصب کا اہل ہے تو اس کی ولایت کو پورا فرمادے، ورنہ اس کی رُوح قبض کرلے" اس پر گفتگو کرتے ہوئے ملک غلام علی صاحب نے یہ بات تسلیم فرمالی ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

> ان دُعائیہ کلمات سے بھی یزید کی فضیلت و اہلیت ثابت نہیں ہوتی بلکہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ امیر معاویہؓ اپنی رائے میں نیک نیتی کے ساتھ اسے ایسا سمجھتے تھے، لیکن یہ رائے جیسا کہ عرض کیا جاچکا، غلطی اور مبالغے کے احتمال سے خالی نہیں ہوسکتی۔
>
> (ترجمان مارچ ۱۹۷۰ء ص:۲۵)

میری گزارش یہ ہے کہ جو چیز اس دُعا سے بقول آپ کے ثابت نہیں ہوتی، اسے میں نے ثابت کرنا ہی کب چاہا ہے؟ میرا مدعا بھی اس سے زائد کچھ نہیں ہے کہ ''حضرت معاویہؓ اپنی رائے میں نیک نیتی کے ساتھ اسے ایسا سمجھتے تھے'' جہاں تک اس رائے میں ''غلطی اور مبالغے کے احتمال'' کا تعلق ہے، میں نے بھی اس کی تردید نہیں کی، جب ملک صاحب نے حضرت معاویہؓ کو نیک نیت مان لیا تو میرا مقصد حاصل ہوگیا، اب نہ جانے غلام علی صاحب میری کس بات کی تردید فرما رہے ہیں؟ جب یہ بات میرے اور ملک غلام علی صاحب کے درمیان متفق علیہ ہوگئی کہ حضرت معاویہؓ نے یہ فیصلہ نیک نیتی کے ساتھ کیا تھا تو پھر خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ مولانا مودودی صاحب کا مندرجہ ذیل جملہ اس ''نیک نیتی'' میں کس طرح فٹ بیٹھ سکتا ہے کہ:۔

> یزید کی ولی عہدی کے لئے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی، بلکہ ایک بزرگ (حضرت مغیرہ بن شعبہؓ) نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے دُوسرے بزرگ (حضرت معاویہؓ) کے ذاتی مفاد سے اپیل کرکے اس تجویز کو جنم دیا اور دونوں صاحبوں نے اس بات سے قطع نظر کرلیا کہ وہ اس طرح اُمتِ محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں۔

لیکن یہ عجیب و غریب بات ہے کہ جناب غلام علی صاحب ایک طرف تو تسلیم فرماتے ہیں کہ: ''امیر معاویہؓ اپنی رائے میں نیک نیتی کے ساتھ ایسا سمجھتے تھے'' اور دُوسری طرف مولانا مودودی صاحب کی اس عبارت میں کوئی غلطی تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں، مولانا مودودی صاحب کا دفاع کرتے ہوئے انہوں نے جو علمی

نکات بیان فرمائے ہیں وہ نہایت دلچسپ ہیں، فرماتے ہیں کہ: "مولانا مودودی صاحب نے نیت کا لفظ استعمال نہیں کیا جذبے کا لفظ استعمال کیا ہے اور صحیح جذبے کی بنیاد پر نہ ہونا اور کام کرنے والے کا نیک نیت نہ ہونا اور اس کی نیت کا متہم ہونا دونوں صورتیں یکساں نہیں ہیں" کم از کم میری عقل تو اس فرق کو محسوس کرنے سے بالکل عاجز ہے جو ملک صاحب "نیت" اور "جذبہ" میں بیان فرمانا چاہتے ہیں۔ ملک صاحب سے میری پُرخلوص گزارش یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ اس لفظی تأویل میں پڑنے کی بجائے مولانا کو مشورہ دیں کہ وہ مذکورہ عبارت واپس لے لیں۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو نیک نیتی پر محمول کرنے کے بعد ملک غلام علی صاحب نے مولانا مودودی صاحب کے اس قول کی خود بخود تردید کردی، جس میں انہوں نے حضرت معاویہؓ کے فعل کو ذاتی مفاد پر مبنی قرار دیا ہے، اس کے بعد ان کی ساری بحث شدید قسم کے نزاعِ لفظی کے سوا کچھ نہیں، اور میں اس لفظی ہیر پھیر میں اُلجھ کر بلاوجہ اپنا اور قارئین کا وقت ضائع کرنا کسی طرح صحیح نہیں سمجھتا۔

## عدالتِ صحابہؓ

میں نے اپنے مقالے کے آخر میں تین اُصولی مباحث پر گفتگو کی تھی، عدالتِ صحابہؓ، تاریخی روایات کی حیثیت اور حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت کا صحیح مقام۔ ان میں سے آخری دو موضوعات کو تو ملک غلام علی صاحب نے تیرہ قسطیں لکھنے کے بعد "اختصار" کے پیشِ نظر چھوڑ دیا ہے، البتہ عدالتِ صحابہؓ کے مسئلے پر طویل بحث کی ہے۔

جناب ملک صاحب کے اندازِ بحث میں سب سے زیادہ قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ وہ میرے مضمون کے اصل نقطے پر گفتگو کرنے کے بجائے اِدھر اُدھر کی غیر متعلق یا غیر بنیادی باتوں پر اپنا سارا زور صَرف کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ ان کے مضمون میں صفحات کے صفحات پڑھنے کے بعد بھی بنیادی باتیں جوں کی توں تشنہ رہ جاتی ہیں اور ان کے بارے میں آخر تک یہ نہیں کھلتا کہ ان کا موقف کیا ہے؟ اور اگر وہ میری کسی بات پر تبصرہ کرتے ہیں تو اسے سیاق وسباق سے کاٹ کر من مانا مفہوم

پہناتے ہیں اور اس کی مفصل تردید شروع کر دیتے ہیں۔

اسی عدالتِ صحابہؓ کے مسئلے میں، میں نے بحث کو سمیٹنے کے لئے ایک تنقیح قائم کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا کہ صحابہؓ کی عدالت کے عقلاً تین مفہوم ہو سکتے ہیں، مولانا مودودی صاحب نے ''عدالت'' کی جو تشریح کی ہے،(۱) اس سے یہ بات صاف نہیں ہوتی کہ وہ کون سے مفہوم کو دُرست سمجھتے ہیں، لہٰذا انہیں اور ان کا دفاع کرنے والے حضرات کو چاہئے کہ وہ صاف طریقے سے یہ واضح کریں کہ عدالت کی ان تشریحات میں سے کون سی تشریح ان کے نزدیک دُرست ہے؟ اور اگر وہ ان تینوں کو دُرست نہیں سمجھتے تو دلائل کے ساتھ ان کی تردید کر کے ان تینوں کے علاوہ کوئی چوتھی تشریح پیش کریں۔

جناب غلام علی صاحب نے عدالتِ صحابہؓ کے مسئلے پر پینتالیس صفحے لکھے ہیں اور ان میں بعض بالکل غیر متعلق باتوں پر کئی کئی ورق خرچ کئے ہیں، مگر آخر تک میرے اس سوال کا واضح جواب نہیں دیا کہ ''عدالت'' کے ان تین معانی میں سے کون سا مفہوم ان کے نزدیک دُرست ہے؟ عدالتِ صحابہؓ کے میں نے تین مفہوم بیان کئے تھے:-

۱- صحابہ کرامؓ معصوم اور غلطیوں سے پاک ہیں۔

۲- صحابہ کرامؓ اپنی عملی زندگی میں (معاذ اللہ) فاسق ہو سکتے ہیں، لیکن روایتِ حدیث کے معاملے میں وہ بالکل عادل ہیں۔

۳- صحابہ کرامؓ نہ تو معصوم تھے اور نہ فاسق، یہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کسی سے بعض مرتبہ بتقاضائے بشریت ''دو ایک یا چند'' غلطیاں سرزد ہو گئی ہوں، لیکن تنبہ

---

(۱) مولانا مودودی نے ''عدالت'' کی تشریح یہ کی ہے: ''میں الصحابۃ کلھم عدول کا مطلب یہ نہیں لیتا کہ تمام صحابہؓ بے خطا تھے اور ان میں کا ہر ایک فرد ہر قسم کی بشری کمزوریوں سے پاک تھا اور ان میں سے کسی نے کبھی کوئی غلطی نہیں کی ہے، بلکہ میں اس کا مطلب یہ لیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے یا آپؐ کی طرف کوئی بات منسوب کرنے میں کسی صحابی نے کبھی راستی سے ہرگز تجاوز نہیں کیا ہے۔''

کے بعد انہوں نے توبہ کرلی اور اللہ نے انہیں معاف فرمادیا، اس لئے وہ ان غلطیوں کی بناء پر فاسق نہیں ہوئے، چنانچہ یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی صحابی نے گناہوں کو اپنی ''پالیسی'' بنالیا ہو جس کی وجہ سے اسے فاسق قرار دیا جاسکے۔

میں نے لکھا تھا کہ: ''اصل سوال یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب ان میں سے کون سا مفہوم دُرست سمجھتے ہیں؟'' پہلا تو ظاہر ہے، کسی کا مسلک نہیں، اب آخری دو مفہوم رہ جاتے ہیں، مولانا نے یہ بات صاف نہیں کی کہ ان کی مراد کون سا مفہوم ہے؟ اس کے بعد میں نے لکھا تھا کہ:۔

> اگر ان کی مراد دُوسرا مفہوم ہے یعنی یہ کہ صحابہ کرامؓ صرف روایتِ حدیث کی حد تک عادل ہیں، ورنہ اپنی عملی زندگی میں وہ (معاذ اللہ) فاسق و فاجر بھی ہوسکتے ہیں، تو یہ بات ناقابلِ بیان حد تک خطرناک ہے..... اور اگر مولانا مودودی صاحب عدالتِ صحابہؓ کو تیسرے مفہوم میں دُرست سمجھتے ہیں، جیسا کہ ان کی اُوپر نقل کی ہوئی ایک عبارت سے معلوم ہوتا ہے، سو یہ مفہوم جمہور اہلِ سنت کے نزدیک دُرست ہے، لیکن حضرت معاویہؓ پر انہوں نے جو اعتراضات کئے ہیں، اگر ان کو دُرست مان لیا جائے تو ''عدالت'' کا یہ مفہوم ان پر صادق نہیں آسکتا۔
>
> (البلاغ رجب ۱۳۸۹ھ ص:۱۱)

میری اس عبارت سے صاف واضح ہے کہ میں نے عدالت کا کوئی مفہوم مولانا مودودی صاحب کی طرف متعین طور سے منسوب نہیں کیا، لیکن ملک غلام علی صاحب تحریر فرماتے ہیں:۔

> مدیر البلاغ کا کارنامہ ملاحظہ ہو کہ توجیہ القول بما لا یرضیٰ قائلہ سے کام لیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر مولانا مودودی کا یہ مفہوم ہے کہ صحابہ کرامؓ صرف روایتِ حدیث کی حد تک عادل ہیں، ورنہ اپنی عملی زندگی میں وہ (معاذ اللہ) فاسق فاجر بھی ہوسکتے

ہیں تو یہ بات ناقابلِ بیان حد تک غلط اور خطرناک ہے .....
غضب یہ ہے کہ مولانا عثمانی صاحب بناء الفاسد علی الفاسد کے
اُصول پر پہلے تو مولانا مودودی کے منہ میں زبردستی یہ الفاظ ٹھونستے
ہیں کہ صحابہ کرامؓ اپنی عملی زندگی میں فاسق و فاجر ہو سکتے ہیں اور
پھر اس فاسد اور فرضی بنیاد پر دُوسرا رَدّا یہ جماتے ہیں کہ .... الخ۔

میری اُوپر کی عبارت پڑھیئے، پھر اس پر ملک صاحب کا تبصرہ، بالخصوص خط کشیدہ جملہ دیکھئے اور ہمارے فاضل تبصرہ نگار کے عدل و انصاف، علمی دیانت اور فنِ مناظرہ کی داد دیجئے، میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ مولانا مودودی صاحب نے یہ بات صاف نہیں کی وہ "عدالت" کے کون سے مفہوم کو دُرست سمجھتے ہیں؟ وہ متعین کر کے بتائیں کہ ان میں سے کون سی تشریح ان کے نزدیک صحیح ہے؟ پھر ہر تشریح سے پیدا ہونے والے مسائل کا الگ الگ ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھ رہا ہوں کہ مولانا مودودی کی ایک عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تیسرے مفہوم کی طرف مائل ہیں، مگر ملک صاحب آگے پیچھے کی تمام باتوں کو چھوڑ کر صرف بیچ کا ایک جملہ نقل کر کے اپنے قارئین کو یہ باور کراتے ہیں کہ عدالت کا دُوسرا مفہوم میں نے "زبردستی مولانا مودودی صاحب کے منہ میں ٹھونس دیا ہے" خدا جانے ملک صاحب کے نزدیک مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ کا کوئی مطلب ہے یا نہیں؟

اس طرزِ عمل کا آخرت میں وہ کیا جواب دیں گے؟ یہ تو وہ خود ہی بہتر جانتے ہوں گے، بہرحال! اس سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ عدالت کے دُوسرے مفہوم کو وہ دُرست نہیں سمجھتے۔

اب صرف تیسرا مفہوم باقی رہ گیا، میں نے اپنے طور پر اسی مفہوم کو صحیح اور جمہور اہلِ سنت کا مسلک قرار دیا تھا، ملک غلام علی صاحب پہلے تو اس کو "سراسر غلط اور بے دلیل موقف" قرار دیتے ہیں (ترجمان، اپریل ۱۹۷۰ء ص:۴۳) لیکن ایک مہینے کے بعد آگے چل کر لکھتے ہیں کہ: "تاہم مولانا مودودی کی کوئی تحریر عدالت کی اس تعریف سے بھی متصادم نہیں ہے" (ترجمان، مئی ۱۹۷۰ء ص:۴۴)۔ یہاں پہلا سوال تو یہ ہے کہ

اگر یہ تعریف ''سراسر غلط اور بے دلیل'' ہے تو مولانا مودودی کی کوئی تحریر اس سے متصادم کیوں نہیں؟ مولانا نے ''عدالت'' کی جو تعریف کی ہے، اس کے بارے میں جناب غلام علی صاحب نے لکھا ہے: ''عدالتِ صحابہؓ کی اس سے بہتر اور محکم تر تعریف اور نہیں ہوسکتی'' (ترجمان، اپریل ص:۴۷) اب یہ عجیب و غریب ''بہتر اور محکم تر تعریف'' جو ایک ''سراسر غلط اور بے دلیل موقف'' کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور اس سے متصادم نہیں ہوتی؟

دُوسرا سوال یہ ہے کہ اگر یہ تیسرا مفہوم بھی آپ کے نزدیک سراسر غلط اور بے دلیل ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نے ''عدالت'' کی جو تین تشریحات پیش کی تھیں وہ تینوں آپ کے نزدیک غلط ہوگئیں، اب آپ کا فرض تھا کہ کوئی چوتھی تشریح خود پیش کر کے حضرت معاویہؓ کو اس پر منطبق فرماتے، لیکن پورے مضمون میں آپ نے ان کے علاوہ کوئی اور مفہوم بھی پیش نہیں کیا۔ ملک صاحب شاید اس کے جواب میں یہ فرمائیں کہ مولانا مودودی صاحب کے الفاظ میں عدالت کی جو تشریح انہوں نے نقل کی ہے، وہی چوتھی تشریح ہے، لیکن میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ وہ تشریح مجمل ہے، اس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ روایتِ حدیث میں تمام صحابہؓ عادل اور راست باز تھے، لیکن عام عملی زندگی میں بھی وہ عادل تھے یا نہیں؟ یہ بات صاف نہیں ہے، اسی بات کو صاف کرنے کے لئے میں نے یہ تین تنقیحات قائم کی تھیں، جن کا حاصل یہ تھا کہ عام عملی زندگی کے اعتبار سے کسی صحابی کو فاسق کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ آپ نے اس احتمال کو بھی رَدّ کر دیا کہ انہیں فاسق کہا جاسکتا ہے، اور اس احتمال کو بھی کہ انہیں فاسق نہیں کہا جاسکتا، اس ''ارتفاعِ نقیضین'' کا ارتکاب کرنے کے بعد خدارا یہ تو بتایئے کہ آپ کا موقف ہے کیا؟

میں نے اپنے سابقہ مقالے میں عرض کیا تھا کہ مولانا مودودی صاحب کی ایک عبارت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ عام عملی زندگی میں بھی کسی صحابی کو فاسق قرار دینا دُرست نہیں سمجھتے، بلکہ میری بیان کردہ تیسری تشریح کے مطابق یہ کہتے ہیں کہ: ''کسی شخص کے ایک دو یا چند معاملات میں عدالت کے منافی کام کر گزرنے سے یہ

لازم نہیں آتا کہ اس کی عدالت کی کلی نفی ہو جائے اور وہ عادل کے بجائے فاسق قرار پائے'' اس بات کو دُرست مانتے ہوئے میں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ مولانا مودودی نے جو الزامات حضرت معاویہؓ پر عائد کئے ہیں، انہیں ''ایک دو یا چند معاملات'' سے تعبیر کرنا دُرست نہیں، اگر مولانا مودودی کے عائد کئے ہوئے تمام الزامات دُرست مان لئے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ نے رِشوت، جھوٹ، مکر و فریب، قتلِ ناحق، اجرائے بدعت، مالِ غنیمت میں خیانت، جھوٹی گواہی، جھوٹا نسب بیان کرنا اور اعانتِ ظلم جیسے کبیرہ گناہوں کا صرف ارتکاب ہی نہیں کیا بلکہ ان کو باقاعدہ ''پالیسی'' بنالیا تھا، اس لئے اسے ''ایک دو یا چند گناہ کر گزرنے'' سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، آج اگر کوئی شخص ان تمام گناہوں کو اپنی ''پالیسی'' بنالے تو خواہ وہ ساری رات تہجد پڑھنے میں گزارتا ہو، اسے فاسق ضرور کہا جائے گا، لٰہذا یا تو یہ کہئے کہ (معاذ اللہ) حضرت معاویہؓ بھی فاسق تھے، یا پھر یہ مانئے کہ جو الزامات ان پر مولانا مودودی صاحب نے عائد کئے ہیں، وہ دُرست نہیں ہیں۔

میرے اس اعتراض کے جواب میں ملک غلام علی صاحب نے حسبِ عادت خلطِ مبحث کا ارتکاب کرتے ہوئے پہلے تو ان تمام الزامات کو ازسرِنو برحق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور پھر آخر میں لکھا ہے:-

> میں عزیزم محمد تقی صاحب عثمانی سے کہتا ہوں کہ آپ کے پاس جو ''خلافت وملوکیت'' کا نسخہ ہے، آپ چاہیں تو اس میں ''ایک دو یا چند'' کے بجائے گیارہ یا اس سے اُوپر کا کوئی عدد درج کرلیں، فقرہ اپنی جگہ پھر بھی صحیح اور بے غبار رہے گا۔

میرے ''بزرگوار محترم'' مطمئن ہیں کہ اپنے اس ''مشفقانہ'' مشورے کے بعد انہوں نے میرے اعتراض کا جواب دے دیا ہے، چنانچہ آگے وہ دُوسری غیر متعلق بات شروع کردیتے ہیں، اب اگر کوئی ''بے ادب'' یہ سوال کرنے لگے کہ رِشوت، جھوٹ، مکر وفریب، صلحاء کا قتل، اجرائے بدعت، مالِ غنیمت میں خردبُرد، جھوٹی گواہی، جھوٹی نسبت اور اس جیسے بہت سے گناہوں کو ''پالیسی'' بنالینے والا فاسق کیوں نہیں

ہوتا؟ تو یہ اس کی صریح نالائقی اور قربِ قیامت کی علامت ہے کہ وہ بزرگوں کی بات کیوں بے چوں و چرا نہیں مانتا؟

## حضرت معاویہؓ اور فسق و بغاوت

ملک غلام علی صاحب لکھتے ہیں:۔

> مولانا مودودی نے تو فسق یا فاسق کے الفاظ امیر معاویہؓ کے حق میں استعمال نہیں کیے، لیکن آپ چاہیں تو میں اہلِ سنت کے چوٹی کے علماء کی نشاندہی کرسکتا ہوں جنھوں نے یہ الفاظ بھی کہے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے اہلِ سنت کے دو عالموں کی عبارتیں پیش کی ہیں، ایک حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی اور دُوسری میر سیّد شریف جرجانیؒ کی۔ ضروری ہے کہ اس غلط فہمی کو بھی رفع کیا جائے جو ان عبارتوں کے نقل کرنے سے پیدا کی گئی ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی عبارت یہ ہے جس میں وہ حضرت معاویہؓ کے بارے میں جنگِ صفّین وغیرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> پس نہایت کارش ایں است کہ مرتکب کبیرہ و باغی باشد والفاسق لیس بأھل اللعن۔ (فتاویٰ عزیزی، رحیمیہ دیوبند ص:۱۷۷)

اس میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں شاہ صاحبؒ اصل میں اس مسئلے پر گفتگو فرما رہے ہیں کہ حضرت معاویہؓ پر لعن طعن جائز نہیں، اس ذیل میں وہ کہتے ہیں کہ: ''ان کے بارے میں انتہائی بات یہ ہے کہ وہ مرتکبِ کبیرہ اور باغی ہوں، اور فاسق لعنت کے لائق نہیں ہوتا'' اس میں وہ اپنا مسلک بیان نہیں کررہے کہ معاذ اللہ وہ واقعۃً باغی اور فاسق تھے، بلکہ علیٰ سبیل التسلیم یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر انہیں فاسق بھی مان لیا جائے تب بھی ان پر لعن طعن جائز نہیں۔ دُوسرے واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اپنی تصانیف میں اس مسئلے سے متعلق اپنی جو آراء ظاہر کی ہیں وہ بڑی حد تک پیچیدہ، مجمل اور بظاہرِ نظر متضاد معلوم ہوتی ہیں، اور جب تک اس مسئلے میں ان کی مختلف عبارتیں سامنے نہ ہوں اس وقت تک ان کی مراد کو

ٹھیک ٹھیک سمجھا نہیں جا سکتا، میں سمجھتا ہوں کہ ان کے صحیح منشاء کو سمجھنے کے لئے "تحفہ اثنا عشریہ" کی مندرجہ ذیل عبارت بڑی حد تک مفید ہوگی:۔

> اب حضرت مرتضٰی سے لڑنے والا اگر ازراہِ بغض و عداوت لڑتا ہے تو یہ علمائے اہلِ سنت کے نزدیک بھی کافر ہے، اس پر سب کا اجماع ہے ..... اور شبہ فاسدہ اور تاویلِ باطل کی بناء پر، نہ نیتِ عداوت و بغض سے، حضرت سے لڑنے والا مثلاً اصحابِ جمل اور اصحابِ صفّین تو یہ خطائے اجتہادی اور بطلانِ اعتقادی میں مشترک ہیں، فرق اتنا ہے کہ اصحابِ جمل کی یہ خطائے اجتہادی اور فسقِ اعتقادی تحقیر کو جائز نہیں کرتا۔ (اس کی وجوہ بیان کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں) مثلاً حضرت موسیٰؑ کی عصمت و علوّ مرتبہ پر جو نصوصِ قرآنیہ قطعیہ وارِد ہیں وہ اس عمل پر آپ پر طعن کرنے یا آپ کی تحقیر کرنے سے مانع ہوئی جو آپ کے بھائی کے بارے میں آپ سے سرزد ہوا، صرف بے تأملی اور عجلت کی بناء پر، ورنہ یہ سب کچھ للہ فی اللہ تھا، نہ شیطان کے وسوسہ سے، حاشا جنابہ من ذٰلک۔
>
> اور اصحابِ صفّین کے بارے میں چونکہ یہ اُمور بالقطع ثابت نہیں ہیں اس لئے توقف وسکوت لازمی ہے ان آیات واحادیث کے عموم پر نظر رکھتے ہوئے جو فضائلِ صحابہؓ میں وارِد ہیں، بلکہ تمام مؤمنین کے فضائل میں ان کی نجات اور ان کی شفاعت کی اُمید پروردگار سے رکھنے کا حکم ظاہر کرتی ہیں، اگر جماعتِ اہلِ شام میں سے ہم بالیقین کسی کے متعلق جان لیں کہ وہ حضرت امیر (علیؓ) کے ساتھ عداوت و بغض رکھتا تھا تا آنکہ آپ کو کافر ٹھہراتا، یا آنجناب علی قباب پر سبّ وطعن کرتا تو اس کو ہم یقیناً کافر جانیں گے۔ جب یہ بات معتبر روایات سے پایۂ ثبوت کو

نہیں پہنچی اور ان کا اصل ایمان بالیقین ثابت ہے تو ہم تمسک اصل ایمان سے کریں گے۔ (۱)

اس عبارت میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اصحابِ جمل و اصحابِ صفّین کے بارے میں بیک وقت "خطائے اجتہادی" کا لفظ بھی استعمال فرمایا ہے اور "فسقِ اعتقادی" کا بھی، بظاہرِ نظر اس میں تضاد معلوم ہوتا ہے، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ عبارت اور اس نوع کی بعض دُوسری عبارتیں بنظرِ غائر پڑھنے کے بعد میں ان کا موقف یہ سمجھا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت چونکہ نہایت مضبوط دلائل سے منعقد ہوچکی تھی اس لئے حضرت عائشہؓ یا حضرت معاویہؓ کا ان کے خلاف قتال کرنا بلاشبہ غلط تھا، اور دُنیوی اَحکام کے اعتبار سے بغاوت کے ذیل میں آتا تھا جو نفس الامر کے لحاظ سے گناہِ کبیرہ یعنی فسق ہے، اسی لئے حضرت علیؓ کا ان سے جنگ لڑنا جائز اور برحق تھا، لیکن چونکہ حضرت عائشہؓ ہوں یا حضرت معاویہؓ، دونوں سے یہ عمل حضرت علیؓ کی عداوت یا بغض کی وجہ سے نہیں، بلکہ شبہ اور تاویل کی بناء پر صادر ہوا تھا، اور بہرحال وہ بھی اپنے پاس دلائل رکھتے تھے جو غلط فہمی پر مبنی سہی، لیکن دیانت دارانہ تھے، اس لئے اُخروی اَحکام کے اعتبار سے ان کا یہ عمل اجتہادی غلطی کے ذیل میں آتا ہے، اسی لئے ان پر طعن کرنا جائز نہیں۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ذبیحہ پر جان بوجھ کر بسم اللہ چھوڑ کر اسے مار دینا اور پھر اسے کھانا دلائلِ قطعیہ کی بناء پر گناہِ کبیرہ ہے، لیکن اِمام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اُپنے اجتہاد سے اسے جائز سمجھا ہے، اس لئے اگر کوئی شافعی المسلک انسان اسے کھالے تو اس کا یہ عمل دلائلِ شرعیہ کی رُو سے گناہِ کبیرہ اور فسق ہے لیکن چونکہ وہ دیانت دارانہ اجتہاد کی بنیاد پر صادر ہوا، اس لئے اس شخص کو فاسق نہیں کہا جائے گا۔ اسی طرح کسی اِمامِ برحق کے خلاف بغاوت کرنا گناہِ کبیرہ اور فسق ہے، لیکن جیسا کہ

---

(۱) تحفہ اثنا عشریہ ص:۶۱۳، مطبوعہ ولی محمد اینڈ سنز کراچی، اس عبارت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے نزدیک حضرت معاویہؓ کا حضرت علیؓ پر سب وطعن کرنا معتبر روایات سے ثابت نہیں۔

ہم نے حضرت حجر بن عدیؓ کے مسئلے میں علامہ ابنِ قدامہؒ کے حوالے سے لکھا ہے، اگر کوئی شخص جو اجتہاد کی اہلیت رکھتا ہے اپنے دیانت دارانہ اجتہاد کی رُو سے اسے جائز سمجھتا ہو، تو اس کی بناء پر وہ فاسق نہیں ہوتا، بلکہ اس کی غلطی کو خطائے اجتہادی کہا جاتا ہے۔

میں نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی تحریروں پر جتنا غور کیا ہے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ انہوں نے حضرت معاویہؓ اور حضرت عائشہؓ کے خروج کے لئے جو ''فسقِ اعتقادی'' کا لفظ استعمال کیا ہے، اس سے مراد یہی ہے کہ بغاوت فی نفسہٖ فسق ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ اس کی بناء پر (نعوذ باللہ) یہ حضرات فاسق ہوگئے، بلکہ چونکہ ان کی جانب سے اس فعل کا صدور نیک نیتی کے ساتھ اجتہاد کی بنیاد پر ہوا، اور یہ حضرات اجتہاد کے اہل بھی تھے، اور اپنے موقف کی ایک بنیاد رکھتے تھے، اس لئے یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر حضرت شاہ صاحبؒ کا منشاء یہ ہوتا کہ وہ واقعۃً حضرت معاویہؓ یا حضرت عائشہؓ کو (معاذ اللہ) اس خروج کی بناء پر فاسق قرار دیں، جیسا کہ ملک غلام صاحب نے سمجھا ہے، تو پھر وہ اپنی مذکورہ عبارت میں اسے ''خطائے اجتہادی'' سے کیوں تعبیر کرتے ہیں؟

اور میرے نزدیک یہی مراد ان ''كثير من أصحابنا'' کی بھی ہے جن کا قول میر سیّد شریف جرجانیؒ نے شرح مواقف میں نقل کیا ہے، کیونکہ انہوں نے تفسیق کی نسبت خطا کی طرف کی ہے، حضرت معاویہؓ کی طرف نہیں، اور یہ بات اہلِ علم سے مخفی نہیں ہے کہ کسی فعل کا فسق ہونا اس کے فاعل کے فاسق ہونے کو مستلزم نہیں ہے، اجتہادی اختلاف میں ایک شخص کا عمل دُوسرے کے نظریے کے مطابق فسق ہوتا ہے، لیکن اسے فاسق نہیں کہا جاتا، جیسے ذبیحہ کی مثال میں عرض کیا جاچکا ہے، ورنہ اگر یہ بات مراد نہیں ہے تو میر سیّد شریف رحمہ اللہ تو کثیر من أصحابنا کہہ رہے ہیں، کوئی شخص اہلِ سنت کے کسی ایک عالم کا قول کہیں دِکھلائے جس نے حضرت معاویہؓ یا حضرت عائشہؓ کو جنگِ صفّین وجمل کی بناء پر فاسق قرار دیا ہو۔

اور اگر میرا یہ خیال غلط ہے، اور ان کا منشاء یہی ہے کہ حضرت عائشہؓ،

حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمر بن عاصؓ جیسے صحابہ کرامؓ حضرت علیؓ سے محاربہ کرنے کی بناء پر (معاذ اللہ) فاسق ہوگئے تھے، تو ان کی یہ بات بلاشک و شبہ غلط اور جمہور اُمتِ مسلمہ کے مُسلّمات کے قطعی خلاف ہے، میں اپنے سابقہ مضمون کے آخر میں حوالوں کے ساتھ لکھ چکا ہوں کہ ساری اُمت از اوّل تا آخر ان حضرات کی اس غلطی کو اجتہادی غلطی قرار دیتی آئی ہے، اہلِ سنت کی عقائد و کلام کی کتابیں ان تصریحات سے بھری ہوئی ہیں، اور ان میں سے کسی نے بھی اس بناء پر ان حضرات کو فاسق قرار دینے کی جرأت نہیں کی، اگر بفرضِ محال شاہ عبدالعزیزؒ یا میر سیّد شریف جرجانیؒ واقعۃً اس کے خلاف کوئی رائے ظاہر کرتے ہیں تو جمہور اُمت کے مقابلے میں ان کا قول ہرگز مقبول نہیں ہوگا۔

## جنگِ صفّین کے فریقین کی صحیح حیثیت

حضرت معاویہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے حضرت علیؓ سے جو جنگیں لڑیں، ان سے حضرت علیؓ سے زیادہ کون متاثر ہوسکتا ہے، لیکن بزعمِ خود حضرت علیؓ سے محبت رکھنے والے غور سے سنیں کہ وہ حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ چنانچہ حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے شارحِ مواقف کی سخت تردید کی ہے۔ (مکتوب:۲۵۱، ج:۲ ص:۶۷، لاہور)

حضرت اسحاق بن راہویہؒ حدیث و فقہ کے مشہور اِمام ہیں، وہ اپنی سند سے روایت کرتے ہیں:-

سمع علی یوم الجمل ویوم الصفین رجلًا یغلو فی القول فقال: لا تقولوا إلا خیرًا إنما ہم قوم زعموا أنا بغینا علیہم وزعمنا أنہم بغوا علینا فقاتلناہم۔[1]

---

(۱) ابنِ تیمیہؒ: منہاج السنۃ ج:۳ ص:۶۱، بولاق، مصر ۱۳۲۲ھ۔ حضرت مجدّد الف ثانی رحمہ اللہ نے اس قول میں یہ الفاظ بھی نقل کئے ہیں کہ: "لیسوا کفرۃ ولا فسقۃ" (یہ نہ کافر ہیں اور نہ فاسق) مکتوبات، مکتوب:۹۶ ج:۷ ص:۱۱۰۔

ترجمہ:- حضرت علیؓ نے جنگِ جمل و صفین کے موقع پر ایک شخص کو سنا کہ وہ (مقابل لشکر والوں کے حق میں) تشدّد آمیز باتیں کہہ رہا ہے، اس پر آپ نے فرمایا کہ: ان حضرات کے بارے میں کلمۂ خیر کے سوا کوئی بات نہ کہو، دراصل ان حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ ہم نے اُن کے خلاف بغاوت کی ہے اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے، اس بناء پر ہم ان سے لڑتے ہیں۔

اور علامہ ابنِ خلدونؒ وغیرہ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں قتل ہونے والوں کا انجام کیا ہوگا؟ حضرت علیؓ نے دونوں فریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:-

لا یموتن أحد من ھؤلاء وقلبه نقی إلا دخل الجنة.[۱]

ترجمہ:- ان میں سے جو شخص بھی صفائی قلب کے ساتھ مرا ہوگا وہ جنت میں جائے گا۔

حضرت علیؓ کے ان ارشادات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ خود ان کے نزدیک بھی حضرت معاویہؓ اور حضرت عائشہؓ سے ان کا اختلاف اجتہادی اختلاف تھا، اور وہ نہ صرف یہ کہ انہیں اس بناء پر فاسق نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کے حق میں کلماتِ خیر کے سوا کسی بات کے روادار نہ تھے۔ دُوسری طرف حضرت معاویہؓ قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ: ''علیؓ مجھ سے بہتر اور مجھ سے افضل ہیں اور میرا ان سے اختلاف صرف حضرت عثمانؓ کے قصاص کے مسئلے میں ہے، اور اگر وہ خونِ عثمانؓ کا قصاص لے لیں تو اہلِ شام میں ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والا سب سے پہلے میں ہوں گا۔''[۲] اسی طرح جب قیصرِ رُوم مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی سے فائدہ اُٹھا کر ان پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے اور حضرت معاویہؓ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے تو یہ اسے خط میں

---

(۱) ابن خلدونؒ: مقدمة ص:۳۸۵ فصل:۳۰، دار الکتاب اللبنانی، بیروت ۱۹۵۶ء۔

(۲) ابن کثیرؒ: البدایة والنهایة ج:۷ ص:۱۲۹، وج:۸ ص:۲۵۹۔

تحریر فرماتے ہیں کہ: ''اگر تم نے اپنا ارادہ پورا کرنے کی ٹھان لی تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اپنے ساتھی (حضرت علیؓ) سے صلح کرلوں گا، پھر تمہارے خلاف ان کا جو لشکر روانہ ہوگا اس کے ہراوَل دستے میں شامل ہوکر قسطنطنیہ کو جلا ہوا کوئلہ بنا دُوں گا اور تمہاری حکومت کو گاجر مولی کی طرح اُکھاڑ پھینکوں گا''۔ (۱)

حقیقت یہ ہے کہ ان حضراتِ صحابہؓ کی یہ باہمی لڑائیاں اقتدار کی خاطر نہیں تھیں، اور نہ ان کا اختلاف آج کی سیاسی پارٹیوں کا سا اختلاف تھا، دونوں فریق دِین ہی کی سربلندی چاہتے تھے، ہر ایک کا دُوسرے سے نزاع دِین ہی کے تحفظ کے لئے تھا، اور یہ خود ایک دُوسرے کے بارے میں بھی یہی جانتے اور سمجھتے تھے کہ ان کا موقف دیانت دارانہ اجتہاد پر مبنی ہے، چنانچہ ہر فریق دُوسرے کو رائے اور اجتہاد میں غلطی پر سمجھتا تھا، لیکن کسی کو فاسق قرار نہیں دیتا تھا، یہی وجہ ہے کہ شاید دُنیا کی تاریخ میں یہ ایک ہی جنگ ہو جس میں دن کے وقت فریقین میں جنگ ہوتی اور رات کے وقت ایک لشکر کے لوگ دُوسرے لشکر میں جاکر ان کے مقتولین کی تجہیز و تکفین میں حصہ لیا کرتے تھے۔ (۲)

اور خود سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی طرف رُجوع کرکے آپؐ کے ارشادات میں یہ بات تلاش کیجئے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی جنگ آپؐ کے نزدیک کیا حیثیت رکھتی تھی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی متعدّد احادیث میں اس جنگ کی طرف اشارے دیئے ہیں، اور ان سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اس جنگ کو اجتہاد پر مبنی قرار دے رہے ہیں۔

صحیح مسلم اور مسندِ احمد میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعدّد صحیح سندوں کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ:-

---

(۱) الزبیدیؒ: تاج العروس ج:۷ ص:۲۰۸، دار لیبیا بنغازی، ''اصطفلین''۔

(۲) البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۲۷۷، اس قسم کے مزید ایمان افروز واقعات کے لئے دیکھئے: تہذیب تاریخ ابنِ عساکر ج:۱ ص:۴۷۔

تمرق مارقة عند فرقة من المسلمين تقتلهم أولى الطائفتين بالحق.(۱)

ترجمہ:- مسلمانوں کے باہمی اختلاف کے وقت ایک گروہ (اُمت سے) نکل جائے گا اور اس کو وہ گروہ قتل کرے گا جو مسلمانوں کے دونوں گروہوں میں حق سے زیادہ قریب ہوگا۔

اس حدیث میں اُمت سے نکل جانے والے فرقے سے مراد باتفاق خوارج ہیں، انہیں حضرت علیؓ کی جماعت نے قتل کیا جن کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے "أولی الطائفتین بالحق" (دو گروہوں میں حق سے زیادہ قریب) فرمایا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا اختلاف کھلا حق و باطل کا اختلاف نہیں ہوگا، بلکہ اجتہاد اور رائے کی دونوں جانب گنجائش ہوسکتی ہے، البتہ حضرت علیؓ کی جماعت حق سے نسبتاً زیادہ قریب ہوگی، اگر آپؐ کی مراد یہ نہ ہوتی تو حضرت علیؓ کی جماعت کو "حق سے زیادہ قریب" کے بجائے محض "برحق جماعت" کہا جاتا۔

اسی طرح صحیح بخاری، صحیح مسلم اور حدیث کی متعدّد کتابوں میں نہایت مضبوط سند کے ساتھ یہ حدیث آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

لا تقوم الساعة حتّٰى تقتل فئتان عظيمتان تكون بينهما مقتلة عظيمة دعواها واحدة.

ترجمہ:- قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ (مسلمانوں کی) دو عظیم جماعتیں آپس میں قتال نہ کریں، ان کے درمیان زبردست خونریزی ہوگی حالانکہ دونوں کی دعوت ایک ہوگی۔

علماء نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں دو عظیم جماعتوں سے مراد حضرت علیؓ

---

(۱) ایضاً ج:۷ ص:۲۷۸۔

اور حضرت معاویہؓ کی جماعتیں ہیں، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کی دعوت کو ایک قرار دیا ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے بھی پیشِ نظر طلبِ اقتدار نہیں تھا بلکہ دونوں اسلام ہی کی دعوت کو لے کر کھڑی ہوئی تھیں اور اپنی اپنی رائے کے مطابق دِین ہی کی بھلائی چاہتی تھیں۔(۱)

یہی وجہ ہے کہ جنگِ صفّین کے موقع پر صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت پر یہ واضح نہ ہوسکا کہ حق کس جانب ہے؟ اس لئے وہ مکمل طور پر غیر جانبدار رہے، بلکہ اِمام محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کا تو کہنا یہ ہے کہ صحابہؓ کی اکثریت اس جنگ میں شریک نہیں تھی، اِمام احمدؒ نے نہایت صحیح سند کے ساتھ ان کا یہ قول نقل کیا ہے:-

هاجت الفتنة وأصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم عشرات الألوف فلم يحضرها منهم مائة بل لم يبلغوا ثلاثين.(۲)

ترجمہ:- جس وقت فتنہ برپا ہوا تو صحابہ کرامؓ دسیوں ہزار کی تعداد میں موجود تھے، لیکن ان میں سے سو بھی اس میں شریک نہیں ہوئے، بلکہ صحابہؓ میں سے شرکاء کی تعداد تیس تک بھی نہیں پہنچی۔

نیز اِمام احمدؒ ہی روایت کرتے ہیں کہ اِمام شعبہؒ کے سامنے کسی نے کہا کہ ابوشبہ نے حکم کی طرف منسوب کرکے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جنگِ صفّین میں ستر بدری صحابہؓ شامل تھے، حضرت شعبہؒ نے فرمایا کہ ابوشبہ نے جھوٹ کہا، خدا کی قسم اس معاملے میں میرا اور حکم کا مذاکرہ ہوا تھا، تو ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ صفّین کی جنگ میں بدری صحابہؓ میں سے سوائے حضرت خزیمہ بن ثابتؓ کے کوئی شریک نہیں ہوا۔ (منہاج السنۃ بحوالہ بالا)

سوال یہ ہے کہ اگر حضرت معاویہؓ کا موقف صراحۃً باطل اور معاذ اللہ "فسق" تھا تو صحابہؓ کی اتنی بڑی تعداد نے کھل کر حضرت علیؓ کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ اگر وہ

---

(۱) نوویؒ: شرح مسلم ج:۲ ص:۳۹۰، اصح المطابع کراچی۔

(۲) ابنِ تیمیہؒ اس روایت کی سند نقل کرکے لکھتے ہیں: "هذا الاسناد أصح إسناد على وجه الأرض" (یہ سند رُوئے زمین پر صحیح ترین سند ہے) منہاج السنۃ (ج:۳ ص:۱۸۶)۔

صراحۃً برسرِ بغاوت تھے تو قرآنِ کریم کا یہ حکم کھلا ہوا تھا کہ ان سے قتال کیا جائے، پھر صحابہؓ کی اکثریت نے اس قرآنی حکم کو کیوں پسِ پشت ڈال دیا؟ حافظ ابنِ کثیرؒ نے بھی مذکورہ دو حدیثیں اپنی تاریخ میں نقل کر کے لکھا ہے:-

وفيه أن أصحاب على أدنى الطائفتين إلى الحق وهٰذا هو مذهب أهل السُّنّة والجماعة أن عليًّا هو المصيب وإن كان معاوية مجتهدًا وهو مأجور إن شاء الله.(۱)

ترجمہ:- اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ حضرت علیؓ کے اصحاب دونوں جماعتوں میں حق سے زیادہ قریب تھے، اور یہی اہلِ سنت والجماعت کا مسلک ہے کہ حضرت علیؓ برحق تھے، اگرچہ حضرت معاویہؓ مجتہد تھے، اور اِن شاء اللہ اس اجتہاد پر انہیں بھی ثواب ملے گا۔

شیخ الاسلام محی الدین نووی رحمۃ اللہ علیہ اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کتنے واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:-

مذهب أهل السنة والحق إحسان الظن بهم والإمساك عما شجر بينهم وتأويل قتالهم وأنهم مجتهدون متأولون لم يقصدوا معصية ولا محض الدنيا بل اعتقد كل فريق أنه المحق ومخالفه باغ فوجب عليه قتاله ليرجع إلى أمر الله وكان بعضهم مصيبًا وبعضهم مخطئًا معذورًا فى الخطا لأنه باجتهاد والمجتهد إذا خطأ لا إثم عليه وكان على رضى الله عنه هو المحق المصيب فى ذلك الحروب هٰذا مذهب أهل السُّنّة وكانت القضايا مشتبهة حتّٰى أن جماعة من الصحابة تحيروا فيها

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج:۷ ص:۲۷۹۔

فاعتزلوا الطائفتين ولم يقاتلوا ولو تيقنوا الصواب لم يتأخروا عن مساعدته.(۱)

ترجمہ:- اہلِ سنت اور اہلِ حق کا مذہب یہ ہے کہ صحابہؓ کے ساتھ نیک گمان رکھا جائے، ان کے باہمی اختلافات کے بارے میں توقف کیا جائے اور ان کی لڑائیوں کی صحیح توجیہ کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ وہ مجتہد اور متاوّل تھے، انہوں نے نہ گناہ کا قصد کیا اور نہ محض دُنیا کا، بلکہ ہر فریق کا اعتقاد یہ تھا کہ وہ حق پر ہے اور اس کا مخالف برسرِ بغاوت، اس لئے اس سے قتال کرنا اس پر واجب ہے تاکہ اللہ کے اَحکام کی طرف لوٹ آئے، ان میں سے بعض کی رائے واقعۃً صحیح تھی، اور بعض کی غلط، لیکن چونکہ یہ غلط رائے بھی اجتہاد کی وجہ سے قائم ہوئی تھی اور مجتہد اگر غلطی بھی کرے تو اس پر گناہ نہیں ہوتا اس لئے جن لوگوں کی رائے غلط تھی وہ بھی معذور تھے، اور جنگوں میں حضرت علیؓ کا اجتہاد واقعۃً دُرست تھا، یہ اہلِ سنت کا مذہب ہے۔ اور اس وقت حق اتنا مشتبہ اور غیر واضح تھا کہ صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت اس معاملے میں کوئی فیصلہ نہ کرسکی اور غیر جانبدار رہ کر لڑائی میں شریک نہ ہوئی، حالانکہ اگر ان حضراتِ صحابہؓ کے سامنے اس وقت حق یقینی طور پر واضح ہوجاتا تو وہ اس کی نصرت سے پیچھے نہ رہتے۔

یہ ہے اہلِ سنت کا صحیح موقف جو قرآن وسنت کے مضبوط دلائل، صحیح روایات اور صحابہ کرامؓ کی مجموعی سیرتوں پر مبنی ہے، اب اگر ان تمام روشن دلائل، قوی احادیث اور ائمۂ اہلِ سنت کے واضح ارشادات کے علی الرغم کسی کا دِل ہشام، کلبی اور ابومخنف جیسے لوگوں کے بیان کئے ہوئے افسانوں ہی پر فریفتہ ہے، اور وہ ان کی بناء پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو موردِ الزام ٹھہرانے اور گناہگار ثابت کرنے پر ہی مصر ہے تو اس

---

(۱) نوویؒ: شرح مسلم ج:۲ ص:۳۹۰۔

کے لئے ہدایت کی دُعا کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے؟ جس شخص کو سورج کی روشنی کے بجائے اندھیرا ہی اچھا لگتا ہو تو اس ذوق کا علاج کس کے پاس ہے؟ لیکن ایسا کرنے والے کو خوب اچھی طرح سوچ لینا چاہئے کہ پھر معاملہ صرف حضرت معاویہؓ ہی کا نہیں ہے، ان کے ساتھ حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ اور حضرت عبادہ بن صامتؓ پر بھی (معاذ اللہ) فسق کا الزام عائد کرنا ہوگا، اور پھر اَجلہ صحابہؓ کی وہ عظیم الشان جماعت بھی اس ناوک تفسیق سے نہیں بچ سکتی جس نے (نعوذ باللہ) ان حضرات کو کھلے فسق کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا، اُمتِ اسلامیہ کے ساتھ اس صریح دھاندلی کا کھلی آنکھوں نظارہ کیا، اور حضرت علیؓ کو جو اس دھاندلی کے خلاف جہاد کر رہے تھے، بے یار و مددگار چھوڑ کر گوشۂ عافیت کو اِختیار کرلیا، لہٰذا عشرہ مبشرہ میں سے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت سعید بن زیدؓ اور باقی اَجلہ صحابہؓ میں حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت عبداللہ بن سلامؓ، حضرت قدامہ بن مظعونؓ، حضرت کعب بن مالکؓ، حضرت نعمان بن بشیرؓ، حضرت اُسامہ بن زیدؓ، حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوالدرداءؓ، حضرت ابو اُمامہ الباہلیؓ، حضرت مسلمہ بن مخلدؓ اور حضرت فضالہ بن عبیدؓ جیسے حضرات کے لئے بھی یہ ماننا پڑے گا کہ انہوں نے حضرت علیؓ کا ساتھ چھوڑ کر باطل کے ہاتھ مضبوط کئے اور اِمامِ برحق کی اطاعت کو چھوڑ کر فسق کا ارتکاب کیا۔

اگر کوئی شخص یہ تمام باتیں تسلیم کرنے کو تیار ہے تو وہ حضرت معاویہؓ کو بھی فاسق قرار دے، لیکن پھر اسے پردے میں رکھ کر بات کرنے کے بجائے جرأت کے ساتھ کھل کر ان تمام باتوں کا اقرار کرنا چاہئے اور واضح الفاظ میں اعلان کر دینا چاہئے کہ صحابہؓ کے بارے میں تعظیم و تقدیس کے عقائد، ان کی افضلیت کے دعوے، ان کے حق میں خیر القرون کے خطابات، سب ڈھونگ ہیں، ورنہ عملاً ان میں اور آج کے دُنیا پرست سیاست دانوں میں شمہ برابر کوئی فرق نہیں تھا۔

آخر میں، میں ملک غلام صاحب کے ایک اور سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں، میں نے لکھا تھا کہ اگر صحابہ کرامؓ کو عام عملی زندگی میں فاسق قرار دے دیا جائے تو دِین کے سارے عقائد واَحکام خطرے میں پڑ جائیں گے، کیونکہ رسولِ کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کی تمام احادیث ہمیں انہی کے واسطے سے پہنچی ہیں، اور اگر وہ عملی زندگی میں فاسق ہو سکتے ہیں تو پھر روایتِ حدیث کے معاملے میں انہیں فرشتہ تسلیم کرنے کی کیا وجہ ہے؟ اس کے جواب میں جناب غلام علی صاحب مجھ سے پوچھتے ہیں:-

> روایتِ حدیث اور تبلیغِ دین کے لئے عدالت کا جو معیار آپ صحابہ کرامؓ کے لئے وضع فرما رہے ہیں، کیا اس کو آپ پورے سلسلۂ رُواۃ پر نافذ اور چسپاں کریں گے؟

ملک صاحب نے یہ بات کچھ ایسے انداز سے لکھی ہے جیسے روایات کے رَدّ وقبول کے قواعد آج ہم پہلی بار مدوّن کرنے بیٹھے ہیں، اور ہمارے اختیار میں ہے کہ اس معاملے میں جو اُصول چاہیں مقرّر کرلیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ ''عدالت'' کا مفہوم یہ ہے کہ انسان فاسق نہ ہو، یہ بات اس کی روایت قبول کرنے کے لئے لازمی شرط ہے، یہ شرط آج میں نے اپنی جانب سے نہیں گھڑ دی ہے، اُصولِ حدیث کی جو کتاب چاہیں کھول کر دیکھ لیجئے، اس میں یہ شرط لکھی ہوئی ملے گی اور چودہ سو سال سے اسی شرط کے مطابق عمل ہوتا رہا ہے، اب صحابہ کرامؓ کے بارے میں چونکہ اُمت کا عقیدہ یہ ہے کہ ان میں سے کوئی فاسق نہیں تھا بلکہ ان میں سے ہر فرد ''عادل'' ہے، اس لئے ان کی تمام روایات مقبول ہیں، اس کے برخلاف دُوسرے رُواۃِ حدیث کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ سب عادل تھے، اس لئے ان کی ہر روایت مقبول نہیں بلکہ ان میں سے ہر راوی کے حالات کی تحقیق کر کے یہ دیکھا جائے گا کہ وہ عادل تھا یا نہیں؟ اگر وہ عادل ہو تو اس کی روایت قبول کی جائے گی اور اگر فاسق ہو تو اسے رَدّ کر دیا جائے گا، لیکن صحابہ کرامؓ کے بارے میں اس تحقیق کی ضرورت نہیں، وہ چونکہ سب کے سب بلا استثناء عادل ہیں، اس لئے ان کی ہر روایت مقبول ہے، ان کی عدالت کو مجروح کر کے ان کی بیان کردہ حدیث کو رَدّ نہیں کیا جاسکتا۔

اب اگر کوئی شخص صحابہؓ کی عدالت پر طعن کر کے انہیں فاسق قرار دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان روایات کو بھی مشتبہ بنا رہا ہے جو ان سے مروی ہیں، اور جنھیں اُمت نے غیر مشتبہ سمجھ کر ان پر بہت سے اَحکام و مسائل کی عمارت کھڑی کر دی ہے۔

دُوسرے روایانِ حدیث کا معاملہ تو یہ ہے کہ ان کے ایک ایک قول و فعل کو

جانچ کر دیکھا گیا ہے کہ وہ عدالت کے معیار پر پورے اُترتے ہیں یا نہیں؟ اور جو اس معیار پر پورا نہیں اُترا اس کی روایت کو رَدّ کر دیا گیا ہے، لیکن صحابہ کرامؓ کے بارے میں یہ عقیدہ مُسلّم رہا ہے کہ وہ عدالت کے معیارِ بلند پر فائز ہیں، لہٰذا ان کی ہر روایت قابلِ اعتماد سمجھی گئی ہے، اب اگر کوئی شخص اس عقیدے میں خلل اندازی کرے تو وہ اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ ایک ایک صحابی کے نجی حالاتِ زندگی کی ازسرِنو تحقیق کر کے یہ طے کیا جائے کہ جو روایتیں اس نے بیان کی ہیں وہ دُرست ہیں یا نہیں؟ آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ یہ اقدام دِین کی ساری عمارت کو متزلزل کرنے کے مترادف ہے یا نہیں؟

ملک صاحب میری اس دلیل کو تو ''عجیب وغریب استدلال'' فرماتے ہیں، اور لکھتے ہیں کہ اس میں ''مغالطے مضمر ہیں'' لیکن حضرت علیؓ سے اُمیدواریٔ خلافت کا اعتراض دُور کرتے ہوئے جو کچھ مولانا مودودی صاحب نے لکھا ہے، اس کے بارے میں نہ جانے ان کا کیا خیال ہوگا؟ مولانا لکھتے ہیں:۔

> کیا واقعی یہی تصویر ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہلِ بیتؓ اور ان کے اصحابِ کبارؓ کی، کیا اللہ کے رسول کی یہی پوزیشن تھی کہ وہ دُنیا کے عام بانیانِ سلطنت کی طرح ایک سلطنت کا بانی تھا؟ کیا پیغمبرِ خدا کی ۲۳ سالہ تعلیم، صحبت اور تربیت سے یہی اخلاق، یہی سیرتیں اور یہی کردار تیار ہوتے ہوتے؟ ......
>
> تاہم اگر کسی کا جی چاہتا ہے کہ اس قصے کو باور کرے تو ہم اسے روک نہیں سکتے، تاریخ کے صفحات تو بہرحال اس سے آلودہ ہی ہیں، مگر پھر ساتھ ہی یہ ماننا پڑے گا کہ خاکم بدہن رسالت کا دعویٰ محض ایک ڈھونگ تھا، قرآن شاعرانہ لفاظی کے سوا کچھ نہ تھا اور تقدس کی ساری داستانیں رِیاکاری کی داستانیں تھیں ..... ہر صاحبِ عقل کو خود سوچنا چاہیئے کہ ان میں سے کون سی تصویر مبلغِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہلِ بیتؓ و اصحابِ کبارؓ کی سیرتوں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے، اگر پہلی

> تصویر پر کسی کا دِل رتجھتا ہو تو رتجھے، مگر اس کے ساتھ ایک اُمیدواری اور دعویداری کا مسئلہ ہی نہیں، پورے دِین وایمان کا مسئلہ حل طلب ہوجائے گا۔ (۱)

سوال یہ ہے کہ اگر تاریخ کے صفحات حضرت علیؓ کی سیرت پر اُمیدواریٔ خلافت کا داغ لگادیتے ہیں تو اس سے تو پورے دِین وایمان کا مسئلہ حل طلب ہوجاتا ہے، رسالت کا دعویٰ محض ایک ''ڈھونگ'' بن جاتا ہے، قرآن شاعرانہ لفاظی کے سوا کچھ نہیں رہتا اور تقدس کی ساری داستانیں رِیاکاری کی داستانیں ہوجاتی ہیں، لیکن حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبادہ بن صامتؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت سعد بن زیدؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت اُسامہؓ اور ان جیسے دُوسرے بہت سے حضرات کی سیرت پر کتنے ہی داغ لگتے رہیں، ان سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابِ کبار کی کیسی ہی بھیانک تصویر بنتی رہے، اس سے دِین وایمان کا کوئی مسئلہ حل طلب نہیں ہوتا؟ جو اِستدلال حضرت علیؓ کے بارے میں کیا گیا تھا وہی استدلال ان حضراتِ صحابہؓ کے بارے میں بھی کیا جاتا ہے تو وہ ''عجیب و غریب'' بن جاتا ہے، اور اس میں ''مغالطے مضمر'' ہوجاتے ہیں ۔

> تم ہی بتاؤ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

عدالتِ صحابہؓ کی بحث کے دوران ملک صاحب نے لکھا ہے:-

> البلاغ میں چونکہ یہ سوال خاص طور پر اُٹھایا گیا ہے کہ کسی صحابی یا کسی راوی کی جانب بدعت کے انتساب کے بعد اس کی بیان کردہ حدیث کیسے قابلِ قبول ہوسکتی ہے، اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے پر بھی مختصر بحث کردُوں۔

اس کے بعد موصوف نے تقریباً آٹھ صفحات پر بحث کی ہے کہ راویٔ حدیث کے کسی قول وفعل پر بدعت کا اطلاق اس کی روایت میں کس حد قادح ہوسکتا ہے؟ لیکن میں حیران ہوں کہ جس سوال کو انہوں نے مجھ سے منسوب کرکے فرمایا ہے کہ

---

(۱) رسائل ومسائل ص:۶۷ تا ۷۶، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۵۱ء۔

اسے البلاغ میں "خاص طور پر" اُٹھایا گیا ہے، وہ میں نے کب اور کس جگہ لکھا ہے؟ میری ساری بحث تو فسق کے بارے میں تھی، یہ بحث تو میں نے کہیں بھی نہیں چھیڑی کہ مبتدع کی روایت کس حد تک قابلِ قبول ہے؟ چہ جائیکہ اس سوال کو "خاص طور پر" اُٹھایا ہو۔ لیکن ملک صاحب ہیں کہ خواہ مخواہ اس دعوے کو مجھ سے منسوب کر کے اس کی مفصل تردید بھی کر رہے ہیں، اور بیچ میں طنز و تعریض بھی فرما رہے ہیں، آپ ہی بتائیے کہ میں جواب میں اس کے سوا کیا عرض کروں کہ ؂

وہ بات میرے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بڑی ناگوار گزری ہے

## آخری گزارش

"ترجمان القرآن" میں تیرہ ماہ تک مسلسل اس موضوع پر بحث و مباحثہ کرنے کے بعد ملک صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں اتحاد کی دعوت بھی دی ہے اور مولانا مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی کی خدمات گناتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"اگر اب بھی ہم نے باہمی خانہ جنگی جاری رکھی اور ہر اختلافی مسئلے میں ایک دُوسرے کو توہینِ اسلام کا مرتکب قرار دیا تو اس کا فائدہ اعدائے اسلام کو ہی پہنچے گا۔"

اس نیک جذبے کی پوری قدردانی کے ساتھ میں یہ ضرور دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا مودودی صاحب کے نظریات سے اختلاف، یا اس پر علمی تنقید کون سی لغت کی رُو سے "خانہ جنگی" کی تعریف میں داخل ہے؟ اور کیا "خانہ جنگی" سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ مولانا مودودی صاحب کے تمام نظریات کو بے چوں و چرا تسلیم کرلیا جائے؟ وہ جس موقع پر، جس زمانے میں، جو چاہیں تحریر فرماتے رہیں، خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو، خواہ اس سے اُمت میں انتشار پیدا ہوتا ہو یا غلط فہمیاں پھیلتی ہوں، لیکن ان کی تحریریں پڑھنے والے کا کام صرف یہ ہونا چاہئے کہ وہ ان پر بلا مطالبہ دلیل ایمان لے آئے؟ وہ صحابہ کرامؓ پر تنقیص کی حد تک تنقید فرمائیں تو اسے "علمی ضرورت" کا نام دیا جائے، لیکن کوئی شخص خود مولانا مودودی کے نظریات پر تنقید کے لئے خالص علمی انداز میں بھی زبان کھولے تو "خانہ جنگی" کا مجرم قرار پائے۔

اگر اتحاد و اتفاق کا مفہوم یہی کچھ ہے کہ "منہ کھولو تو تعریف کے لئے کھولو، ورنہ چپ رہو"[1] تو ملک صاحب خود انصاف کے ساتھ غور فرمالیں کہ یہ "اتحاد و اتفاق" کبھی قائم ہوسکتا ہے یا نہیں؟ مولانا مودودی صاحب نے مغربی افکار و نظریات کے مقابلے میں جو کام کیا ہے، وہ بلاشبہ قابلِ تعریف اور قابلِ قدر ہے، اس شعبے میں ان کی خدمات کو ان سے اختلاف رکھنے والے بھی سراہتے ہیں، اور ہم نے بھی اس کے اظہار میں کبھی تامل نہیں لیا، لیکن کاش! کہ مولانا اپنے دائرۂ عمل کو اسی حد تک محدود رکھتے اور اسلام کے بلند مقاصد کی خاطر اس نازک دور میں وہ مسائل نہ چھیڑتے جنھوں نے مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کے سوا کوئی خدمت انجام نہیں دی، اگر ان کا قلم حجاج کی تلوار کی طرح کفر و الحاد کے ساتھ اسلام کے ستونوں کو بھی اپنا ہدف نہ بنالیتا تو علماء یا عام مسلمانوں کو ان سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی، یہی علماء اور یہی عام مسلمان جو آج "مودودی" کے نام سے بدکتے ہیں، ان کے دست و بازو بن کر کفر و الحاد کے سیلاب کا یک جہتی کے ساتھ مقابلہ کرتے، لیکن افسوس ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے جس شدّ و مدّ کے ساتھ مغربی الحاد کا مقابلہ کیا، اسی تندی اور تیزی کے ساتھ اپنے قلم کا رُخ تاریخِ اسلام کی ان شخصیتوں کی طرف بھی پھیر دیا جو اُمتِ مسلمہ کے عمائد ہیں اور جن کے بارے میں مسلمانوں کا ضمیر انتہائی حساس واقع ہوا ہے۔

میرا انتہائی دردمندانہ التماس ہے کہ مولانا مودودی صاحب اور ان کے رُفقائے جماعت خدا کے لئے کبھی اس بات پر بھی ٹھنڈے دل اور سنجیدگی کے ساتھ غور فرمائیں کہ اس وقت اہلِ سنت ان مکاتبِ فکر کے مجموعہ سے عبارت ہے جو دیوبندی، بریلوی اور اہلِ حدیث کے ناموں سے معروف ہیں، ان میں سے کوئی مکتبِ فکر ایسا نہیں ہے جو مولانا مودودی صاحب کے ان نظریات سے بیزار نہ ہو، سوال یہ ہے کہ کیا یہ سارے کے سارے مسلمان عقل و خرد سے بالکل خالی ہیں؟ یا ان سے

---

(۱) یہ الفاظ مولانا مودودی صاحب نے دورِ ملوکیت کے خصائص میں ذکر کئے ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر ان کو چسپاں کیا ہے۔

انصاف و دیانت بالکل اُٹھ گئی ہے؟ یا یہ سب کے سب حاسد اور کینہ پرور ہیں؟ کہ خواہ مخواہ مولانا کے پیچھے پڑ گئے ہیں...؟ آخر کوئی بات تو ہے جن سے ان مکاتبِ فکر کے سنجیدہ، صاحبِ بصیرت اور علمی مزاج رکھنے والے لوگوں کے دِل بھی مجروح ہوئے ہیں اور جس کی وجہ سے وہ لوگ بھی بولنے پر مجبور ہوگئے ہیں جو اس نازک دور میں فرقہ وارانہ مباحث چھیڑنے سے ہمیشہ پرہیز کرتے رہے ہیں۔

مولانا مودودی صاحب کے جن نظریات سے ان سارے مکاتبِ فکر میں کبیدگی پیدا ہوئی اور جن سے ملک کے طول وعرض میں فرقہ وارانہ مباحث کا در کھل گیا، تھوڑی دیر کے لئے فرض کیجئے کہ وہ سو فیصد حق ہیں، لیکن کیا اس ''حق'' کا اظہار اسی وقت ضروری تھا جبکہ اسلامی صفوں میں معمولی سا انتشار دُشمنوں کی پیش قدمی کو میلوں آگے بڑھا لاتا ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو تھی کہ کعبہ کو ازسرِنو بنائے ابراہیمی پر تعمیر فرمائیں، یہ اقدام سو فیصد برحق تھا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اس بناء پر اس نیک کام کو چھوڑ دیا کہ اس سے اُمت میں انتشار کا اندیشہ تھا۔ اور نہایت افسوس ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے جو اسلام کے بلند مقاصد کا پرچم لے کر چلے تھے، اس واضح حقیقت کو نہیں پہچانا کہ اگر وہ ان اختلافی مسائل کو نہ چھیڑتے تو ملت کا نقشہ کیا ہوتا؟

پھر اس پر طرّہ یہ ہے کہ ان کے رُفقائے جماعت کا جو مزاج مجموعی طور پر تیار ہوا ہے، اس نے عملاً مولانا کے ایک ایک لفظ کو پتھر کی لکیر سمجھ لیا ہے، ان میں سے اکثر حضرات جماعتِ اسلامی کے باہر سے مولانا پر تنقید کا ایک لفظ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، خواہ وہ کتنی دردمندی، کتنی سنجیدگی اور کتنی تہذیب و شائستگی کے ساتھ کی گئی ہو، عملاً وہ مولانا مودودی صاحب کو تنقید سے بالاتر ہی سمجھنے لگے ہیں، اور اس طرزِ عمل نے پوری جماعت کو عام مسلمانوں کی نگاہ میں ایک فرقہ بنا دیا ہے۔

اگر کوئی شخص اُمت کے عام مُسلّمات کے خلاف کوئی تحریر شائع کرتا ہے تو اسے کم از کم اس کے لئے تو تیار رہنا چاہئے کہ جانبِ مخالف سے علمی اور تحقیقی انداز میں اس پر تنقید کی جائے، لیکن جماعتِ اسلامی کے بہت سے پُرجوش کارکنوں اور

مولانا کے معتقدین کی طرف سے جو خطوط مجھے موصول ہوئے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا کے کسی نظریئے کے خلاف زبانِ تنقید کھولنا ہی جرم ہے، اور بعض خطوط کو پڑھ کر تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ علمی تنقید لکھ کر (خدانخواستہ) میں نے دائرۂ اسلام سے باہر قدم رکھ دیا ہے۔ خود ملک صاحب نے جن تیوروں کے ساتھ اس کا جواب دیا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ مولانا سے اظہارِ اختلاف کے بعد میں ان لوگوں کی صف میں آگیا ہوں جن سے علمی مباحثہ نہیں، لڑائی ضروری ہے۔ جو حضرات نظریاتی اختلاف کے مدلل اظہار اور نزاع و جدال میں عملاً خود کوئی فرق نہ رکھتے ہوں، حیرت ہے کہ انہیں دُوسروں سے خانہ جنگی کی شکایت ہے۔

میری صاف گوئی، مولانا، ان کے معتقدین اور ان کی جماعت کو ممکن ہے ناگوار ہو، لیکن خدا شاہد ہے کہ میں نے یہ باتیں دُکھے ہوئے دِل کے ساتھ خیرخواہی کے جذبے سے اس احساس کے تحت لکھی ہیں کہ ان کے مذکورہ طرزِ عمل سے اُمت کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے۔ مولانا مودودی صاحب نے جس محنت، جانفشانی اور خود اعتمادی کے ساتھ مغربی افکار کا مقابلہ کیا ہے، خطرہ ہے کہ ان کا یہ طریقِ کار ان ساری خدمات کے اثر کو زائل نہ کردے۔ اگر آج بھی مولانا مودودی اور ان کی جماعت نے اپنی سنگین غلطیوں کو محسوس نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا، لیکن پانی کے سر سے گزر جانے کے بعد اس احساس کا کوئی فائدہ اُمت نہیں اُٹھاسکے گی۔ کاش! کہ دردمندی سے نکلے ہوئے یہ کلمات ان میں سے کسی صاحبِ دِل کے سینے میں اُتر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دِین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے، اس کی صحیح خدمت کی توفیق بخشے، اور مسلمانوں کو باہمی نزاع و جدال کے فتنے سے بچا کر ان میں اتحاد و اتفاق پیدا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

محمد تقی عثمانی

جامعہ دارالعلوم کراچی

۱۴رشوال ۱۳۹۰ھ

حصہ سوم

# حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ
## شخصیت، کردار اور کارنامے

مولانا محمود اشرف عثمانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلیل القدر صحابی حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عالمِ اسلام کی ان چند گنی چنی ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کے احسان سے یہ اُمتِ مسلمہ سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ آپ ان چند کبار صحابہؓ میں سے ہیں جن کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسلسل حاضری اور حق تعالیٰ کی جانب سے نازل شدہ وحی کو لکھنے کا شرف حاصل ہے۔

پھر.... آپ اسلامی دُنیا کی وہ مظلوم ہستی ہیں جن کی خوبیوں اور ذاتی محاسن وکمالات کو نہ صرف نظرانداز کیا گیا بلکہ ان کو چھپانے کی پیہم کوششیں کی گئیں، آپ پر بے بنیاد الزامات لگائے گئے، آپ کے متعلق ایسی باتیں گھڑی گئیں اور ان کو پھیلایا گیا جن کا کسی عام صحابی سے تو درکنار، کسی شریف انسان سے پایا جانا مشکل ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف جس شدّ و مدّ کے ساتھ پروپیگنڈے کا طوفان کھڑا کیا گیا، اس کی وجہ سے آپؓ کا وہ حسین ذاتی کردار نظروں سے بالکل اوجھل ہوگیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت نے پیدا کیا تھا، نتیجہ یہ ہے کہ آج دُنیا حضرت معاویہؓ کو بس جنگِ صفّین کے قائد کی حیثیت سے جانتی ہے جو حضرت علیؓ کے مقابلے کے لئے آئے تھے، لیکن وہ حضرت معاویہؓ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منظورِ نظر تھے، جنھوں نے کئی سال تک آپؐ کے لئے کتابتِ وحی کے نازک فرائض انجام دیئے، آپؐ سے اپنے علم وعمل کے لئے بہترین دُعائیں لیں، جنھوں نے حضرت عمرؓ جیسے خلیفہ کے زمانے میں اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا، جنھوں نے تاریخِ اسلام میں سب سے پہلا بحری بیڑہ تیار کیا، اپنی عمر کا بہترین حصہ رُومی عیسائیوں کے خلاف جہاد میں گزارا، اور ہر بار ان کے دانت کھٹے کیے، آج دُنیا ان کو فراموش کرچکی ہے، لوگ یہ تو جانتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ وہ ہیں

جن کی حضرت علیؓ کے ساتھ جنگ ہوئی تھی، لیکن قبرص، روڈس، صقلیہ اور سوڈان جیسے اہم ممالک کس نے فتح کیے؟ سالہا سال کے باہمی خلفشار کے بعد عالمِ اسلام کو پھر سے ایک جھنڈے تلے کس نے جمع کیا؟ جہاد کا جو فریضہ تقریباً متروک ہو چکا تھا، اسے ازسرِنو کس نے زندہ کیا؟ اور اپنے عہدِ حکومت میں نئے حالات کے مطابق شجاعت و جواں مردی، علم و عمل، حلم و بُردباری، امانت و دیانت میں نظم و ضبط کی بہترین مثالیں کس نے قائم کیں؟ یہ ساری باتیں وہ ہیں جو پروپیگنڈے کی غلیظ تہوں میں چھپ کر رہ گئی ہیں، اس مقالے میں حضرت معاویہؓ کی زندگی کے انہی حسین پہلوؤں کو سامنے لانا مقصود ہے، یہ آپؓ کی مکمل سیرت نہیں، بلکہ آپؓ کی سیرت کے وہ گوشے ہیں جو تاریخ کے ملبے میں دب کر آج نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو رہے ہیں اور ان کے مطالعے سے حضرت معاویہؓ کے کردار کی ایک ایسی تصویر سامنے آتی ہے جو ہر لحاظ سے دلکش ہی دلکش ہے۔ اُمید ہے کہ قارئین اس تصویر میں تاریخِ اسلام کے اس عظیم کردار کی ایک دلآویز جھلک دیکھ سکیں گے۔

## ابتدائی حالات

آپؓ عرب کے مشہور و معروف قبیلہ قریش سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی شرافت و نجابت اور جود و سخا میں پورے عرب میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا، اس قبیلے کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس میں آقائے دو جہاں مبعوث ہوئے۔ پھر قریش میں سے آپؓ اس نام ور خاندان بنو اُمیہ سے تعلق رکھتے تھے جو نسبی و منصبی حیثیت سے بنو ہاشم کے بعد سب سے زیادہ معزز سمجھا جاتا تھا۔

حضرت معاویہؓ کے والد ماجد، حضرت ابوسفیانؓ اسلام لانے سے قبل ہی اپنے خاندان میں ممتاز حیثیت کے مالک اور قبیلے کے معزز سرداروں میں شمار ہوتے تھے، آپؓ فتح مکہ کے دن اسلام لائے، آپ کے اسلام لانے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت مسرت اور آپؐ نے اعلان فرمایا:۔

جو شخص بھی ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اسے امن دیا

جائے گا۔

اسلام لانے سے قبل زمانۂ جاہلیت میں بھی آپؓ اعلیٰ صفات کے مالک اور اخلاقِ کریمانہ کے حامل تھے، علامہ ابنِ کثیرؒ لکھتے ہیں:۔

وکان رئیسًا مطاعًا ذا مالٍ حزیل. (۱)

ترجمہ:۔ آپ اپنی قوم کے سردار تھے، آپ کے حکم کی اطاعت کی جاتی تھی اور آپ کا شمار مالدار لوگوں میں ہوتا تھا۔

پھر آپؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے اور غزوۂ حنین اور غزوۂ یرموک میں شرکت کی، یہاں تک کہ ۳۱ھ میں آپ کا انتقال ہوگیا۔

حضرت معاویہؓ آپ ہی کے فرزند ارجمند تھے، بعثتِ نبوی سے پانچ سال قبل آپ کی ولادت ہوئی۔(۲) بچپن ہی سے آپ میں اُولوالعزمی اور بڑائی کے آثار نمایاں تھے، چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ نوعمر تھے آپؓ کے والد ابوسفیانؓ نے آپ کی طرف دیکھا اور کہنے لگے:۔

میرا بیٹا بڑے سر والا ہے اور اس لائق ہے کہ اپنی قوم کا سردار بنے۔

آپؓ کی والدہ ہند نے یہ سنا تو کہنے لگیں:۔

فقط اپنی قوم کا؟ میں اس کو روؤں اگر یہ پورے عالمِ عرب کی قیادت نہ کرے۔(۳)

اسی طرح ایک بار عرب کے ایک قیافہ شناس نے آپ کو چھٹ پٹے کی حالت میں دیکھا تو بولا:۔

میرا خیال ہے کہ یہ اپنی قوم کا سردار بنے گا۔(۴)

---

(۱) ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۲۱، مطبوعہ مصر ۱۹۳۹ء۔

(۲) ابن حجرؒ: الاصابة ج:۳ ص:۴۱۲، مطبوعة مکتبة التجاریة الکبریٰ ۱۹۳۹ء

(۳) حوالہ مذکورہ بالا۔

(۴) علامة ابن کثیرؒ: البدایة والنهایة ج:۸ ص:۱۱۸، مطبوعه مطبعة کردستان العلمیة، مصر ۱۳۴۸ھ۔

ماں باپ نے آپ کی تربیت خاص طور پر کی اور مختلف علوم وفنون سے آپ کو آراستہ کیا، اور اس دور میں جبکہ لکھنے پڑھنے کا رواج بالکل نہ تھا اور عرب پر جہالت کی گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی، آپ کا شمار ان چند گنے چنے لوگوں میں ہونے لگا جو علم وفن سے آراستہ تھے اور لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

## اسلام

آپؓ ظاہری طور پر فتحِ مکہ کے موقع پر ایمان لائے مگر درحقیقت آپؓ اس سے قبل ہی اسلام قبول کر چکے تھے، لیکن بعض مجبوریوں کی بناء پر ظاہر نہ کیا تھا، مشہور مؤرخ واقدی کہتے ہیں کہ: آپؓ صلح حدیبیہ کے بعد ہی ایمان لے آئے تھے مگر آپؓ نے اپنے اسلام کو چھپائے رکھا اور فتحِ مکہ کے دن ظاہر کیا۔ اپنے اسلام کو چھپائے رکھنے اور فتحِ مکہ کے موقع پر ظاہر کرنے کی وجہ خود حضرت معاویہؓ نے بیان کی، چنانچہ فاضل مؤرخ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ: حضرت معاویہؓ فرمایا کرتے تھے کہ: "میں عمرۃ القضا سے پہلے اسلام لے آیا تھا، مگر مدینہ جانے سے ڈرتا تھا کیونکہ میری والدہ کہا کرتی تھیں کہ اگر تم گئے تو ہم ضروری اخراجاتِ زندگی دینا بھی بند کر دیں گے۔" اس عذر اور دُوسری مجبوریوں کی بناء پر آپؓ نے اپنے والد کے ہمراہ فتحِ مکہ کے موقع پر اپنے اسلام لانے کا اعلان کیا۔[1] یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بدر، اُحد، خندق اور غزوۂ حدیبیہ میں آپؓ کفار کی جانب سے شریک نہ ہوئے حالانکہ اس وقت آپ جوان تھے، آپ کے والد ابوسفیانؓ سالار کی حیثیت سے شریک ہو رہے تھے اور آپؓ کے ہم عمر جوان بڑھ چڑھ کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں حصہ لے رہے تھے، ان تمام باتوں کے باوجود آپؓ کا شریک نہ ہونا ظاہر کرتا ہے کہ اسلام کی حقانیت ابتداء ہی سے آپؓ کے دل میں گھر کر چکی تھی۔

## آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق

اسلام لانے کے بعد آپ مستقلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

(۱) ابن حجر: الاصابة ج:۳ ص:۴۱۳، مطبوعة مصر ۱۳۲۸ھ

لگے رہے اور آپؓ اس مقدس جماعت کے ایک رکنِ رکین تھے جسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابتِ وحی کے لئے مأمور فرمایا تھا، چنانچہ جو وحی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی اسے قلم بند فرماتے اور جو خطوط و فرامین سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار سے جاری ہوتے انہیں بھی تحریر فرماتے۔ وحیٔ خداوندی لکھنے کی وجہ سے ہی آپؓ کو "کاتبِ وحی" کہا جاتا ہے۔ علامہ ابنِ حزمؒ لکھتے ہیں(۱):۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاتبین میں سب سے زیادہ حضرت زید بن ثابتؓ آپؐ کی خدمت میں حاضر رہے اور اس کے بعد دُوسرا درجہ حضرت معاویہؓ کا تھا، یہ دونوں حضرات دن رات آپؐ کے ساتھ لگے رہتے اور اس کے سوا کوئی کام نہ کرتے تھے۔(۲)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کتابتِ وحی کا کام جتنا نازک تھا اور اس کے لئے جس احساسِ ذمہ داری، امانت و دیانت اور علم و فہم کی ضرورت تھی وہ محتاجِ بیان نہیں، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسلسل حاضری، کتابتِ وحی، امانت و دیانت اور دیگر صفاتِ محمودہ کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدّد بار آپؓ کے لئے دُعا فرمائی۔ حدیث کی مشہور کتاب جامع الترمذی میں ہے کہ ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کو دُعا دی اور فرمایا:۔

اللّٰهم اجعله هاديًا مهديًّا واهد به.(۳)

---

(۱) جمال الدين يوسف: النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة ج:۱ ص:۱۵۴، مطبوعة وزارة الثقافة والارشاد والقومی، مصر. مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ج:۹ ص:۳۵۷، مطبوعه دار الكتاب بيروت ۱۹۶۷ء۔ ابن عبدالبر: الاستيعاب تحت الاصابة ج:۳ ص:۳۷۵، مطبوعة مكتبة التجارية الكبرىٰ ۱۹۳۹ء، البداية والنهاية ج:۸ ص:۲۱، مطبوعة مصر ۱۳۴۸ھ۔

(۲) ابن حزم: جوامع السيرة ص:۲۷۔

(۳) جامع الترمذی ج:۲ ص:۲۴۷، مطبوعہ ایچ ایم سعید، قرآن محل کراچی۔ ابن اثیر: اسد الغابة ج:۴ ص:۳۸۶، مطبوعة مكتبة اسلامية طهران ۱۳۸۴ھ۔ حافظ خطیب: تاریخ بغداد ج:۱ ص:۲۰۸، مطبوعة دار الكتاب، بیروت۔

ترجمہ:- اے اللہ! معاویہ کو ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ بنا دیجئے، اور اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ہدایت دیجئے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کو دُعا دی اور فرمایا:-

اللّٰھم علّم معاویة الکتاب والحساب وقه العذاب.(۱)

ترجمہ:- اے اللہ! معاویہ کو حساب کتاب سکھا اور اس کو عذابِ جہنم سے بچا۔

مشہور صحابی حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:-

اللّٰھم علّمه الکتاب ومکن له فی البلاد وقه العذاب.(۲)

ترجمہ:- اے اللہ! معاویہ کو کتاب سکھلا دے اور شہروں میں اس کے لئے ٹھکانہ بنا دے اور اس کو عذاب سے بچا لے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کی امارت وخلافت کی اپنی حیات میں ہی پیشین گوئی فرمادی تھی، اور اس کے لئے دُعا بھی فرمائی تھی جیسا کہ مذکورہ حدیث سے ظاہر ہے۔ نیز حضرت معاویہؓ خود بھی بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے وضو کا پانی لے کر گیا، آپ نے پانی سے وضو فرمایا اور وضو کرنے کے بعد میری طرف دیکھا اور فرمایا:-

اے معاویہ! اگر تمہارے سپرد امارت کی جائے (اور تمہیں امیر

---

(۱) ابن عبدالبر: الاستیعاب تحت الاصابة ج:۳ ص:۳۸۱، ایضاً مجمع الزوائد ج:۹ ص:۳۵۶، ایضاً کنز العمال ج:۷ ص:۸۷ بحواله ابن النجار (کر) مطبوعہ دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن ۱۳۱۴ھ۔

(۲) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ج:۹ ص:۳۵۶، طبع بیروت، ایضاً النجوم الزاهرة ج:۱ ص:۱۳۴، مطبوعہ مصر۔

بنادیا جائے) تو تم اللہ سے ڈرتے رہنا اور انصاف کرنا۔ (۱)

اور بعض روایات میں ہے کہ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

جو شخص اچھا کام کرے اس کی طرف توجہ کر اور مہربانی کر اور جو کوئی بُرا کام کرے اس سے درگزر کر۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:۔

مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بعد خیال لگا رہا کہ مجھے ضرور اس کام میں آزمایا جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا (مجھے امیر بنادیا گیا)۔

ان روایات سے صاف واضح ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دربارِ نبوی میں کیا مرتبہ حاصل تھا؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کتنی محبت فرماتے تھے۔

ایک روایت میں تو یہاں تک ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو کسی کام میں مشورے کے لئے طلب فرمایا، مگر دونوں حضرات کوئی مشورہ نہ دے سکے تو آپؐ نے فرمایا:۔

ادعوا معاوية احضروه أمركم فإنه قوي أمين. (۲)

ترجمہ:۔ معاویہ کو بلاؤ اور معاملے کو ان کے سامنے رکھو، کیونکہ وہ قوی ہیں (مشورہ دیں گے) اور امین ہیں (غلط مشورہ نہ دیں گے)۔

لیکن اس روایت کی سند کمزور اور ضعیف ہے۔

---

(۱) ابن حجر: الاصابة ج:۳ ص:۴۱۳، مطبوعة مصر، ایضاً مجمع الزوائد ج:۹ ص:۳۵۵، ۳۵۶، مطبوعة بیروت، وفيه رواه أحمد والطبرانی فی الأوسط والكبير ورجال أحمد وأبي يعلىٰ رجال الصحيح۔

(۲) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ج:۹ ص:۳۵۶، مطبوعه بیروث، وفيه: رواه الطبرانی والبزار باختصار ورجاله ثقات فی بعضهم خلاف، وشيخ البزار ثقه وشيخ الطبرانی لم یوثقه إلا الذهبی فی الميزان وليس فيه جرح مفسر ومع ذلک فهو حديث منكر، ایضاً ذهبی: تاريخ الاسلام ج:۲ ص:۳۱۹۔

نیز ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر سوار ہوئے اور حضرت معاویہؓ کو اپنے پیچھے بٹھایا، تھوڑی دیر بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

اے معاویہ! تمہارے جسم کا کون سا حصہ میرے جسم کے ساتھ مل رہا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! میرا پیٹ (اور سینہ) آپ کے جسم مبارک کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا دی:-

اللّٰھم املأہ علمًا.

اے اللہ! اس کو علم سے بھردے۔[1]

جب آپؓ کے والد اسلام لے آئے تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اسلام لانے سے قبل مسلمانوں سے قتال کرتا تھا، اب آپ مجھے حکم دیجئے کہ میں کفار سے لڑوں اور جہاد کروں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

ضرور! جہاد کرو۔[2]

چنانچہ اسلام لانے کے بعد آپؓ اور آپ کے والد نے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مختلف غزوات میں شرکت کی اور کفار سے جہاد کیا۔ آپؓ نے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ غزوۂ حنین میں شرکت کی اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو قبیلۂ ہوازن کے مالِ غنیمت میں سے سو اُونٹ اور چالیس اوقیہ چاندی عطا فرمائی۔[3]

## حضرت معاویہؓ صحابہؓ کی نظر میں

ان احادیث سے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت معاویہؓ سے تعلق

---

(۱) حافظ ذھبی: تاریخ الاسلام ج:۲ ص:۳۱۹۔

(۲) حافظ ابن کثیر. البدایة والنھایة ج:۸ ص:۲۱، مطبوعہ مصر۔

(۳) حافظ ابن کثیر. البدایة والنھایة ج:۸ ص:۱۱۷، مطبوعہ مصر۔

اور اس سے آپ کی فضیلت صاف ظاہر ہے، اس کے علاوہ دُوسرے جلیل القدر صحابہؓ سے بھی متعدّد اقوال مروی ہیں جن سے ان کی نظر میں حضرت معاویہؓ کے مقامِ بلند کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

ایک بار حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے حضرت معاویہؓ کی بُرائی کی گئی تو آپؓ نے فرمایا:-

دعونا من ذم فتی قریش من یضحک فی الغضب ولا ینال ما عندہ إلا علی الرضا ولا یؤخذ ما فوق رأسہ إلا من تحت قدمیہ.(۱)

ترجمہ:- قریش کے اس جوان کی بُرائی مت کرو، جو غصّے کے وقت ہنستا ہے (یعنی انتہائی بُردبار ہے) اور جو کچھ اس کے پاس ہے بغیر اس کی رضامندی کے حاصل نہیں کیا جاسکتا، اور اس کے سر پر کی چیز کو حاصل کرنا چاہو تو اس کے قدموں پر جھکنا پڑے گا (یعنی انتہائی غیور اور شجاع ہے)۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپؓ نے فرمایا: اے لوگو! تم میرے بعد آپس میں فرقہ بندی سے بچو، اور اگر تم نے ایسا کیا تو سمجھ رکھو کہ معاویہؓ شام میں موجود ہیں۔(۲)

یہاں ایک واقعے کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس سے حضرت معاویہؓ کی اپنے بڑوں کے مقابلے میں اطاعت شعاری اور حضرت عمرؓ کی اپنے گورنروں اور مخصوصین پر کڑی نگرانی ظاہر ہوتی ہے۔

علامہ ابنِ حجرؒ نے اپنی کتاب الاصابہ میں نقل کیا کہ ایک بار حضرت معاویہؓ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس آئے، حضرت معاویہؓ نے اس وقت ایک سبز رنگ کا جوڑا پہنا ہوا تھا، صحابہ کرامؓ نے

(۱) ابن عبدالبر: الاستیعاب تحت الاصابۃ ج:۳ ص:۳۷۷، مطبوعہ مصر۔

(۲) ابن حجر: الاصابۃ ج:۳ ص:۴۱۴، مطبوعہ مصر۔

حضرت معاویہؓ کی طرف دیکھنا شروع کر دیا، حضرت عمرؓ نے یہ دیکھا تو کھڑے ہوئے اور دُرّہ لے کر حضرت معاویہؓ کی طرف بڑھے اور مارنے لگے، حضرت معاویہؓ پکارتے رہے: اللہ، اللہ اے امیر المؤمنین! آپ کیوں مارتے ہیں؟ مگر حضرت عمرؓ نے کچھ جواب نہ دیا۔ یہاں تک کہ واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے، صحابہ کرامؓ حضرت عمرؓ سے کہنے لگے: آپ نے اس جوان (حضرت معاویہؓ) کو کیوں مارا؟ حالانکہ ان جیسا آپ کی قوم میں ایک نہیں۔

حضرت عمرؓ نے جواب دیا: میں نے اس شخص میں بھلائی کے علاوہ کچھ نہ پایا اور اس کے متعلق مجھے صرف بھلائی کی ہی خبر ملی ہے، لیکن میں نے چاہا کہ اس کو اُتاروں اور یہ کہہ کر آپ نے حضرت معاویہؓ کے لباس کی جانب اشارہ کیا۔(۱)

نیز آپ کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:-

تم قیصر و کسریٰ اور ان کی سیاست کی تعریف کرتے ہو، حالانکہ خود تم میں معاویہؓ موجود ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نظر میں آپ کا مرتبہ اور مقام اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے آپؓ کے بھائی یزید بن ابی سفیانؓ کے انتقال کے بعد آپ کو شام کا گورنر مقرّر کیا۔ دُنیا جانتی ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے گورنروں اور والیوں کے تقرّر کے معاملے میں انتہائی محتاط تھے اور جب تک کسی شخص پر مکمل اطمینان نہ ہو جاتا اسے کبھی مقام اور علاقے کا امیر مقرّر نہ کرتے تھے، پھر جس شخص کو گورنر بناتے اس کی پوری نگرانی فرماتے، اور جب کبھی معیارِ مطلوب سے فروز محسوس ہوتا اسے معزول فرما دیتے تھے، ان کا آپؓ کو شام کا گورنر مقرّر کرنا اور آخر حیات تک انہیں اس عہدے پر باقی رکھنا ظاہر کرتا ہے کہ انہیں آپؓ پر مکمل اعتماد تھا۔

---

(۱) ابن حجر: الاصابة ج:۳ ص:۴۱۴۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا دور آیا، وہ بھی آپؓ پر مکمل اعتماد کرتے تھے اور تمام اہم معاملات میں آپؓ سے مشورہ لیتے اور اس پر عمل کیا کرتے تھے۔ انہوں نے بھی آپؓ کو شام کی گورنری کے عہدے پر نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ آس پاس کے دُوسرے علاقے اُردن، حمص قسرین اور فلسطین وغیرہ بھی آپ کی ماتحت گورنری میں دے دیئے۔

اس کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ شہید کردیئے گئے اور حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے ہاتھ پر مسلمانوں کی ایک جماعت نے بیعت کرلی اور آپؓ خلیفہ ہوگئے، اور آپؓ کے اور حضرت معاویہؓ کے درمیان قاتلینِ عثمان سے قصاص لینے کے بارے میں اختلاف پیش آیا جس نے بڑھ کر قتال کی صورت اختیار کرلی اور مسلمانوں کے درمیان تفرقے کی بنیاد پڑگئی، مگر جیسا کہ ہر ہوش مند جانتا ہے کہ اس میں دونوں جانب اختلاف کا منشاء دِین ہی تھا، اس لئے فریقین ایک دُوسرے کے دِینی مقام اور ذاتی خصائل واوصاف کے قائل تھے اور اس کا اظہار بھی فرماتے تھے۔

حافظ ابنِ کثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ جب جنگِ صفّین سے واپس لوٹے تو فرمایا:-

أيها الناس! لا تكرهوا إمارة معاوية فإنكم لو فقدتموه رأيتم الرءوس تندر عن كواهلها كأنما الحنظل.[1]

ترجمہ:- اے لوگو! تم معاویہ کی گورنری اور امارت کو ناپسند مت کرو، کیونکہ اگر تم نے انہیں گم کردیا تو دیکھوگے کہ سر اپنے شانوں سے اس طرح کٹ کٹ کر گریں گے جس طرح حنظل کا پھل اپنے درخت سے ٹوٹ کر گرتا ہے۔

خلفائے راشدینؓ کے علاوہ دیگر اجلہ صحابہ کرامؓ کو دیکھئے کہ ان کی نگاہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی کیا قدر و منزلت تھی؟

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے ایک فقہی مسئلے میں حضرت معاویہؓ کی

---

(۱) حافظ ابن کثیر: البدایة النهایة ج:۸ ص:۱۳۱، مطبوعہ مصر۔

شکایت کی گئی تو آپؓ نے فرمایا:-

إنه فقيه. (یقیناً معاویہ فقیہ ہیں)۔[1]

(جو کچھ انہوں نے کیا اپنے علم و فقہ کی بناء پر کیا ہوگا) ایک اور روایت میں ہے کہ آپؓ نے جواب میں فرمایا:-

إنه قد صحب رسول الله صلى الله عليه وسلم.[2]

ترجمہ:- معاویہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف اُٹھایا ہے (اس لئے ان پر اعتراض بے جا ہے)۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف اُٹھانا ہی اتنی بڑی فضیلت ہے کہ کوئی فضیلت اس کے برابر نہیں ہوسکتی۔

اسی طرح ایک بار حضرت ابنِ عباسؓ کے آزاد کردہ غلام حضرت کریب نے آکر آپؓ سے شکایت کے لہجے میں بیان کیا کہ حضرت معاویہؓ نے وتر کی تین رکعتوں کے بجائے ایک رکعت پڑھی ہے تو حضرت ابنِ عباسؓ نے جواب دیا:-

أصاب أي بني ليس أحد منا أعلم من معاوية.[3]

ترجمہ:- اے بیٹے! جو کچھ معاویہؓ نے کیا، صحیح کیا، کیونکہ ہم میں معاویہؓ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ آپ کے علم و تفقہ اور تقویٰ سے کس درجہ متاثر تھے، یہ حال تو دینی اُمور میں تھا، دُنیاوی اُمور میں حضرت ابنِ عباسؓ کا قول مشہور ہے:-

ما رأيت أخلق للملك من معاوية.[4]

---

(۱) ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۲۳، مطبوعہ مصر۔

(۲) ابنِ حجرؒ: الاصابہ ج:۳ ص:۴۱۳، ایضاً صحیح بخاری ج:۱ ص:۵۳۱، مطبوعہ نور محمد دہلی ۱۳۵۷ھ۔

(۳) بیہقیؒ: سننِ کبریٰ ج:۳ ص:۲۶، مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۵۶ھ۔

(۴) ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۵، طبع مصر، ابنِ اثیرؒ: تاریخ کامل ج:۴ ص:۵، ابنِ حجرؒ: الاصابہ ج:۳ ص:۴۱۳، مطبوعہ مصر۔

ترجمہ:- میں نے معاویہؓ سے بڑھ کر سلطنت اور بادشاہت کا لائق کسی کو نہ پایا۔

حضرت عمیر بن سعد کا قول حدیث کی مشہور کتاب ترمذی میں نقل کیا گیا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے عمیر بن سعدؓ کو حمص کی گورنری سے معزول کردیا اور ان کی جگہ حضرت معاویہؓ کو مقرّر کیا تو کچھ لوگوں نے چہ میگوئیاں کیں، حضرت عمیرؓ نے انہیں سختی سے ڈانٹا اور فرمایا:-

لا تذكروا معاوية إلّا بخير. فإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: اللّٰهم اهد به.[۱]

ترجمہ:- معاویہؓ کا صرف بھلائی کے ساتھ ذکر کرو، کیونکہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے متعلق یہ دُعا دیتے سنا ہے:

اے اللہ! اس کے ذریعہ سے ہدایت عطا فرما۔

حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: میں نے معاویہؓ سے بڑھ کر سرداری کے لائق کوئی آدمی نہیں پایا۔[۲]

سیّدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی آپس کی جنگوں میں غیر جانب دار رہے، فرمایا کرتے تھے:-

ما رأيت أحدًا بعد عثمان أقضى بحق من صاحب هٰذا الباب يعني معاوية.[۳]

ترجمہ:- میں نے حضرت عثمانؓ کے بعد کسی کو معاویہؓ سے بڑھ کر حق کا فیصلہ کرنے والا نہیں پایا۔

حضرت قبیصہ بن جابر کا قول ہے:-

ما رأيت أحدًا أعظم حلمًا ولا أكثر سودداً ولا أبعد إناة

(۱) جامع الترمذی ج:۲ ص:۲۴۷، مطبوعہ سعید کراچی۔
(۲) ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۵، مطبوعہ مصر۔
(۳) ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۳۔

ولا ألين مخرجًا ولا أرحب باعًا بالمعروف من معاوية. [1]

ترجمہ:- میں نے کوئی آدمی ایسا نہیں دیکھا جو (حضرت) معاویہؓ سے بڑھ کر بُردبار، ان سے بڑھ کر سیادت کا لائق، ان سے زیادہ باوقار، ان سے زیادہ نرم دِل اور نیکی کے معاملے میں ان سے زیادہ کشادہ دست ہو۔

ان چند روایات سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ آپ کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے؟ اور ان کی نگاہ میں آپؓ کا مرتبہ کیا تھا؟

## حضرت معاویہؓ تابعینؒ کی نظر میں

تابعین کرامؒ میں آپ کی کیا حیثیت تھی؟ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دورِ خلافت میں کبھی کسی کو کوڑوں سے نہیں مارا، مگر ایک شخص جس نے حضرت معاویہؓ پر زبان درازی کی تھی، اس کے متعلق انہوں نے حکم دیا کہ اسے کوڑے لگائے جائیں۔ [2]

حافظ ابنِ کثیرؒ نے بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جو مشہور تابعینؒ میں سے ہیں، ان سے کسی نے حضرت معاویہؓ کے بارے میں پوچھا تو حضرت ابن المبارکؒ جواب میں کہنے لگے: بھلا میں اس شخص کے بارے میں کیا کہوں؟ جس نے سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی ہو اور جب سرکارؐ نے "سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ" کہا تو انہوں نے جواب میں "رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ" کہا ہو۔ [3]

انہی عبداللہ بن المبارکؒ سے ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا کہ: یہ بتلائیے کہ حضرت معاویہؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ میں سے کون افضل ہے؟ سوال کرنے

---

(۱) حافظ ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۵، جلال الدین سیوطیؒ: تاریخ الخلفاء ص:۱۵۶، طبع نور محمد کراچی۔

(۲) ابنِ عبدالبرؒ: الاستیعاب تحت الاصابہ ج:۳ ص:۳۸۳، مطبوعہ مصر، حافظ ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۹۔

(۳) ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۹۔

والے نے ایک جانب اس صحابی کو رکھا جس پر طرح طرح کے اعتراضات کیے گئے تھے، اور دُوسری طرف اس جلیل القدر تابعیؒ کو جس کی جلالتِ شان پر تمام اُمت کا اتفاق ہے، یہ سوال سن کر عبداللہ ابن المبارکؒ غصّے میں آگئے اور فرمایا: ''تم ان دونوں کی آپس میں نسبت پوچھتے ہو، خدا کی قسم! وہ مٹی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جہاد کرتے ہوئے حضرت معاویہؓ کی ناک کے سوراخ میں چلی گئی، وہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے افضل ہے۔''(۱)

اسی قسم کا سوال حضرت معافی بن عمرانؒ سے کیا گیا تو وہ بھی غضب ناک ہوگئے اور فرمایا: ''بھلا ایک تابعی کسی صحابی کے برابر ہوسکتا ہے؟ حضرت معاویہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، ان کی بہن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں تھیں، انہوں نے وحیٔ خداوندی کی کتابت کی اور حفاظت کی، بھلا ان کے مقام کو کوئی تابعی کیسے پہنچ سکتا ہے؟''

اور پھر یہ حدیث پڑھ کر سنائی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

جس نے میرے اصحاب اور رشتہ داروں کو بُرا بھلا کہا اس پر اللہ کی لعنت ہو۔(۲)

مشہور تابعی حضرت احنف بن قیسؒ اہلِ عرب میں بہت حلیم اور بُردبار مشہور ہیں، ایک مرتبہ ان سے پوچھا گیا کہ: بُردبار کون ہے؟ آپ یا معاویہؓ؟ آپؒ نے فرمایا: بخدا میں نے تم سے بڑا جاہل کوئی نہیں دیکھا، (حضرت) معاویہؓ قدرت رکھتے ہوئے حلم اور بُردباری سے کام لیتے ہیں اور میں قدرت نہ رکھتے ہوئے بُردباری کرتا ہوں، لہٰذا میں ان سے کیسے بڑھ سکتا ہوں؟ یا ان کے برابر کیسے ہوسکتا ہے؟(۳)

---

(۱) حوالہ مذکورہ بالا۔

(۲) ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۹، مطبوعہ مصر۔

(۳) تاریخ طبری ج:۶ ص:۱۸۷، العقد الفرید ج:۸ ص:۱۶۵، بحوالہ ''حضرت معاویہؓ'' مؤلفہ حکیم محمود احمد ظفر۔

# سوانح

جیسا کہ ہم اُوپر تحریر کر چکے ہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی ولادت بعثتِ نبوی سے پانچ سال قبل ہوئی اور آپؓ نے فتحِ مکہ کے موقع پر اپنے اسلام لانے کا اعلان کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد آپؓ شام وغیرہ کے علاقوں میں مصروفِ جہاد رہے، اسی دوران آپؓ نے جنگِ یمامہ میں شرکت کی، بعض مؤرّخین کا خیال ہے کہ مدعیٔ نبوّت مسیلمہ کذّاب کو آپؓ ہی نے قتل کیا تھا، مگر صحیح یہ ہے کہ حضرت وحشیؓ نے نیزہ مارا تھا اور آپؓ نے اس کے قتل میں مدد کی تھی۔ (۱)

پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور آیا اور ۱۹ھ میں انہوں نے حضرت معاویہؓ کے بھائی یزید بن ابی سفیانؓ کو جو اس وقت شام کے گورنر تھے، حکم دیا کہ "قیساریہ" کو فتح کرنے کے لئے جہاد کریں، "قیساریہ" رُوم کا مشہور شہر اور رُومیوں کی فوجی چھاؤنی تھی، چنانچہ یزید بن ابی سفیانؓ نے شہر کا محاصرہ کرلیا، یہ محاصرہ طول کھینچ گیا تو یزید بن ابی سفیانؓ آپ کو اپنا نائب مقرّر کر کے دمشق چلے گئے، حضرت معاویہؓ نے "قیساریہ" کا محاصرہ جاری رکھا یہاں تک کہ شوال ۱۹ھ میں اسے فتح کرلیا۔ اس فتح کے ایک ماہ بعد ہی ذیقعدہ ۱۹ھ میں یزید بن ابی سفیانؓ طاعون کے مہلک مرض میں وفات پا گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی موت کا بہت صدمہ ہوا اور کچھ عرصہ بعد آپؓ نے ان کے بھائی حضرت معاویہؓ کو شام کا گورنر بنا دیا اور آپ کا وظیفہ ایک ہزار درہم ماہانہ مقرّر فرمایا۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں آپؓ نے چار سال شام کے گورنر کی حیثیت سے گزارے، (۲) اس عرصے میں آپؓ نے رُوم کی سرحدوں پر جہاد جاری رکھا اور بہت سارے شہر فتح کئے۔ (۳)

---

(۱) حافظ ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۱۷۔

(۲) ابنِ عبدالبرؒ: الاستیعاب تحت الاصابہ ج:۳ ص:۳۷۵، ۳۷۶ و دیگر کتبِ تاریخ۔

(۳) علامہ ابنِ خلدونؒ: تاریخ ابنِ خلدون ج:۱ ص:۴۶۷، مطبوعہ دار الکتاب اللبنانی، بیروت ۱۹۵۶ء۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے آپ کو اس عہدے پر نہ صرف باقی رکھا، بلکہ آپؓ کے حسنِ انتظام، تدبر اور سیاست سے متاثر ہوتے ہوئے حمص، قنسرین اور فلسطین کے علاقے بھی آپؓ کے ماتحت کردیئے،(۱) حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں کل بارہ سال یا اس سے کچھ زائد آپؓ نے گورنر کی حیثیت سے گزارے، اس عرصے میں بھی آپؓ اعلائے کلمۃ اللہ کے واسطے جہاد میں مصروف رہے۔

۲۵ھ میں آپؓ نے رُوم کی جانب جہاد کیا اور عموریہ تک جا پہنچے اور راستے میں فوجی مرکز قائم کئے۔

قبرص، بحیرۂ رُوم میں شام کے قریب ایک نہایت زرخیز اور خوب صورت جزیرہ ہے اور یورپ اور رُوم کی طرف سے مصر و شام کی فتح کا دروازہ ہے، اس مقام کی بہت زیادہ اہمیت تھی کیونکہ مصر و شام جہاں اب اسلام کا پرچم لہرا رہا تھا، ان کی حفاظت اس وقت تک نہ ہوسکتی تھی جب تک کہ بحری ناکہ مسلمانوں کے قبضے میں نہ آئے، اسی وجہ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے ہی سے آپؓ کی اس زرخیز، حسین اور اہم جزیرے پر نظر تھی اور ان کے دورِ خلافت میں آپ ان سے قبرص پر لشکر کشی کی اجازت طلب کرتے رہے مگر حضرت عمرؓ نے سمندر کی مشکلات اور دُوسری وجوہات کی بناء پر اجازت نہ دی، جب حضرت عثمانؓ کا دور آیا تو آپؓ نے ان سے اجازت طلب کی اور اصرار کیا تو حضرت عثمانؓ نے اجازت دے دی اور آپؓ نے مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی بار بحری بیڑہ تیار کرایا اور صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے ہمراہ ۲۷ھ میں قبرص کی جانب روانہ ہوئے۔(۲)

مسلمانوں کی تاریخ میں بحری بیڑے کی تیاری اور بحری جنگ کا یہ پہلا موقع تھا۔ ابنِ خلدونؒ لکھتے ہیں: ''حضرت معاویہؓ پہلے خلیفہ ہیں جنھوں نے بحری بیڑہ تیار

---

(۱) تاریخ ابنِ خلدون ج:۲ ص:۱۰۰۷، طبع بیروت۔

(۲) حافظ ذہبیؒ: العبر ج:۱ ص:۲۹، مطبع حکومۃ الکویت ۱۹۶۰ء، ایضاً تاریخ ابنِ خلدون ج:۲ ص:۱۰۰۸، طبع بیروت۔

کرایا اور مسلمانوں کو اس کے ذریعے جہاد کی اجازت دی[۱]۔'' پہلی بار بحری بیڑہ تیار کرانا حضرت معاویہؓ کی محض ایک تاریخی خصوصیت ہی نہیں ہے بلکہ اس لحاظ سے نہایت عظیم سعادت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا بحری جہاد کرنے والوں کے حق میں جنت کی بشارت دی تھی، چنانچہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرمایا ہے:-

أوّل جيش من أمّتي يغزون البحر قد وجبوا.[۲]

ترجمہ:- میری اُمت کے پہلے لشکر نے جو بحری لڑائی لڑے گا، اپنے اُوپر جنت واجب کرلی ہے۔

۲۷ھ میں آپؓ اس کی طرف اپنا بحری بیڑہ لے کر روانہ ہوئے اور ۲۸ھ میں وہ آپؓ کے ہاتھوں فتح ہوگیا،[۳] اور آپ نے وہاں کے لوگوں پر جزیہ عائد کیا۔[۴]

۳۳ھ میں آپؓ نے افرنطینہ، ملطیۃ اور رُوم کے کچھ قلعے فتح کئے۔[۵]

۳۵ھ میں غزوۂ ذی خشب پیش آیا اور آپؓ نے اس میں اَمیرِ لشکر کی حیثیت سے شرکت فرمائی۔[۶]

۳۶ھ میں حضرت عثمانؓ شہید ہوگئے اور اس کے بعد جنگِ صفّین و جمل کے مشہور واقعات پیش آئے، آپؓ کا موقف اس سلسلے میں یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کو ظلماً شہید کیا گیا ہے اس لئے قاتلوں سے قصاص لینے میں کسی قسم کی نرمی نہ برتی جائے، اور قاتلوں سے جو نرمی برتی جارہی ہے، ان کو عہدوں پر مامور کیا جارہا ہے اور وہ خلافت کے کاموں میں جو بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں، اس سلسلے کو ختم کیا جائے۔

---

(۱) مقدمہ ابنِ خلدون ص:۴۵۳، مطبوعہ بیروت۔
(۲) صحیح البخاری ج:۱ ص:۴۱۰، مطبوعہ نور محمد دہلی۔
(۳) جمال الدین یوسف: النجوم الزاہرۃ ج:۱ ص:۸۵، مطبوعہ مصر۔
(۴) ابنِ خلدون ج:۲ ص:۱۰۰۸ طبع بیروت۔
(۵) حافظ ذہبیؒ: العبر ج:۱ ص:۳۴، مطبوعہ کویت۔
(۶) جمال الدین یوسف: النجوم الزاہرۃ ج:۱ ص:۹۲۔

چنانچہ البدایہ والنہایہ میں مذکور واقعے سے آپ کے اس موقف کی مکمل وضاحت ہوتی ہے اور اس بے بنیاد الزام کی قلعی کھل جاتی ہے کہ آپؓ اقتدار کی خواہش کے لئے ایسا کر رہے تھے، علامہ ابنِ کثیرؒ لکھتے ہیں:-

وقد ورد من غير وجه أن أبا مسلم الخولاني وجماعة معه دخلوا على معاوية فقالوا له: أنت تنازع عليًّا أم أنت مثله؟ فقال: والله! إني لأعلم أنه خير مني وأفضل وأحق بالأمر مني ولٰكن ألستم تعلمون أن عثمان قُتِل مظلومًا وأنا ابن عمه وأنا أطلب بدمه وأمره إلي فقولوا له فليسلم إلى قتلة عثمان وأنا أسلم له أمره، فأتوا عليًّا فكلموه في ذٰلك فلم يدفع إليهم أحدا فعند ذٰلك صمم أهل الشام على القتال مع معاوية.(۱)

ترجمہ:- علامہ ابنِ کثیرؒ فرماتے ہیں کہ: مختلف سندوں سے ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت علیؓ اور معاویہؓ کے اختلاف کے دوران حضرت ابومسلم خولانی لوگوں کی ایک جماعت کے ہمراہ حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچے تاکہ ان کو حضرت علیؓ کی بیعت پر آمادہ کرسکیں، اور جاکر حضرت معاویہؓ سے کہا: تم علیؓ سے جھگڑ رہے ہو، کیا تمہارا خیال ہے کہ تم علم وفضل میں اس جیسے ہو؟ حضرت معاویہؓ نے جواب دیا: خدا کی قسم! میرا یہ خیال نہیں، میں جانتا ہوں کہ علیؓ مجھ سے بہتر ہیں، افضل ہیں اور خلافت کے بھی مجھ سے زیادہ مستحق ہیں، لیکن کیا تم یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ عثمانؓ کو ظلماً شہید کیا گیا ہے اور میں اس کا چچازاد بھائی ہوں اس لئے مجھے ان کے خون کا قصاص اور بدلہ لینے کا زیادہ حق ہے۔ تم جاکر حضرت علیؓ سے یہ بات کہو کہ قاتلینِ عثمان کو میرے سپرد

(۱) حافظ ابن کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۲۹، مطبوعہ مصر۔

کردیں، میں خلافت کو ان کے سپرد کردوں گا۔ یہ حضرات حضرت علیؓ کے پاس آئے، ان سے اس معاملے میں بات کی، لیکن انہوں نے (ان معقولِ دلائل و اعذار کی بناء پر جو ان کے پاس تھے) قاتلین کو ان کے حوالے نہیں کیا، اس موقع پر اہلِ شام نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ لڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس واقعے کے بعد اس شبہ اور بہتان کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ حضرت معاویہؓ ذاتی نام ونمود اور اقتدار کی خواہش کے لئے ایسا کر رہے تھے۔

اس بات کا اندازہ اس ایمان افروز خط سے لگایا جاسکتا ہے جو حضرت معاویہؓ نے ان ہی اختلافات کے دوران قیصرِ رُوم کو تحریر فرمایا تھا، رُوم کے بادشاہ قیصر نے عین اس وقت جبکہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا اختلاف شباب پر تھا اور قتل و قتال کی نوبت آرہی تھی، ان اختلافات سے فائدہ اُٹھانا چاہا اور شام کے سرحدی علاقوں پر لشکر کشی کرنے کا ارادہ کیا، حضرت معاویہؓ کو اس کی اطلاع مل گئی، آپؓ نے اسے ایک خط بھجوایا اور اس میں لکھا:-

مجھے اس بات کا علم ہوا ہے کہ تم سرحد پر لشکر کشی کرنا چاہتے ہو، یاد رکھو! اگر تم نے ایسا کیا تو میں اپنے ساتھی (حضرت علیؓ) سے صلح کرلوں گا، اور ان کا جو لشکر تم سے لڑنے کے لئے روانہ ہوگا، اس کے ہراوَل دستے میں شامل ہوکر قسطنطنیہ کو جلا ہوا کوئلہ بنا کر رکھ دُوں گا۔ جب یہ خط قیصرِ رُوم کے پاس پہنچا تو وہ اپنے ارادے سے باز آگیا اور لشکر کشی سے رُک گیا،[1] کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ کفر کے مقابلے میں اب بھی ایک جسم و جان کی طرح ہیں اور ان کا اختلاف، سیاسی لیڈروں کا اختلاف نہیں ہے۔

بہر حال یہ افسوسناک اختلاف اور قتال پیش آیا، اور دراصل اس میں بڑا

---

(۱) تاج العروس ج:۷ ص:۲۰۸، مادّہ: اصطفلین، مطبوعہ دار لیبیا، بنغازی۔

ہاتھ ان مفسدین کا تھا جو دونوں جانب غلط فہمیاں پھیلاتے اور جنگ کے شعلوں کو ہوا دیتے رہے۔

۳۷ھ میں صفر کے مہینے میں واقعۂ صفین پیش آیا،[۱] اس جنگ میں حضرت معاویہؓ کے ہمراہ ستر ہزار آدمی شریک ہوئے،[۲] جس میں صحابہؓ اور تابعینؒ شامل تھے۔ آپؓ کے اور حضرت علیؓ کے درمیان یہ جنگ چار پانچ سال تک جاری رہی۔[۳]

اس کے بعد حضرت علی کرّم اللہ وجہہ شہید کر دیئے گئے، آپؓ پر بھی قاتلانہ حملہ کیا گیا اور آپؓ کو زخم آئے۔

حضرت علیؓ کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے سیّدنا حسن رضی اللہ عنہ خلافت پر متمکن ہوئے جو ابتداء ہی سے صلح جو اور مسلمانوں کے آپس کے قتال سے سخت متنفر تھے، شروع میں مفسدین نے انہیں بھی بھڑکایا مگر وہ ان کے کہے میں نہ آئے اور ۴۱ھ میں انہوں نے حضرت معاویہؓ سے صلح کر کے خلافت آپؓ کے سپرد کی، آپؓ نے ان کے لئے سالانہ دس لاکھ درہم وظیفہ مقرّر کر دیا۔[۴]

حضرت حسن بصریؒ، حضرت معاویہؓ اور حضرت حسنؓ کے درمیان صلح کے واقعے کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

استقبل والله الحسن بن علي معاوية بكتائب أمثال الجبال فقال عمرو بن العاص: إني لأرى كتائب لا تولى حتى يقتل أقرانها، فقال له معاوية وكان والله خير الرجلين: أي عمرو إن قتل هؤلاء هؤلاء وهؤلاء هؤلاء من لي بأمور المسلمين؟ من لي بنسائهم؟ من لي بضيعتهم؟[۵]

---

(۱) حافظ ذہبیؒ: العبر ج:۱ ص:۳۸، مطبوعہ کویت۔
(۲) حافظ ذہبیؒ: العبر ج:۱ ص:۴۰، مطبوعہ کویت۔
(۳) ابن عبدالبرؒ: الاستیعاب تحت الاصابۃ ج:۳ ص:۳۷۶، مطبوعہ مصر۔
(۴) حافظ ذہبیؒ: العبر ج:۱ ص۴۹، مطبوعہ کویت۔
(۵) جمع الفوائد ص:۸۴۳، طبع مدینہ منورہ، صحیح البخاری ج:۱ ص:۳۷۲، ۳۷۳، مطبوعہ نور محمد دہلی۔

ترجمہ:۔ سیّدنا حسنؓ پہاڑ جیسے لشکر لے کر حضرت معاویہؓ کے مقابلے پر سامنے آئے تو حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت معاویہؓ سے کہنے لگے: میں لشکروں کو دیکھ رہا ہوں کہ بغیر قتلِ عظیم کے واپس نہ لوٹیں گے (یعنی قتالِ عظیم ہوگا)۔ تو حضرت معاویہؓ فرمانے لگے: بتلاؤ! اگر انہوں نے انہیں قتل کیا اور ان لوگوں نے ان کو قتل کیا تو مسلمانوں کے معاملات کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ ان کی عورتوں کی رکھوالی کی ضمانت کون دے گا؟ اور یتیم بچوں اور مال ومتاع کا ضامن کون ہوگا؟

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ کے دِل میں قوم وملت کا کتنا درد تھا اور وہ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی کو کتنی بُری نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کے علاوہ علامہ ابنِ خلدونؒ نے نقل کیا ہے کہ جب حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ سے صلح کا ارادہ کیا تو ایک سفید کاغذ منگوایا اور اس کے آخر میں اپنی مہر لگائی اور کاغذ حضرت حسنؓ کے پاس روانہ فرما کر کہلا بھیجا کہ یہ سفید کاغذ آپ کی طرف بھیج رہا ہوں اور اس کے آخر میں میں نے اپنی مہر لگا دی ہے، آپ جو چاہیں شرطیں تحریر فرمادیں، مجھے منظور ہیں۔(۱) چنانچہ حضرت حسنؓ نے کچھ شرطیں لکھ دیں اور اس طرح ۴۱ھ میں آپؓ کے اور حضرت حسنؓ کے درمیان صلح ہوگئی اور تمام مسلمانوں نے متفقہ طور پر آپؓ کو خلیفہ مقرر کرکے آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ اس سال کو تاریخِ عرب میں ''عام الجماعۃ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کہ یہ وہ سال ہے کہ جس میں اُمت کا منتشر شیرازہ پھر مجتمع ہوگیا اور دُنیا بھر کے مسلمانوں نے ایک خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

علامہ ابنِ کثیرؒ لکھتے ہیں کہ: جب حضرت حسنؓ صلح کرکے مدینہ تشریف لائے تو ایک شخص نے حضرت معاویہؓ سے صلح کرنے پر آپؓ کو بُرا بھلا کہا تو آپؓ نے فرمایا:۔

لا تقل ذٰلک فإنی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

يقول: لا تذهب الأيام والليالي حتّى يملك معاوية.[۱]

ترجمہ:- مجھے بُرا بھلا مت کہو، کیونکہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ رات اور دن کی گردش اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک کہ معاویہؓ امیر نہ ہوجائیں گے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے امیرالمؤمنین ہوجانے کے بعد جہاد کا سلسلہ ازسرِنو شروع ہوگیا جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بند ہوگیا تھا، آپؓ اہلِ رُوم سے جہاد کیا، آپؓ نے اہلِ رُوم کے خلاف سولہ جنگیں لڑیں، آپؓ نے لشکر دو حصوں میں تقسیم کردیا تھا، ایک حصے کو آپ گرمی کے موسم میں جہاد کے لئے روانہ فرمادیتے تھے، پھر جب سردیوں کا موسم آتا تو آپؓ دُوسرا تازہ دَم حصہ جہاد کے لئے بھیجتے تھے، آپؓ کی آخری وصیت بھی یہ تھی:-

شد خناق الروم.[۲] (رُوم کا گلا گھونٹ دو)۔

۴۹ھ میں آپؓ نے قسطنطنیہ کی جانب زبردست لشکر روانہ کیا، جس کا سپہ سالار سفیان بن عوف کو مقرّر کیا،[۳] اس لشکر میں اَجلہ صحابہ کرامؓ شریک تھے، اور یہی و غزوہ ہے جس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات میں ہی پیشین گوئی فرمادی تھی اور اس میں شریک ہونے والوں کے متعلق فرمایا تھا:-

أوّل جيش يغزو القسطنطينية مغفور لهم.[۴]

ترجمہ:- پہلا وہ لشکر جو قسطنطنیہ کا جہاد کرے گا ان کو بخش دیا جائے گا۔

آپؓ ہی کے دورِ خلافت میں صقلیہ کے عظیم الشان جزیرے پر مسلمانوں

---

(۱) حافظ ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۱، مطبوعہ مصر۔

(۲) ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۳۔

(۳) التغری بردیؒ: النجوم الزاہرہ ج:۱ ص:۱۳۴۔

(۴) حافظ ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۲

نے فوج کشی کی اور کثیر تعداد میں مالِ غنیمت مسلمانوں کے قبضے میں آیا تھا،(۱) نیز آپ ہی کے زمانے میں سجستان سے کابل تک کا علاقہ فتح ہوا اور سوڈان کا پورا ملک اسلامی حکومت کے زیرِ نگین آ گیا۔(۲)

ذیل میں ان غزوات کا ایک انتہائی اجمالی خاکہ پیشِ خدمت ہے جو حضرت معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں پیش آئے، اس سے قبل حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت معاویہؓ ایک طویل عرصہ تک شام کے گورنر رہے، اس دوران انہوں نے رُومی نصرانیوں کے خلاف بہت سے جہاد کئے، وہ سب ان کے علاوہ ہیں۔

## غزوات(۳)

۲۷ھ — اس سال آپؓ بحری بیڑہ لے کر قبرص کی جانب بڑھے، مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی بحری جنگ تھی۔

۲۸ھ — قبرص کا عظیم الشان جزیرہ مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو گیا۔

۳۲ھ — اس سال حضرت معاویہؓ نے قسطنطنیہ کے قریب کے علاقوں میں جہاد جاری رکھا۔

۳۳ھ — افرنطیہ، ملطیہ اور رُوم کے کچھ قلعے فتح ہوئے۔

۳۵ھ — آپؓ کی قیادت میں غزوۂ ذی خشب پیش آیا۔

۴۲ھ — غزوۂ سجستان پیش آیا اور سندھ کا کچھ حصہ مسلمانوں کے زیرِ نگین آ گیا۔

۴۳ھ — ملک سوڈان فتح ہوا اور سجستان کا مزید علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آیا۔

۴۴ھ — کابل فتح ہوا اور مسلمان ہندوستان میں قندابیل کے مقام تک پہنچ گئے۔

۴۵ھ — افریقہ پر لشکر کشی کی گئی اور ایک بڑا حصہ مسلمانوں کے زیرِ نگین آیا۔

۴۶ھ — صقلیہ (سسلی) پر پہلی بار حملہ کیا گیا اور کثیر تعداد میں مالِ غنیمت مسلمانوں کے قبضے میں آیا۔

---

(۱) مقدمہ ابنِ خلدونؒ ص: ۴۵۴، مطبوعہ بیروت۔

(۲) ابنِ حزمؒ: جوامع السیرۃ ص: ۳۴۸، ایضاً سیوطیؒ: تاریخ الخلفاء ص: ۱۴۹، طبع نور محمد۔

(۳) اس نقشے کے حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو: حافظ ذہبیؒ: العبر فی خبر من غبر ج: ۱، مطبوعہ کویت ۱۹۶۰ء۔

۴۷ھ افریقہ کے مزید علاقوں میں غزوات جاری رہے۔

۵۰/۵۱ھ غزوۂ قسطنطنیہ پیش آیا، یہ قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا پہلا حملہ تھا۔

۵۴ھ مسلمان نہرِ جیحون کو عبور کرتے ہوئے بخارا تک جا پہنچے۔

۵۶ھ غزوۂ سمرقند پیش آیا۔

## سیرت

آپؓ ایک وجیہ اور خوبصورت انسان تھے، رنگ گورا تھا اور چہرے پر وقار اور بُردباری تھی،(۱) حضرت مسلمؓ فرماتے ہیں کہ معاویہؓ ہمارے پاس آئے اور وہ لوگوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور حسین تھے۔(۲) اس ظاہر حسن و جمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو سیرت کی خوبیوں سے بھی نوازا تھا، چنانچہ ایک بہترین عادل حکمران میں جو اوصاف ہوسکتے ہیں وہ آپؓ کی ذات میں موجود تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:۔

> تم قیصر و کسریٰ اور ان کی سیاست کی تعریف کرتے ہو، حالانکہ تم میں معاویہؓ موجود ہیں۔(۳)

## حکمراں کی حیثیت سے

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مسلمانوں کی طاقت میں اضافہ ہوا، حضرت عثمانؓ کے زمانے سے باہمی خانہ جنگی کی وجہ سے فتوحات کا سلسلہ رُک گیا تھا، آپؓ کے عہدِ حکومت میں یہ سلسلہ پوری قوّت کے ساتھ جاری ہوگیا، حضرت معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ کے زمانے ہی میں بحری فوج قائم کرلی تھی اور عبداللہ بن قیس حارثی کو اس کا افسر مقرّر کیا تھا، اپنے عہدِ حکومت میں انہوں نے بحری فوج کو بہت ترقی دی، مصر و شام کے ساحلی علاقوں میں بہت سے جہاز سازی کے کارخانے

---

(۱) ابنِ حجرؒ: الاصابہ، البدایہ والنہایہ، ابنِ اثیرؒ وغیرہ۔

(۲) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ج:۹ ص:۳۵۵۔

(۳) ابنِ طباطبا: الفخری ص:۲۹۔

قائم کئے، چنانچہ ایک ہزار سات سو جنگی جہاز رُومیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، بحری فوج کے کمانڈر جنادہ بن ابی اُمیہ تھے، اس عظیم الشان بحری طاقت سے آپؓ نے قبرص، روڈس جیسے اہم یونانی جزیرے فتح کئے اور اسی بحری بیڑے سے قسطنطنیہ کے حملے میں بھی کام لیا۔

ڈاک کا محکمہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں قائم ہو چکا تھا، آپؓ نے اس کی تنظیم وتوسیع کی اور تمام حدودِ سلطنت میں اس کا جال پھیلا دیا۔

آپؓ نے ایک نیا محکمہ ''دیوانِ خاتم'' کے نام سے بھی قائم کیا۔

نیز آپؓ نے خانہ کعبہ کی خدمت کے لئے متعدّد غلام مقرّر فرمائے اور دیبا و حریر کا بہترین غلاف بیت اللہ پر چڑھایا۔

آپؓ اکتالیس سال امیر رہے،[۱] حافظ ابنِ کثیرؒ آپؓ کے عہدِ حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

وأجمعت الرعايا علىٰ بيعته فى سنة إحدى وأربعين كما قدمنا فلم يزل مستقلًّا بالأمر فى هٰذه المدة إلىٰ هٰذه السنة التى كانت فيها وفاته، والجهاد فى بلاد العدو قائم، وكلمة الله عالية، والغنائم ترد إليه من أطراف الأرض، والمسلمون معه فى راحةٍ وعدلٍ وصفحٍ وعفوٍ.[۲]

ترجمہ:- آپؓ کے دورِ حکومت میں جہاد کا سلسلہ قائم رہا، اللہ کا کلمہ بلند ہوتا رہا اور مالِ غنیمت سلطنت کے اطراف سے بیت المال میں آتا رہا، اور مسلمانوں نے راحت و آرام اور عدل و انصاف سے زندگی بسر کی۔

آپؓ تالیفِ قلب، عدل و انصاف اور حقوق کی ادائیگی میں خاص احتیاط

---

(۱) حافظ ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۲۷۔

(۲) حافظ ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۱۹۔

برتتے تھے،[1] اسی وجہ سے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، آپ کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ:-

ما رأيت أحدًا بعد عثمان أقضى بحق من صاحب هٰذا البيت.[2]

ترجمہ:- میں نے حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت معاویہؓ سے بڑھ کر کسی کو حق کا فیصلہ کرنے والا نہ پایا۔

حضرت ابو اسحاق السبیعیؒ فرمایا کرتے تھے:-

اگر تم حضرت معاویہؓ کو دیکھتے یا ان کا زمانہ پالیتے تو (عدل و انصاف کی وجہ سے) تم ان کو مہدی کہتے۔[3]

اور حضرت مجاہدؒ سے بھی منقول ہے کہ وہ فرماتے:-

اگر تم معاویہؓ کے دور کو پالیتے تو کہتے کہ مہدی تو یہ ہیں۔[4]

اسی طرح ایک بار اِمام اعمشؒ کی مجلس میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا تذکرہ ہوا تو اِمام اعمشؒ فرمانے لگے:-

اگر تم حضرت معاویہؓ کے زمانے کو پالیتے تو تمہیں پتہ چل جاتا، لوگوں نے پوچھا: ان کے حلم اور بُردباری کا؟ فرمایا: نہیں! بلکہ ان کے عدل و انصاف کا۔[5]

آپؓ کی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے حضرت اِمام اعمشؒ آپؓ کو "المصحف" کے نام سے یاد کرتے تھے۔[6]

آپؓ کا دورِ حکومت ہر اعتبار سے ایک کامیاب دور شمار کیا جاتا ہے، آپؓ کے دور میں مسلمان خوش حال رہے اور انہوں نے امن و چین کی زندگی گزاری، آپؓ

---

(۱) ابنِ تیمیہؒ: منہاج السنۃ ج:۲ ص:۲۸۳۔

(۲ و ۳) حافظ ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۳۔

(۴ و ۵) العواصم من القواصم ص:۲۰۵۔

(۶) قاضی ابوبکر بن عربیؒ: العواصم من القواصم ص:۲۱۰۔

نے رعایا کی بہتری اور دیکھ بھال کے لئے متعدّد اقدامات کئے، جن میں سے ایک انتظام آپؓ نے یہ کیا کہ ہر قبیلے اور قصبے میں آدمی مقرّر کئے جو ہر خاندان میں گشت کرکے یہ معلوم کرتے کہ کوئی بچہ تو پیدا نہیں ہوا؟ یا کوئی مہمان باہر سے آکر تو یہاں نہیں ٹھہرا؟ اگر کسی بچے کی پیدائش یا کسی مہمان کی آمد کا علم ہوتا تو اس کا نام لکھ لیتے اور پھر بیت المال سے اس کے لئے وظیفہ جاری کردیا جاتا تھا۔ (۱)

اِمام بخاریؒ نے اپنی کتاب ''الادب المفرد'' میں بیان کیا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حکم دیا تھا کہ دمشق کے غنڈوں اور بدمعاشوں کی فہرست بنا کر مجھے بھیجی جائے، (۲) اس کے علاوہ آپؓ نے رفاہِ عامہ کے لئے نہریں کھدوائیں، جو نہریں بند ہوچکی تھیں انہیں جاری کروایا، مساجد تعمیر کرائیں اور عامۃ المسلمین کی بھلائی اور بہتری کے لئے اور کئی دُوسرے اقدامات کئے۔ آپؓ کے ان اقدامات کی وجہ سے عوام بھی آپؓ سے محبت کرتے تھے اور آپؓ پر جان نثار کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

ابنِ تیمیہؒ لکھتے ہیں:-

> كانت سيرة معاوية مع رعيته من خيار أمير الولاة وكان رعيته يحبونه، وقد ثبت في الصحيحين عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: خيار أئمتكم الذين تحبونهم ويحبونكم وتصلون عليهم ويصلون عليكم. (۳)

> ترجمہ:- حضرت معاویہؓ کا برتاؤ اپنی رعایا کے ساتھ بہترین حکمران کا برتاؤ تھا اور آپؓ کی رعایا آپ سے محبت کرتی تھی، اور صحیحین (بخاری و مسلم) میں حدیث ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے اُمراء میں سب سے بہتر اَمیر وہ ہیں کہ تم ان سے محبت کرتے ہو اور وہ تم سے، اور تم ان پر رحمت

---

۱) ابنِ تیمیہؒ: منہاج السنۃ ج:۳ ص:۱۸۵۔

(۲) اِمام بخاریؒ: الادب المفرد ص:۵۵۲، مطبوعہ دار الاشاعت کراچی۔

۳) ابنِ تیمیہؒ: منہاج السنۃ ج:۳ ص:۱۸۹۔

بھیجتے ہو اور وہ تم پر۔

یہی وجہ تھی کہ اہلِ شام آپؓ پر جان چھڑکتے تھے اور آپؓ کے ہر حکم کی دِل و جان سے تعمیل کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے لشکریوں سے مخاطب ہوتے ہوئے ارشاد فرمایا:-

> کیا یہ عجیب بات نہیں کہ معاویہؓ اکھڑ جاہلوں کو بلاتے ہیں تو وہ بغیر عطیہ اور داد و دہش کے اس کی پیروی کرتے ہیں اور سال میں دو تین بار جدھر چاہیں ادھر انہیں لے جاتے ہیں، اور میں تمہیں بلاتا ہوں حالانکہ تم لوگ عقل مند ہو اور عطیات پاتے رہتے ہو مگر تم میری نافرمانی کرتے ہو، میرے خلاف کھڑے ہو جاتے ہو اور میری مخالفت کرتے رہتے ہو۔(۱)

آپؓ کی رعایا کے آپؓ پر فدا ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ آپؓ رعایا کے ایک ادنیٰ فرد کی مصیبت اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف محسوس کرتے تھے اور ان کی تکلیف دُور کرنے میں کسی قسم کا کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑتے تھے، چنانچہ ایک واقعے سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

حضرت ثابت جو ابوسفیانؓ کے آزاد کردہ غلام تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں رُوم کے ایک غزوہ میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ شریک تھا، جنگ کے دوران ایک عام سپاہی اپنی سواری سے گر پڑا اور اُٹھ نہ سکا، تو اس نے لوگوں کو مدد کے لئے پکارا، سب سے پہلے جو شخص اپنی سواری سے اُتر کر اس کی مدد کو دوڑا وہ حضرت معاویہؓ تھے۔(۲)

آپؓ کے ان اوصاف اور آپؓ کے دورِ حکومت کی ان خصوصیات کا اعتراف عام مؤرّخین کے علاوہ خود شیعہ مؤرّخین کو بھی کرنا پڑا، چنانچہ شیعی مؤرّخ امیر علی لکھتے ہیں:-

---

(۱) تاریخ طبری ج:۵ ص:۱۴۸۔

(۲) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ج:۹ ص:۳۵۷۔

مجموعی طور پر حضرت معاویہؓ کی حکومت اندرونِ ملک بڑی خوشحال
اور پُر امن تھی اور خارجہ پالیسی کے لحاظ سے بڑی کامیاب تھی(۱)۔

اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ عام مسلمانوں کے معاملات میں دِلچسپی لیتے، ان کی شکایت کو بغور سنتے اور پھرحتی الامکان انہیں دُور فرماتے تھے۔

## حضرت معاویہؓ کے روز مرّہ کے معمولات

مشہور مؤرّخ مسعودی نے آپؓ کے دن بھر کے اوقات کا تفصیلی نقشہ کھینچا ہے، مسعودی لکھتے ہیں(۲):-

''آپؓ فجر کی نماز ادا کر کے زیرِ سلطنت ممالک سے آئی ہوئی رپورٹیں سنتے پھر قرآنِ حکیم کی تلاوت فرماتے اور تلاوت کے بعد گھر تشریف لے جاتے اور وہاں ضروری اَحکامات جاری کرتے، پھر نمازِ اشراق ادا کر کے باہر تشریف لاتے اور خاص خاص لوگوں کو طلب فرماتے اور ان کے ساتھ دن بھر کے ضروری اُمور کے متعلق مشورہ کرتے، اس کے بعد ناشتہ لایا جاتا جو رات کے بچے ہوئے کھانے میں سے ہوتا، پھر آپؓ کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہتے اور اس کے بعد گھر تشریف لے جاتے۔ تھوڑی دیر بعد باہر تشریف لاتے اور مسجد میں مقصورہ سے کمر لگا کر کرسی پر بیٹھ جاتے، اس وقت میں عام مسلمان جن میں کمزور، دیہاتی، بچے، عورتیں سب شامل ہوتے، آپؓ کے پاس آتے اور اپنی ضرورتیں، تکلیفیں بیان کرتے تھے، آپؓ ان سب کی دِل دہی کرتے، ضرورتیں پوری فرماتے اور ان کی تکلیفوں کو دُور کرتے تھے۔ جب تمام لوگ اپنی حاجتیں بیان کر لیتے اور آپؓ ان کے متعلق اَحکام جاری فرما دیتے اور کوئی باقی نہ بچتا تو آپؓ اندر تشریف لے جاتے اور وہاں خاص خاص لوگوں، معزّزین اور اَشرافِ قوم سے ملاقات فرماتے، آپؓ ان سے کہتے:-

---

(۱) بحوالہ ''حضرت معاویہؓ'' مؤلفہ: حکیم محمود احمد ظفر سیالکوٹی۔

(۲) یاد رہے کہ یہ مشہور متعصب معتزلی مؤرّخ ہیں۔

حضرات! آپ کو اَشرافِ قوم اس لئے کہا جاتا ہے کہ آپ کو اس مجلسِ خصوصی میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہے، لہٰذا آپ کا فرض ہے جو لوگ یہاں حاضر نہیں ہیں ان کی ضرورتیں بیان کریں۔

وہ ضرورتیں بیان کرتے اور آپؓ ان کو پورا فرماتے، پھر دوپہر کا کھانا لایا جاتا اور اس وقت کاتب بھی حاضر ہوتا، وہ آپؓ کے سرہانے کھڑا ہو جاتا اور باریاب ہونے والوں کو ایک ایک کر کے پیش کرتا اور جو کچھ وہ اپنی مشکلات اور معروضات تحریر کر کے لاتے، آپؓ کو پڑھ کر سناتا رہتا، آپؓ کھانا کھاتے جاتے اور اَحکام لکھواتے جاتے تھے اور ہر باریاب ہونے والا شخص جب تک حاضر رہتا کھانے میں شریک رہتا، پھر آپؓ گھر تشریف لے جاتے اور ظہر کی نماز کے وقت تشریف لاتے۔ ظہر کی نماز کے بعد خاص مجلس ہوتی جس میں وزراء سے ملکی اُمور کے متعلق مشورہ ہوتا اور اَحکامات جاری ہوتے۔ یہ مجلس عصر تک جاری رہتی، آپؓ عصر کی نماز ادا کرتے اور پھر عشاء کے وقت تک مختلف اُمور میں مشغول رہتے، عشاء کی نماز کے بعد اُمراء سے اُمورِ سلطنت پر گفتگو ہوتی۔ یہ گفتگو ختم ہوتی اور علمی مباحث چھڑ جاتے اور یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا تھا۔(۱)" مسعودی کا بیان ہے کہ آپؓ نے دن میں پانچ اوقات ایسے رکھے ہوئے تھے جن میں لوگوں کو عام اجازت تھی کہ وہ آئیں اور اپنی شکایات بیان کریں۔

## حلم، بُردباری اور نرم خوئی

آپؓ اس درجہ کے حلیم اور بُردبار تھے کہ آپؓ کا حلم ضرب المثل بن گیا، اور آپ کے تذکرے کے ساتھ حلم کا تصوّر اتنا لازم ہو گیا کہ بغیر اس کے آپؓ کا تذکرہ نامکمل ہے، آپؓ کے مخالفین کے آپؓ کے پاس آتے اور بسا اوقات انتہائی نازیبا رویہ اور سخت کلامی کے ساتھ پیش آتے، مگر آپؓ اسے ہنسی میں ٹال دیتے، یہی وہ رویہ تھا جس نے بڑے بڑے سرداروں اور آپؓ کے مخالفوں کو آپ کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دیا، چنانچہ حضرت قبیصہ بن جابر کا قول ہے کہ:-

---

(۱) ملخص از مسعودی: مروّج الذہب بہامش کامل ابنِ اثیرؒ ج:۶ ص:۱۰۳ تا ۱۰۵۔

میں نے حضرت معاویہؓ سے بڑھ کر کسی کو بُردبار نہیں پایا۔[1]

ابنِ عون کا بیان ہے کہ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں ایک عام آدمی کھڑا ہوتا اور ان سے کہتا: اے معاویہ! تم ہمارے ساتھ ٹھیک ہوجاؤ ورنہ ہم تمہیں سیدھا کردیں گے، اور سیّدنا معاویہؓ فرماتے: بھلا کس چیز سے سیدھا کروگے؟ تو وہ جواب میں کہتا کہ لکڑی سے، آپؓ فرماتے: اچھا! پھر ہم ٹھیک ہوجائیں گے۔[2]

حضرت مسورؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ شروع میں آپ کے مخالف تھے پھر وہ آپ کے پاس اپنی کسی حاجت سے آئے، آپؓ نے وہ حاجت پوری کی، پھر انہیں بلایا اور فرمایا: اے مسور! تم ہم پر کیا کچھ طعن و تشنیع کرتے رہے ہو؟ حضرت مسورؓ نے جواب دیا: اے امیر المؤمنین! جو کچھ ہوا اسے بھول جائیے۔ آپؓ نے فرمایا: نہیں! وہ سب باتیں جو تم میرے متعلق کہا کرتے تھے بیان کرو۔ چنانچہ حضرت مسورؓ نے وہ تمام باتیں آپؓ کے سامنے دُہرادیں جو وہ آپؓ کے متعلق کہا کرتے تھے، آپؓ نے خندہ پیشانی کے ساتھ تمام الزامات کو سنا اور ان کا جواب دیا، آپؓ کے اس رویہ کا اثر یہ ہوا کہ اس واقعے کے بعد حضرت مسورؓ جب بھی حضرت معاویہؓ کا ذکر کرتے، بہترین الفاظ میں کرتے اور ان کے لئے دُعائے خیر کیا کرتے تھے۔[3]

آپؓ کے حلم اور بُردباری کے واقعات کتبِ تاریخ میں بھرے پڑے ہیں۔ منہ پھٹ لوگ اور مخالفین آتے اور جس طرح منہ میں آتا، شکایتیں پیش کرتے، مگر آپ انتہائی بُردباری سے کام لیتے، ان کی شکایات سنتے، ان کی تکلیفوں کو حتی الامکان دُور کرتے اور ان کو انعامات سے نوازتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ جب وہ آپؓ کی مجلس سے اُٹھتے تو آپؓ کے گرویدہ ہوکر مجلس سے باہر آتے، خود حضرت معاویہؓ کا قول ہے کہ:-

غصّے کے پی جانے میں جو مزہ مجھے ملتا ہے وہ کسی شے میں نہیں ملتا۔[4]

---

(۱) النجوم الزاہرۃ ج:۱ ص:۶۴۔

(۲) حافظ ذہبیؒ: تاریخ الاسلام ج:۲ ص:۳۲۳۔

(۳) خطیب بغدادیؒ: تاریخ بغداد ج:۱ ص:۲۰۸، مطبوعہ بیروت۔

(۴) تاریخ طبری ج:۲ ص:۱۵۷، مطبوعہ حیدرآباد دکن۔

مگر یہ سب حلم اور بُردباری اس وقت تک ہوتی جب تک کہ دِین اور سلطنت کے اُمور پر زد نہ پڑتی ہو، اسی وجہ سے اگر کہیں سختی کرنے کا موقع ہوتا تو سختی بھی فرماتے اور اُصولوں پر کسی قسم کی مداہنت برداشت نہ کرتے، چنانچہ آپؓ کا قول ہے کہ:-

إنی لا أحول بين الناس وبين ألسنتهم ما لم يحولوا بيننا وبين ملكنا.(۱)

ترجمہ:- میں لوگوں اوران کی زبانوں کے درمیان اس وقت تک حائل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ ہمارے اور ہماری سلطنت کے درمیان حائل نہ ہونے لگیں۔

اسی طرح ایک اور موقع پر حضرت معاویہؓ اُصولِ سیاست بیان کرتے ہوئے فرماتے:-

جہاں میرا کوڑا کام دیتا ہے وہاں تلوار کام میں نہیں لاتا، جہاں زبان کام دیتی ہے وہاں کوڑا کام میں نہیں لاتا، اگر میرے اور لوگوں کے درمیان بال برابر تعلق بھی قائم ہوا سے قطع نہیں ہونے دیتا، جب لوگ اسے کھینچتے ہیں تو میں ڈھیل دے دیتا ہوں، اور جب وہ ڈھیل دیتے ہیں تو میں کھینچ لیتا ہوں۔(۲)

## عفو و درگزر اور حسنِ اخلاق

حق تعالیٰ نے آپ کو دیگر صفاتِ محمودہ کے علاوہ حسنِ خلق اور عفو و درگزر کی اعلیٰ صفات سے بھی نوازا تھا، ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مخالفین اور جہلاء آپؓ کے پاس آتے، بدتہذیبی کے ساتھ پیش آتے اور آپؓ بلند حوصلگی سے کام لے کر درگزر کرتے، اس سلسلے میں ایک عجیب وغریب واقعے کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا جس سے

---

(۱) ابنِ اثیرؒ: تاریخ کامل ج:۴ ص:۵۔

(۲) یعقوبی ج:۲ ص:۲۳۸۔

حضرت معاویہؓ کے صبر وتحمل، فداکاری اور اطاعتِ رسولؐ پر روشنی پڑتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ بابرکات میں حضرت وائل بن حجرؓ جو ''حضرموت'' کے بادشاہ کے بیٹے تھے، آپؐ کی خدمت میں اسلام قبول کرنے کے لئے حاضر ہوئے اور مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد کچھ روز آپؐ کے پاس مقیم رہے، جب وہ واپس ہونے لگے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاویہؓ کو کسی ضرورت کی وجہ سے ان کے ساتھ کردیا، حضرت معاویہؓ ساتھ ہولئے، یہ پیدل تھے اور وائل بن حجرؓ اُونٹ پر سوار۔ حضرت وائلؓ خاندانی شہزادے تھے اور نئے نئے اسلام لائے تھے، اس لئے شہزادگی کی خوبو ابھی باقی تھی اس لئے انہوں نے حضرت معاویہؓ کو ساتھ بٹھانا گوارا نہ کیا، کچھ دُور تک تو حضرت معاویہؓ پیدل چلتے رہے مگر عرب کی صحرا کی گرمی، الامان والحفیظ! جب پاؤں تپتی ہوئی ریت میں جھلسنے لگے تو تنگ آکر حضرت وائلؓ سے گرمی کی شکایت کی اور کہا کہ: ''مجھے بھی اپنے ساتھ سوار کرلیجئے'' مگر وہ شہزادگی کی شان میں تھے، کہنے لگے: ''یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں تمہیں سوار کرلوں، تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو بادشاہوں کے ساتھ سوار ہوسکتے ہیں۔'' حضرت معاویہؓ نے کہا: ''اچھا! اپنے جوتے ہی دے دیجئے کہ ریت کی گرمی سے کچھ بچ جاؤں'' مگر انہوں نے اس سے بھی انکار کردیا اور کہنے لگے: ''تمہارے لئے بس اتنا شرف کافی ہے کہ میری اُونٹنی کا جو سایہ زمین پر پڑ رہا ہے اس پر پاؤں رکھ کر چلتے رہو۔ مختصر یہ کہ انہوں نے نہ حضرت معاویہؓ کو سوار ہونے دیا اور نہ اس قیامت خیز گرمی سے بچنے کا کوئی اور انتظام کیا اور سارا راستہ حضرت معاویہؓ نے پیدل طے کیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت معاویہؓ بھی خاندانی اعتبار سے کچھ کم رُتبہ نہیں تھے وہ بھی سردارِ قریش کے بیٹے تھے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اطاعت کے لئے پیشانی پر شکن لائے بغیر ان کے ساتھ چلتے رہے۔

مگر یہی وائل بن حجرؓ حضرت معاویہؓ کے پاس اس وقت آتے ہیں جب وہ خلیفہ بن چکے ہیں تو حضرت معاویہؓ انہیں پہچانتے ہیں اور وہ سارا واقعہ ان کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، مگر اس کے باوجود وہ سب کچھ بھلا کر ان کی بھرپور مہمان داری

کرتے ہیں اور ان کے ساتھ انتہائی عزّت و اکرام کا برتاؤ کرتے ہیں[1]۔ اس واقعے سے آپؓ کے اخلاقِ کریمانہ، بلند حوصلگی اور عفوو درگزر کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

## عشقِ نبوی

آپؓ کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے گہرا تعلق اور عشق تھا، ایک مرتبہ آپؓ کو پتہ چلا کہ بصرہ میں ایک شخص ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت مشابہت رکھتا ہے، آپؓ نے وہاں کے گورنر کو خط لکھا کہ تم فوراً اسے عزّت و اکرام کے ساتھ یہاں روانہ کرو، چنانچہ اسے عزّت و اکرام کے ساتھ لایا گیا، آپؓ نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا، اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس کو انعامات اور خلعت سے نوازا۔[2]

اسی عشقِ رسولؐ کی بناء پر آپؓ نے سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے کٹے ہوئے ناخن، ایک کپڑا اور بال مبارک سنبھال کر حفاظت کے ساتھ رکھے ہوئے تھے جن کے متعلق آپؓ نے اپنی وفات کے وقت وصیت کی کہ انہیں میری ناک، کان اور آنکھوں میں رکھ کر مجھے دفنا دیا جائے۔[3]

اسی طرح وہ چادر جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن زہیرؓ کو ان کا قصیدہ سن کر مرحمت فرمائی تھی، اسے آپؓ نے رقم دے کر حاصل کیا تھا۔[4]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اسی تعلق کی وجہ سے آپؓ کی بہت سی اداؤں میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اداؤں کی جھلک پائی جاتی تھی، چنانچہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ:-

> میں نے نماز پڑھنے میں کسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اتنا مشابہ نہیں پایا، جتنے حضرت معاویہؓ آپؐ کے مشابہ تھے۔[5]

---

(۱) ابنِ عبدالبرؒ: الاستیعاب تحت الاصابہ ج:۳ ص:۶۰۵، مطبوعہ مصر، ایضاً تاریخ ابنِ خلدون ج:۲ ص:۸۳۵، مطبوعہ بیروت۔

(۲) المحبّر ص:۴۷۔

(۳) ابنِ اثیرؒ: تاریخ کامل ج:۴ ص:۳، ابنِ عبدالبرؒ: الاستیعاب تحت الاصابہ ج:۳ ص:۳۸۰۔

(۴) تاریخ ابنِ خلدون ج:۲ ص:۸۸، طبع بیروت۔

(۵) مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ج:۹ ص:۳۵۷۔

یہی عشقِ رسولؐ تھا، جس کی وجہ سے آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول وفعل کو دِل و جان سے قبول کرتے تھے۔

حضرت جبلہ بن سحیم بیان کرتے ہیں کہ ایک بار میں حضرت معاویہؓ کی خلافت کے دوران ان کے پاس گیا تو دیکھا کہ گلے میں رسّی پڑی ہوئی ہے جسے ایک بچہ کھینچ رہا ہے اور آپؓ اس سے کھیل رہے ہیں، جبلہ بن سحیم کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: اے امیر المؤمنین! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟

حضرت معاویہؓ نے جواب دیا: ''بیوقوف چپ رہو! میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر کسی کے پاس بچہ ہو تو وہ بھی بچوں کی سی حرکتیں کرلیا کرے تاکہ بچہ خوش ہوجائے''۔ (۱)

## اطاعتِ پیمبرؐ

اطاعتِ رسولؐ کی ایک نادر مثال وہ واقعہ ہے جو مشکوٰۃ شریف میں منقول ہے کہ حضرت معاویہؓ اور اہلِ رُوم کے درمیان ایک مرتبہ صلح کا معاہدہ ہوا، صلح کی مدّت کے دوران آپؓ اپنی فوجوں کو رُوم کی سرحدوں پر جمع کرتے رہے، مقصد یہ تھا کہ جونہی مدّتِ معاہدہ ختم ہوگی فوراً حملہ کردیا جائے گا، رُومی حکام اس خیال میں ہوں گے کہ ابھی تو مدّت ختم ہوئی ہے اتنی جلدی مسلمانوں کا ہم تک پہنچنا ممکن نہیں، اس لئے وہ حملہ کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے اور اس طرح فتح آسان ہوجائے گی، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور جیسے ہی مدّت پوری ہوئی آپؓ نے پوری قوّت سے رُومیوں پر یلغار کردی وہ لوگ اس ناگہانی حملے کی تاب نہ لاسکے اور پسپا ہونے لگے، آپؓ رُوم کا علاقہ فتح کرتے ہوئے چلے جارہے تھے کہ ایک صحابی حضرت عمرو بن عبسہؓ پکارتے ہوئے آئے: ''وفاءً لا غدر'' مؤمن کا شیوہ وفا ہے، غدر و خیانت نہیں۔

آپؓ نے پوچھا: کیا بات ہے؟

وہ کہنے لگے: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ:

---

(۱) سیوطیؒ: تاریخ الخلفاء ص:۱۵۴۔

"جب دو قوموں کے درمیان کوئی صلح کا معاہدہ ہو تو اس معاہدے کی مدّت میں نہ تو کوئی فریق عہد کھولے، نہ باندھے (یعنی اس میں کوئی تغیر نہ کرے) یہاں تک کہ مدّت گزر جائے۔"

حضرت عمرو بن عبسہؓ کا مقصد یہ تھا کہ اس حدیث کی رُو سے جنگ بندی کے دوران جس طرح حملہ کرنا ناجائز ہے، اسی طرح دُشمن کے خلاف فوجوں کو لے کر روانہ ہونا بھی جائز نہیں، چنانچہ جب حضرت معاویہؓ نے سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان سنا تو فوراً حکم دیا کہ فوجیں واپس ہو جائیں، چنانچہ پورا لشکر واپس ہو گیا اور جو علاقہ فتح ہو چکا تھا اسے بھی خالی کر دیا گیا۔(۱) ایفائے عہد کی یہ حیرت انگیز مثال شاید ہی کسی اور قوم کے پاس ہو کہ عین اس وقت جبکہ تمام فوجیں فتح کے نشے میں چور ہوں، صرف ایک جملہ سن کر سارا علاقہ خالی کرنے کا حکم دے دیا اور لشکر کا ایک ایک فرد کسی حیل و حجت کے بغیر فوراً واپس لوٹ گیا۔

اسی طرح ایک بار حضرت ابومریم الازدی رضی اللہ عنہ آپؓ کے پاس گئے، آپؓ نے پوچھا کیسے آنا ہوا؟

کہنے لگے: میں نے ایک حدیث سنی ہے وہ آپ کو سنانے آیا ہوں، اور وہ حدیث یہ ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا، آپ فرما رہے تھے کہ: "جس شخص کو اللہ نے مسلمانوں پر مقرّر کیا اور اس نے مسلمانوں اور اپنے درمیان پردے حائل کر لئے تو اللہ اس کے اور اپنے درمیان پردے حائل کر دے گا۔" ابومریم الازدیؓ بیان کرتے ہیں کہ جیسے ہی مجھ سے حضرت معاویہؓ نے یہ حدیث سنی فوراً حکم دیا کہ ایک آدمی مقرّر کیا جائے جو لوگوں کی حاجتوں کو ان کے سامنے پیش کرتا رہے۔(۲)

## خشیتِ باری تعالیٰ

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایسے بہت سے واقعات ملتے

---

(۱) مشکوٰۃ المصابیح، باب الامان ص:۳۴۷، مطبوعہ نور محمد کراچی، رواہ ابوداؤد والترمذی۔

(۲) حافظ ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۲۶۔

ہیں جن سے آپؓ کے خوف وخشیت اور فکرِ آخرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آپؓ مؤاخذۂ قیامت کے خوف سے لرزہ براندام رہتے تھے اور اس کے عبرت آموز واقعات سن کر زار وقطار روتے تھے۔

علامہ ذہبیؒ نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ایک جمعہ کو دمشق کی جامع مسجد میں خطبہ دینے کے لئے تشریف لائے اور فرمایا:-

إن المال مالنا والفيء فيئنا، من شئنا أعطينا ومن شئنا منعنا.(۱)

ترجمہ:- جو کچھ مال ہے وہ سب ہمارا ہے اور جو کچھ مالِ غنیمت ہے وہ بھی صرف ہمارا ہے، ہم جس کو چاہیں گے دیں گے اور جس سے چاہیں گے روک لیں گے۔

آپؓ نے یہ بات کہی، کسی نے اس کا جواب نہ دیا، اور بات آئی گئی ہوگئی، دُوسرا جمعہ آیا اور آپؓ خطبے کے لئے تشریف لائے تو آپؓ نے پھر یہی بات دُہرائی، پھر کسی نے جواب نہ دیا اور خاموشی طاری رہی، تیسرا جمعہ آیا اور آپؓ نے پھر یہی فرمایا تو ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہنے لگا:-

''ہرگز نہیں! مال ہمارا ہے اور مالِ غنیمت کا مال بھی ہمارا ہے، جو ہمارے اور اس کے درمیان حائل ہوگا، ہم تلواروں کے ذریعے اللہ تک اس کا فیصلہ لے جائیں گے۔'' یہ سن کر آپؓ منبر سے اُتر آئے اور اس آدمی کو بلا بھیجا اور اندر لے گئے، لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں، آپؓ نے حکم دیا کہ سب دروازے کھول دیئے جائیں اور لوگوں کو اندر آنے دیا جائے، لوگ اندر گئے تو دیکھتے ہیں کہ وہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔

حضرت معاویہؓ نے فرمایا: اللہ اس شخص کو زندگی عطا فرمائے، اس نے مجھے زندہ کردیا، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا، آپؐ فرماتے تھے: ''میرے بعد کچھ حکمران ایسے آئیں گے جو (غلط) بات کہیں گے اور ان پر نکیر نہیں ہوگی اور

---

(۱) ترمذی، ابواب الزہد، بحوالہ تاریخ اسلام، از شاہ معین الدین ندوی ج:۲ ص:۴۳، مطبوعہ اعظم گڑھ۔

ایسے حکمران جہنم میں جائیں گے" تو میں نے یہ بات پہلے جمعہ کو کہی اور کسی نے جواب نہ دیا تو میں ڈرا کہیں میں بھی ان حکمرانوں میں سے نہ ہو جاؤں، پھر دُوسرا جمعہ آیا اور اس میں بھی یہ واقعہ پیش آیا تو مجھے اور فکر ہوگئی، یہاں تک کہ تیسرا جمعہ آیا اور اس شخص نے میری بات پر نکیر کی اور مجھے ٹوکا تو مجھے اُمید ہوئی کہ میں ان حکمرانوں میں سے نہیں ہوں۔(۱)

## سادگی اور فقر و استغناء

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مخالفین نے اس بات کا پروپیگنڈا بڑی شدّ و مدّ کے ساتھ کیا ہے کہ آپؓ ایک جاہ پسند انسان تھے، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

حضرت ابو مجلزؒ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت معاویہؓ کو کسی مجمع میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں جو لوگ موجود تھے وہ احتراماً آپؓ کے لئے کھڑے ہوگئے، مگر آپؓ نے اس کو بھی ناپسند کیا اور فرمایا:-

ایسا مت کیا کرو! کیونکہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص اس بات کو پسند کرتا ہو کہ لوگ اس کے واسطے کھڑے ہوا کریں وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔(۲)

آپؓ کی سادگی کا عالم یہ تھا کہ یونس بن میسرہ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت معاویہؓ کو دمشق کے بازاروں میں دیکھا، آپؓ کے بدن پر پیوند لگی ہوئی قمیص تھی اور آپؓ دمشق کے بازاروں میں چکر لگا رہے تھے۔(۳)

اسی طرح ایک مرتبہ لوگوں نے آپؓ کو دمشق کی جامع مسجد میں خطبہ دیتے ہوئے دیکھا کہ آپؓ کے کپڑوں پر پیوند لگے ہوئے ہیں۔(۴)

---

(۱) حافظ ذہبیؒ: تاریخ الاسلام ج:۲ ص:۳۲۱ و ۳۲۲۔

(۲) الفتح الربانی علیٰ ترتیب مسند الامام احمدؒ ج:۲۲ ص:۳۵۷۔

(۳) حافظ ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۴۔

(۴) حافظ ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۳۵۔

یہ تو آپؓ کی طبعی سادگی اور استغناء کی شان تھی مگر شام کی گورنری کے دوران آپؓ نے ظاہری شان و شوکت کے طریقے بھی اختیار کئے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقہ سرحدی علاقہ تھا اور آپؓ چاہتے تھے کہ کفار کے دلوں پر مسلمانوں کی شان و شوکت کا دبدبہ قائم رہے، شروع شروع میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو آپؓ کی یہ ظاہری شان و شوکت ناگوار بھی ہوئی اور انہوں نے آپؓ سے اس کے متعلق باز پرس کی، آپؓ نے جواب میں کہا: اے امیر المؤمنین! ہم ایک ایسی سرزمین میں ہیں جہاں دشمن کے جاسوس ہر وقت کثیر تعداد میں رہتے ہیں، لہٰذا ان کو مرعوب کرنے کے لئے یہ ظاہری شان و شوکت دکھانا ضروری ہے، اسی میں اسلام اور اہلِ اسلام کی بھی عزت ہے۔

اس موقع پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بھی حضرت عمر فاروقؓ کے ہمراہ تھے، وہ آپ کے اس حکیمانہ جواب کو سن کر کہنے لگے: "امیر المؤمنین! دیکھئے کس بہترین طریقے سے انہوں نے اپنے آپ کو الزام سے بچالیا ہے۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: "اسی لئے تو ہم نے ان کے کاندھوں پر یہ بارِ گراں ڈالا ہے۔"(۱)

## علم و تفقہ

اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو علومِ دینیہ میں کامل دسترس اور کمالِ تفقہ عطا فرمایا تھا، ابنِ حزمؒ لکھتے ہیں: آپؓ کا شمار ان صحابہؓ میں سے ہے جو صاحبِ فتویٰ ہونے کی حیثیت سے ہیں۔(۲) نیز ابنِ حجرؒ نے بھی آپؓ کو ان صحابہؓ کے متوسط طبقے سے شمار کیا ہے جو مسائلِ شرعیہ میں فتویٰ دیتے تھے۔(۳)

حضرت ابنِ عباسؓ آپؓ کے متعلق فرمایا کرتے تھے: "إنه فقيه" یعنی حضرت معاویہؓ یقیناً فقیہ ہیں۔

---

(۱) حافظ ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۲۴ و ۱۲۵۔

(۲) ابنِ حزمؒ: جوامع السیرۃ ص:۳۲۰۔

(۳) ابنِ حجرؒ: الاصابہ فی تمییز الصحابہ ج:۱ ص:۲۲۔

آپؓ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سو تریسٹھ احادیث مروی ہیں،(۱) اور آپؓ سے احادیث روایت کرنے والوں میں حضرت ابنِ عباسؓ، حضرت انس بن مالکؓ، معاویہؓ بن خدریج، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سائب بن یزیدؓ، حضرت نعمان بن بشیرؓ جیسے صحابہؓ اور محمد بن سیرینؒ، سعید بن المسیبؒ، علقمہ بن وقاصؒ، ابوادریس الخولانیؒ اور عطیہ بن قیسؒ وغیرہ جیسے تابعین شامل ہیں۔(۲) آپؓ اعلیٰ پائے کے خطیب تھے اور آپؓ کے خطبات عربی ادب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، اسی طرح وہ حکیمانہ اقوال جو آپؓ سے منقول ہیں، نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور علم و حکمت میں اپنی مثال آپ ہیں۔ آپؓ نے اپنے دور میں علم و حکمت کی سرپرستی کی، تاریخِ اسلام میں آپؓ کے دور تک فنِ تاریخ کے اوراق بالکل سادہ تھے، سب سے پہلے آپؓ نے اس زمانے کے ایک ممتاز اخباری عبید بن شریہ سے تاریخِ قدیم کی داستانیں، سلاطینِ عجم کے حالات اور زبانوں کی ابتداء اور اس کے پھیلنے کی تاریخ لکھائی، یہ مسلمانوں میں تاریخ کی سب سے پہلی کتاب تھی۔(۳)

## ظرافت

آپؓ ایک ہنس مکھ اور خوش اخلاق انسان تھے، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی آپؓ سے بغیر کسی خوف کے ملتا اور آپؓ سے ہر قسم کی فرمائش کر دیتا، آپؓ سے اگر ممکن ہوتا تو پورا کر دیتے ورنہ ٹال دیتے، ایک بار ایک شخص آپؓ کے پاس آیا اور کہنے لگا: میں ایک مکان بنا رہا ہوں، آپ اس میں میری مدد کر دیجئے اور بارہ ہزار درخت عطا کر دیجئے۔

آپؓ نے پوچھا: گھر کہاں ہے؟

کہنے لگا: ''بصرہ میں!''

آپؓ نے پوچھا: ''لمبائی چوڑائی کتنی ہے؟''

---

(۱) ابنِ حزمؒ: جوامع السیرۃ ص:۲۷۷، سیوطیؒ: تاریخ الخلفاء ص:۱۴۹۔

(۲) ابنِ حجرؒ: الاصابہ ج:۳ ص:۴۱۳۔

(۳) ابنِ ندیم: الفہرست ص:۱۳۲، بحوالہ تاریخِ اسلام، شاہ معین الدین ندوی ج:۲ ص:۴۲۔

کہنے لگا: ''دو فرسخ لمبائی ہے اور دو ہی فرسخ چوڑائی۔''

آپؓ نے مزاحاً فرمایا:۔

لا تقل داری بالبصرة ولٰکن قل البصرة فی داری.

ترجمہ:۔ یہ مت کہو کہ میرا گھر بصرہ میں ہے، بلکہ یوں کہو کہ بصرہ میرے گھر میں ہے۔(۱)

## وفات

آپؓ کی پوری زندگی علم وعمل کی زندگی تھی، آپؓ سے جتنا کچھ بن سکا آپؓ نے مسلمانوں اورعوام الناس کی اصلاح اور بہبود کے لئے کام کیا اوراس کے لئے اپنی پوری زندگی خرچ کردی، مگر اس کے باوجود جب مخالفین آپؓ پر بے سروپا الزامات لگاتے اور آپؓ کوطرح طرح کے اعتراضات کا نشانہ بناتے تو آپؓ کواس کا افسوس ہوتا، چنانچہ حضرت معاویہؓ سے کسی نے پوچھا:۔

کیا بات ہے؟ آپ پر بڑھاپا جلد آگیا ہے۔تو جواب میں فرمایا:۔

کیوں نہ آئے؟ جب دیکھتا ہوں اپنے سر پرایک اکھڑ جاہل آدمی کوکھڑا پاتا ہوں جو مجھ پر قسم قسم کے اعتراضات کرتا ہے، اگر اس کے اعتراضات کا ٹھیک ٹھیک جواب دے دیتا ہوں تو تعریف کا کہیں سوال نہیں! اور اگر جواب دینے میں مجھ سے ذراسی چوک ہوجائے تو وہ بات چہار عالم میں پھیلادی جاتی ہے۔(۲)

۶۰ھ میں جبکہ آپؓ عمر کی اٹھترویں منزل سے گزر رہے تھے، آپؓ کی طبیعت کچھ ناساز ہوئی اور پھر طبیعت خراب ہوتی چلی گئی، اورطبیعت کی ناسازی، مرضِ وفات میں تبدیل ہوگئی، اسی مرضِ وفات میں آپؓ نے خطبہ دیا جو آپؓ کا آخری خطبہ تھا، اس میں اور باتوں کے علاوہ آپؓ نے فرمایا:۔

أیھا الناس! إن من زرع قد استحصد وإنی قد ولیتکم ولن یلیکم أحدٌ بعدی خیر منّی وإنّما یلیکم من ھو شر

---

(۱) حافظ ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۴۱۔

(۲) حافظ ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۴۰۔

منّی کما کان من ولیکم قبلی خیرًا منّی.[1]

ترجمہ:- اے لوگو! بعض کھیتیاں ایسی ہیں جن کے کٹنے کا وقت قریب آچکا ہے، میں تمہارا امیر تھا، میرے بعد مجھ سے بہتر کوئی امیر نہ آئے گا، جو آئے گا مجھ سے گیا گزرا ہی ہوگا، جیسا کہ مجھ سے پہلے جو امیر ہوئے وہ مجھ سے بہتر تھے۔

اس خطبے کے بعد آپؓ نے تجہیز و تکفین کے متعلق وصیت فرمائی، فرمایا: کوئی عاقل اور سمجھ دار آدمی مجھے غسل دے اور اچھی طرح غسل دے، پھر اپنے بیٹے یزید کو بلایا اور کہا: اے بیٹے! میں ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا، آپؐ اپنی حاجت کے لئے نکلے، میں وضو کا پانی لے کر پیچھے گیا اور وضو کرایا، آپؐ نے اپنے جسم مبارک پر پڑے، ہوئے دو کپڑوں میں سے ایک کپڑا مجھے عنایت فرمایا، وہ میں نے حفاظت سے رکھ لیا تھا، اسی طرح آپؐ نے ایک بار اپنے بال اور ناخن مبارک کاٹے تو میں نے انہیں جمع کر کے رکھ لیا تھا، تم کپڑے کو تو میرے کفن کے ساتھ رکھ دینا اور ناخن اور بال مبارک میری آنکھ، منہ اور سجدے کی جگہوں پر رکھ دینا اور پھر ارحم الراحمین کے حوالے کر دینا۔[2]

آپؓ نے یہ وصیت کی اور اس کے بعد مرض بڑھتا گیا یہاں تک کہ دمشق کے مقام پر وسطِ رجب ۶۰ھ میں علم، حلم اور تدبر کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔[3]

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّـآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

آپؓ کی نمازِ جنازہ حضرت ضحاک بن قیسؓ نے پڑھائی اور دمشق میں ہی باب الصغیر میں آپؓ کی تدفین ہوئی، صحیح قول کے مطابق آپؓ کی عمر اٹھتر سال تھی۔[4]

علامہ ابنِ اثیرؒ نے اپنی تاریخ کامل میں نقل کیا کہ ایک دن عبدالملک

---

(۱) حوالہ مذکورہ بالا ج:۸ ص:۱۴۱۔

(۲) ابنِ عبدالبرؒ: الاستیعاب تحت الاصابہ ج:۳ ص:۳۷۸، ابنِ اثیرؒ: تاریخ کامل ج:۴ ص:۲، ابنِ کثیرؒ: البدایہ والنہایہ ج:۸ ص:۱۴۱۔

(۳) ابنِ حجرؒ: الاصابہ ج:۳ ص:۴۱۴، ایضاً ابنِ خلدون ج:۳ ص:۴۲، مطبوعہ بیروت۔

(۴) ابنِ عبدالبرؒ: الاستیعاب تحت الاصابہ ج:۳ ص:۳۷۸۔

بن مروان آپؓ کی قبر کے قریب سے گزرے تو کھڑے ہوگئے اور کافی دیر تک کھڑے رہے اور دُعائے خیر کرتے رہے۔ ایک آدمی نے پوچھا کہ: یہ کس کی قبر ہے؟ عبدالملک بن مروان نے جواب دیا:-

قبر رجلٍ كان والله فيما علمته ينطق عن علم ويسكت عن حلم، إذا أعطىٰ أغنىٰ و إذا حارب أفنىٰ ثم عجل له الدهر ما أخره لغيره ممن بعده هٰذا قبر أبي عبدالرحمٰن معاوية.(۱)

ترجمہ:- یہ اس شخص کی قبر ہے کہ جب بولتا تو علم و تدبر کے ساتھ بولتا تھا، اور اگر خاموش رہتا تو حلم و بُردباری کی وجہ سے خاموش رہتا تھا، جسے دیتا اسے غنی کردیتا، جس سے لڑتا اسے فنا کرڈالتا۔

## آپؓ کے دورِ حکومت پر ایک شیعہ مؤرّخ کا تبصرہ

مضمون کے آخر میں اس تبصرے کو نقل کردینا غیر مناسب نہ ہوگا جو ساتویں صدی ہجری کے مشہور مؤرّخ ابنِ طباطبا نے اپنی کتاب ''الفخری'' میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے دورِ حکومت پر کیا ہے۔ اس تبصرے کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ یہ تبصرہ ایسے مؤرّخ نے کیا ہے جو شیعہ ہے اور اثنا عشری طبقے سے تعلق رکھتا تھا، اگرچہ اس تبصرے میں کہیں کہیں انہوں نے جانب داری سے بھی کام لیا ہے، مگر بحیثیت مجموعی اس میں تعصب کم اور حقیقت کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ ابنِ طباطبا اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:-

حضرت معاویہؓ دُنیوی معاملات میں بہت ہی دانا تھے، فرزانہ و عالم تھے، حلیم اور باجبروت فرماں روا تھے، سیاست میں کمال حاصل تھا، اور دُنیاوی معاملات کو سلجھانے کی اعلیٰ استعداد رکھتے تھے، دانا تھے، فصیح و بلیغ تھے، حلم کے موقع پر حلم، اور سختی کے موقع پر سختی بھی کرتے تھے، لیکن حلم بہت غالب تھا، سخی تھے، مال خوب دیتے تھے، حکومت کو پسند کرتے تھے بلکہ اس سے دِلچسپی تھی، رعایا

---

(۱) ابنِ اثیرؒ: تاریخ کامل ج:۴ ص:۵۔

کے شریف لوگوں کو انعامات سے نوازتے رہتے تھے، اس لئے قریشی شرفاء مثلاً عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبداللہ بن جعفر طیارؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ، ابان بن عثمان بن عفانؓ، اور خاندانِ ابو طالب کے دُوسرے لوگ دمشق کا سفر کر کے ان کے پاس جاتے تھے اور (حضرت) معاویہؓ خاطر تواضع اور مہمان نوازی کے علاوہ ان کی ضروریات پوری کرتے رہتے۔ یہ لوگ ہمیشہ ان سے سخت کلامی کرتے اور نہایت ناپسندیدہ انداز سے پیش آتے، لیکن یہ کبھی تو اسے ہنسی میں اُڑا دیتے اور کبھی سنی اَن سنی کر دیتے، اور جب ان حضرات کو رُخصت کرتے تو بڑے اعلیٰ تحائف اور انعامات دے کر رُخصت کرتے۔ ایک بار انہوں نے ایک انصاری کے پاس پانچ سو دینار یا درہم بھیجے، انصاری نے بہت کم خیال کیا اور اپنے بیٹے سے کہا کہ: یہ رقم لے جاؤ اور (حضرت) معاویہؓ کے منہ پر مار کر واپس کر دو، پھر اس سے قسم دے کر کہا کہ جیسا میں نے بتایا ہے اسی طرح کرے، وہ رقم لے کر (حضرت) معاویہؓ کے پاس پہنچا اور کہا:-

اے امیر المؤمنین! میرے والد گرم مزاج اور جلد باز ہیں، انہوں نے قسم دے کر ایسا حکم دیا ہے اور میں ان کے خلاف جانے کی قدرت نہیں رکھتا، یہ سن کر (حضرت) معاویہؓ نے اپنے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ: تمہارے والد نے جو کچھ حکم دیا ہے اسے پورا کر لو، اپنے چچا کے (یعنی میرے) ساتھ نرمی بھی ملحوظ رکھو (یعنی زور سے نہ مارو)، وہ صاحبزادے شرما گئے اور رقم ڈال دی، حضرت معاویہؓ نے رقم دُگنی کر کے انصاری کو بھجوا دی۔

ان کے لڑکے یزید کو جب خبر ہوئی تو غصّے میں اپنے والد کے پاس آیا اور کہا: آپ حلم میں مبالغے سے کام لینے لگے ہیں، اندیشہ ہے

کہ لوگ اسے آپ کی کمزوری اور بزدلی پر محمول کرنے لگیں گے۔

انہوں نے جواب دیا کہ: بیٹے! حلم میں نہ کوئی ندامت کی بات ہے، نہ بُرائی کی، تم اپنا کام کرو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

اس قسم کے کردار نے (حضرت) معاویہؓ کو خلیفۂ عالم بنادیا اور مہاجرین وانصار میں ہر وہ شخص ان کے آگے جھک گیا جو اپنے آپ کو ان سے زیادہ حق دارِ خلافت سمجھتا تھا، (حضرت) معاویہؓ مدبر ترین انسان تھے، (حضرت) عمر بن خطابؓ نے ایک بار اہلِ مجلس سے فرمایا:-

تم لوگ قیصر وکسریٰ اور ان کی سیاست کی تعریف کرتے ہو حالانکہ تمہارے اندر معاویہؓ موجود ہیں۔

(حضرت) معاویہؓ کئی حکومتوں کے مربی، کئی اُمتوں کی سیاست چلانے والے اور کئی ملکوں کے راعی تھے، حکومت میں انہوں نے بعض ایسی چیزیں بھی ایجاد کیں جو ان سے پہلے کسی نے نہیں کی تھیں، مثلاً انہوں نے سب سے پہلے فرماں رواؤں کے لئے باڈی گارڈ مقرّر کئے جو ان کے سامنے ہتھیار تانے رہتے تھے، اور جامع مسجد میں انہی نے مقصورہ تیار کرایا جس میں فرماں روا اور خلیفہ، لوگوں سے الگ الگ ہو کر تنہا نماز ادا کرسکے۔ امیر المؤمنین علیہ السلام (حضرت علیؓ) کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، اسی کے خوف سے (حضرت) معاویہؓ نے ایسا کیا ..... اور انہی نے سب سے پہلے برید (ڈاک) کا وہ طریقہ اختیار کیا جس سے جلد جلد خبریں مل جایا کریں۔ ''برید'' سے مراد یہ ہے کہ مختلف جگہوں پر نہایت چست شہسوار متعین کردیئے جائیں تاکہ جہاں ایک تیز رفتار خبر رساں پہنچے اور اس کا گھوڑا تھک چکا ہو تو دُوسرا شہسوار دُوسرے تازہ دَم گھوڑے پر آگے روانہ ہوجائے اور اسی طرح ایک چوکی سے دُوسری چوکی تک تیزی کے ساتھ خبر پہنچ جائے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ملکی معاملات میں ایک نیا محکمہ جسے ''دیوانِ خاتم'' کہتے ہیں (یعنی مہریں ثبت کرنے کا محکمہ) قائم کیا، یہ دُوسرے قابلِ اعتبار محکموں میں سے ایک تھا، بنی عباس تک یہ طریقہ جاری رہا، پھر بعد میں ترک کردیا گیا۔

''دیوانِ خاتم'' کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک محکمہ تھا جس میں کئی ملازمین ہوتے، جب کسی معاملے میں خلیفہ کے دستخطوں سے کوئی حکم صادر ہوتا تو وہ پہلے اس محکمے میں لایا جاتا اور اس کی ایک کاپی یہاں نتھی کرلی جاتی اور اسے موم (لاکھ) سے سربمہر کردیا جاتا، اس کے بعد اس محکمے کے افسرِ اعلیٰ کی مہر لگادی جاتی۔ حضرت معاویہؓ معاملاتِ دُنیوی کو حل کرنے میں ہمیشہ مصروفِ کار رہتے تھے، ان کی فرماں روائی بڑی مستحکم تھی اور پیچیدہ معاملہ ان کے لئے آسان تھا۔

عبدالملک بن مروان کو دیکھئے، وہ اس مضمون کو کس خوبی سے ادا کرتے ہیں، یہ جب حضرت معاویہؓ کی قبر پر گئے اور ان کے لئے دُعائے خیر کرنے لگے تو ایک شخص نے پوچھا کہ:۔

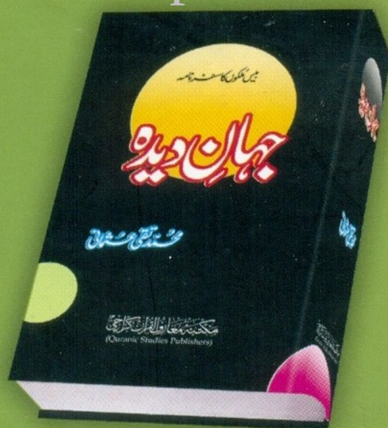
اے امیر المؤمنین! یہ کس کی قبر ہے؟

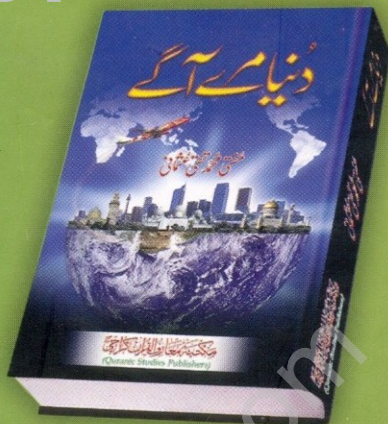
انہوں نے جواب دیا کہ: جہاں تک میرا علم اس شخص کے بارے میں ہے، وہ یہ ہے کہ صاحبِ قبر پوری واقفیت کے بعد بولتا تھا اور حلم کی وجہ سے خاموش رہتا تھا، جسے دیتا اسے غنی کردیتا، اور جس سے لڑتا اسے فنا کرڈالتا تھا۔ (حضرت) عبداللہ بن عباسؓ جو بڑے نقاد تھے، کہتے ہیں کہ:۔

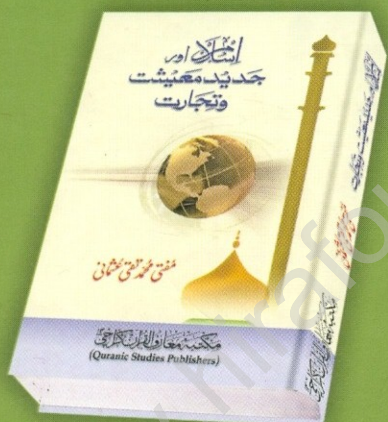
ریاست فرماں روائی کی طرف توجہ دینے میں (حضرت) معاویہؓ سے زیادہ لائق میں نے اور کسی کو نہیں دیکھا۔[1]

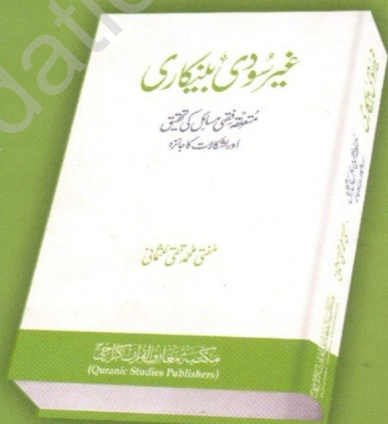


(۱) ابنِ طباطبا: الفخری ص:۱۲۹، مطبوعہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور۔








مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)



www.quranicpublishers.com